

مرتبہ  
خلیق النحْم

[illegible]

جلد اول

# غالب کے خطوط

(جلد اول)

مُرتَبَّہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

© خلیق انجم

سنہ اشاعت — ۱۹۸۴ء

تعداد : — ۱۱۰۰

قیمت : — پچھتر روپے

بہ اہتمام : — شاہد مہلی

طباعت : — سمر آفٹ پرنٹرز۔ دہلی

ناشر

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



# فہرست

|    |  |    |                                 |
|----|--|----|---------------------------------|
| ۲۹ | اختلافات                                       | ۹  | حرف آغاز                        |
| ۳۳ | اردوئے معلّیٰ : پہلا اڈیشن                     | ۱۳ | کچھ اس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں |
| ۳۵ | عود ہندی : ری پرنٹ                             | ۱۲ | متن کی تصحیح                    |
| ۳۵ | اردوئے معلّیٰ : ری پرنٹ                        | ۱۴ | بنیادی نسخہ                     |
| ۳۶ | اردوئے معلّیٰ : ری پرنٹ                        | ۱۷ | خطوں کی تاریخ وار ترتیب         |
| ۳۶ | اردوئے معلّیٰ : حصہ اول و دوم                  | ۱۷ | خطوں کی تاریخ تحریر             |
| ۳۷ | اردوئے معلّیٰ : حصہ اول و دوم۔ دوسرا ری پرنٹ   | ۱۹ | تنقیدی اڈیشن کے متن کی املا     |
| ۳۸ | اردوئے معلّیٰ : حصہ اول                        | ۲۰ | اوقات کی علامتیں                |
| ۳۹ | مکمل اردوئے معلّیٰ : مشتمل برہر دو حصہ         | ۲۱ | رقمیں                           |
| ۳۹ | اردوئے معلّیٰ مکمل : ہر دو حصہ مع ضمیمہ        | ۲۱ | غالب کا نام بہ حیثیت مکتوب نگار |
| ۴۰ | عود ہندی                                       | ۲۲ | مکتوب الیہ کے حالات             |
| ۴۰ | ادبی خطوط غالب : مرتبہ مرزا محمد عسکری         |    | خطوط غالب کے مختلف اڈیشن        |
| ۴۱ | مکاتیب غالب : مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی | ۲۳ | اور ری پرنٹ                     |
| ۴۲ | خطوط غالب : مرتبہ ہمیش پرشاد                   | ۲۳ | مہر غالب                        |
| ۵۱ | نادیات غالب : مرتبہ آفاق حسین آفاق             | ۲۴ | انتخاب غالب                     |
| ۵۲ | خطوط غالب : مرتبہ غلام رسول قہر                | ۲۵ | عود ہندی : پہلا اڈیشن           |
| ۵۳ | غالب کی نادر تحریریں : مرتبہ خلیق انجم         | ۲۵ | دونوں اڈیشنوں کی مماثلتیں       |

|     |                                   |    |  |
|-----|-----------------------------------|----|--|
| ۷۴  | بعض الفاظ کی املا اور ان کا تلفظ  | ۵۳ | خطوط غالب، مرتبہ ہمیش پرشاد                |
| ۷۴  | بوڑھا اور گاڑی                    | ۵۴ | یہ نظر ثانی مالک رام                       |
| ۷۴  | گڑا پنکھ                          |    | عود ہندی اور اردو کے مثل،                  |
| ۷۵  | تڑپنا                             | ۵۴ | مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل                 |
| ۷۵  | ڈھونڈنا                           |    | غالب کی اردو املا کی خصوصیات               |
| ۷۵  | سوچ                               | ۶۴ | یہ مجہول اور بے معروف                      |
|     | غالب کی زبان پر فارسی اثرات       | ۶۴ | الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان             |
| ۷۷  | انگریزی الفاظ کا استعمال          | ۶۵ | اعراب بالحرکات                             |
| ۹۳  | غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد | ۶۵ | پیش کا استعمال                             |
| ۹۹  | خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ        | ۶۵ | ہا کار آوازوں کی لکھاوٹ                    |
|     | غالب سے قبل اردو کا نثری سرمایہ   | ۶۷ | لفظ کے آخر میں الف یا ہائے محقق            |
| ۱۰۱ | اور اردو مکتوب نگاری کا آغاز      |    | ہائے محقق یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ    |
| ۱۱۷ | غالب کا پہلا دستیاب اردو خط       | ۶۸ | واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں          |
| ۱۲۴ | مکتوب نگاری کا فن                 | ۶۹ | نون غنہ اور نون ساکن                       |
| ۱۳۷ | شگفتن گل ہائے ناز                 | ۷۰ | بعض حروف کو ملا کر لکھنے کا رجحان          |
| ۱۴۸ | القاب و آداب                      | ۷۰ | ذ اور زر                                   |
| ۱۵۱ | غالب کا آئین نامہ نگاری           | ۷۰ | پانو اور گانو                              |
| ۱۵۵ | خطوط میں مکالمہ نویسی             | ۷۲ | یلے تختانی اور ہمزہ                        |
| ۱۵۹ | غالب کا بے اندازہ بیاں اور        | ۷۲ | چاہیے۔ لیے۔ دیے۔ کیے۔                      |
| ۱۶۶ | مقتفی عبار میں                    | ۷۳ | مؤید اور رؤسا                              |
|     |                                   | ۷۴ | ایسے الفاظ جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے |



بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر ۱۷۲

شہروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے ۱۸۳

مرقع نگاری ۱۹۵

اک ذرا چھڑے پھر دیکھے کیا ہوتا ہے ۱۹۷

ما تم یک شہر آرزو ۲۱۱

عمر بھر کا تو نے پیساں وفا باندھا تو کیا ۲۱۹

### غالب کے خطوط

مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ۲۳۳

نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ۳۶۳

### تصویریں

مرزا ہر گوپال تفتہ ۲۳۱

نواب علاء الدین احمد خاں علائی ۳۶۱

### خطوطِ غالب کے عکس

مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ۲۴۱

مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ۳۷۷

ایضاً ۳۸۸

ایضاً ۴۲۶

# حرفِ آغاز

غالب کے تمام اردو خطوط کو یکجا کر کے اُن کا تنقیدی ادیشن تیار کرنے کا منصوبہ پہلی بار مولوی مہیش پرشاد نے بنایا تھا۔ مرحوم نے اس سلسلے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ ہر ممکن ذریعے سے غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط یا اُن کے عکس فراہم کیے۔ اُس وقت تک خطوط غالب کے متعدد ادیشن اور اُن کے ری پرنٹ شائع ہو چکے تھے خطوط غالب کے اس طرح کے تمام نسخوں کی ترتیب میں چوں کہ متنی تنقید کے بنیادی اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی تھی اس لیے متن میں بے شمار غلطیاں راہ پا گئی تھیں۔ مولوی مہیش پرشاد نے صحیح متن کے تعین کی کوشش کی اور پہلی جلد مرتب کر کے ۱۹۴۱ء میں شائع کر دی۔ وہ ابھی دوسری جلد کی تیاری میں مصروف تھے کہ دنیا سے چل بسے۔

مہیش پرشاد صاحب کے انتقال کے بعد مولوی غلام رسول قہر نے دو جلدوں میں خطوط غالب مرتب کر کے ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شائع کیے۔ مہر صاحب کے علم و فضل سے کون اُکار کر سکتا ہے۔ وہ جید عالم تھے لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے اس کام پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متن اتنا غلط چھپا کہ میرے محتاط انداز سے کے مطابق متن میں فی صفحہ آٹھ یا دس غلطیاں ہوں گی۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر دوں کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتبہ مکاتیبِ غالب، غالب کے خطوط کا وہ پہلا ادیشن ہے جس میں انتہائی سائنٹی فک طریقے سے متن کا تنقیدی ادیشن تیار کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مجموعے میں غالب کے بیش تر خطوط، سو پے ماہوار کی رسید ہونے کی وجہ سے بالکل غیر اہم ہیں۔ ”مکاتیبِ غالب“ کی اہمیت اُن کے مکتوب الیم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انھیں غالب نے لکھا اور عرشی صاحب



جیسے متنی نقاد نے اُن کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا۔

غالب کے اصل خطوط کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں "مربع غالب" میں پرتھوی چندر نے نوابانِ رام پور کے نام غالب کے اکثر خطوط اور کچھ دوسرے لوگوں کے نام غالب کے خطوط کے عکس شائع کیے ہیں۔ میں نے غالب کے اصل خطوط کے تمام دستیاب عکس اس مجموعے میں اس طرح شامل کیے ہیں کہ جس مکتوب الیہ کے نام کا وہ خط جس کی اصل کا عکس دستیاب ہو گیا ہے جہاں نقل ہوا ہے اس کے ساتھ خط کا عکس بھی دے دیا ہے۔

میں ان تمام حضرات کا انتہائی شکر گزار ہوں جنہوں نے یہ عکس شائع کیے تھے۔ جناب کالی داس گپتا رضا کا بھی خاص طور سے ممنون ہوں جنہوں نے علانی اور شاقب کے نام کے دو خطوط کے عکس مجھے فراہم کیے۔ غالب نے یہ دونوں خط ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء کو لکھے تھے۔

خطوط غالب کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں جن کرم فرماؤں، دوستوں اور شاگردوں نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے اُن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ خطوط کے ذریعہ جن محترم شخصیتوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اُن میں مولانا امتیاز علی خاں عظمیٰ مرحوم، قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں میرے نام لکھے گئے ان حضرات کے خطوط بالائے خود غالبیات کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔ کوشش کروں گا کہ انہیں مرتب کر کے شائع کر دوں۔ مالکِ رام صاحب نے حواشی کے سلسلے میں ایسے بے شمار مآخذ کی نشان دہی کی جن کے بغیر حواشی نامکمل رہتے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے حواشی پر نظر ثانی کر کے بہت اہم مشوروں سے نوازا۔ رشید حسن خاں صاحب نے قدم قدم پر رہنمائی کی۔ ڈاکٹر اسلم پروین اور کاظم علی خاں نے میری بہت سی الجھنوں کو سلجھایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر ظانصاری نے اپنے قیمتی مشوروں سے اس کام کو بہتر بنانے میں میری مدد کی۔ تقیہ اور علانی کی تصویریں مالکِ رام صاحب نے عنایت فرمائیں۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مجھے بھرپور تعاون دیا۔ مختلف کتابوں کے بارے میں سوالات کا جواب ہمیشہ بلا تاخیر دیا ہے۔ بڑی تعداد میں میرے مطلوبہ



مضامین اور کتابوں کے اقتباسات کے زیر و کس فراہم کیے۔ احمد سعید صاحب (اسکول آف فارن لینگویجس، وزارت دفاع) نے خطوط کے متن کی درستی میں میری بہت مدد کی۔

کالی واس گپتا رضا نے اپنی بیش قیمت ذاتی لائبریری سے استفادے کا موقع دیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائبریرین ایم حبیب خاں صاحب اور ہر دیال لائبریری (ہارڈنگ لائبریری) کے بہار اللہ آبادی صاحب نے کتابوں کی فراہمی میں مجھے غیر معمولی تعاون دیا۔ شہباز حسین صاحب اور راج نرائن راز صاحب نے خطوط غالب کے وہ عکس فراہم کیے جو ماہنامہ ”آج کل“ (نئی دہلی) میں شائع ہوئے تھے۔ میرے کرم فرما سائغر نظامی صاحب، ضامن علی خاں ضامن مراد آبادی، یوگندر بھل تشہ، شمیم احمد صاحب اور ایم بی مغل صاحب نے کتابوں کی فراہمی میں میری بہت مدد کی۔

محمد رضا صاحب اور ثریا سعید صاحبہ نے خطوط کی نقل کرنے میں میری مدد کی سی۔ ایس چٹھا صاحب نے مسودہ صاف کرنے میں بہت تعاون دیا۔

میں نے اس کام کے سلسلے میں جن لائبریریوں سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے ان میں انجمن ترقی اردو (ہند)، لائبریری برٹش لائبریری، لندن، انڈیا آفس لائبریری، لندن، ہر دیال لائبریری، دہلی، نیشنل آرکائوز آف انڈیا، نئی دہلی، ڈیپارٹمنٹ آف آرکائوز دہلی، دہلی یونیورسٹی لائبریری، مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ، ندیرہ لائبریری، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، خدابخش لائبریری، پٹنہ، رضا لائبریری، رام پور، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ لائبریری، نئی دہلی، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، خانہ قریشی، نئی دہلی، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میرے پاس الفاظ نہیں کہ اپنے ان تمام بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور لائبریریوں کے منتظموں کا شکریہ ادا کر سکوں۔ خدا انھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔

اگر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی اس کام میں غیر معمولی



و بچپی نہ لیتے اور کام جلد ختم کرنے پر اصرار نہ کرتے، تو اس کام کی تکمیل میں ابھی نہ جانے اور کتنا وقت لگتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے معین زیدی صاحب اور شاہد ماہلی صاحب نے اس کی طباعت میں بہت جان کھپائی ہے۔ میں ان تینوں حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آخر میں اپنی بیوی موہنی اور بچوں سیما اور ثمر کا شکریہ ادا کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے حصے کا بہت سارا وقت بھی میں نے اس کام کی تکمیل پر صرف کیا ہے۔ جو سہولتیں ان تینوں نے مجھے فراہم کیں، اُن کے بغیر یہ کام ہرگز مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے باغ کے ان پھولوں کو خدا ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے۔

غالب کے خطوط میں جن لوگوں، کتابوں، اخباروں اور مختلف مقاموں کا ذکر آیا ہے۔ اُن پر جہانِ غالب کے عنوان سے حواشی لکھے گئے ہیں۔ "متن کے مآخذ" کے تحت ہر خط کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ خط کا بنیادی متن کہاں سے لیا گیا ہے اور کس متن سے اُس کا موازنہ کر کے اختلافات نسخ بیان کیے گئے ہیں۔ غالب کے خطوط میں جتنے بھی فارسی اور اردو اشعار یا مصرعے نقل ہوئے ہیں اُن کا اشاریہ "اشعار کا اشاریہ" کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پورے متن کا مکمل اشاریہ بھی تیار کیا گیا ہے۔

مکتوب الیہ کے حالات "جہانِ غالب"، کتا بیات، اشعار کا اشاریہ اور متن کا اشاریہ آخری جلد میں شامل کیے گئے ہیں۔

غالب کے خطوط چار جلدوں میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ پہلی جلد حاضر خدمت ہے، باقی تین جلدیں بھی اسی سال چھپ جائیں گی۔ اِنشَاء اللہ۔

خلیقہ خجندیہ



# کچھ اس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں

غالب کے خطوط کا تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہوئے میں نے متنی تنقید کے جن اصولوں کی پابندی کی ہے، یہاں اُن کی وضاحت ضروری ہے۔

میری کوشش رہی ہے کہ غالب کے تمام اردو خط اس اڈیشن میں شامل کر لیے جاتیں "اردوئے معلّٰی"، "نمودِ ہندی"، "مکاتیبِ غالب"، "نادراتِ غالب" اور "غالب کی نادر تحریریں" کے تمام خطوط شامل کر لیے گئے ہیں۔ ایسے خطوں کی تعداد خاصی تھی، جو ان مجموعوں میں شامل نہیں تھے، انھیں بھی اس اڈیشن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ غالب کے تمام اردو خطوط اس اڈیشن میں مرتب ہو جائیں پھر بھی اگر کوئی خط شامل ہونے سے رہ گیا ہو، تو اُسے میری کوتاہی سمجھا جاتے۔

## متن کی تصحیح

متنی نقاد کو کسی بھی تحریر کا تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہوئے ہر قدم پر یہ ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ وہ اس تحریر کی بازیافت کر رہا ہے، جو مصنف کے ذہن میں تھا اور جو وہ لکھنا چاہتا تھا، اُس تحریر کی نہیں جو مصنف کے قلم سے نکلی یا شائع ہوئی، کیوں کہ مصنف کے اپنے

ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے میں بھی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کبھی کوئی لفظ سہواً دوبار لکھا جاتا ہے، اور کبھی کوئی لفظ لکھنے سے رہ جاتا ہے۔ کبھی مصنف لکھنا کچھ چاہتا ہے، اور لکھ کچھ جاتا ہے۔ کبھی الفاظ کی املا غلط ہو جاتی ہے۔ جب مصنف کی تحریر طباعت کی منزلوں سے گزرتی ہے تو اس تحریر میں کم سے کم ایک اور انسانی ذہن کا دخل ہو جاتا ہے۔ اردو طباعت میں یہ ذہن کاتب کا ہوتا ہے۔ کاتب اس تحریر میں بعض تبدیلیاں شعوری طور پر کرتا ہے اور بعض تبدیلیاں انسانی ذہن کی پُر اسرار اور پیچیدہ نفسیات کی وجہ سے غیر شعوری طور پر وجود میں آتی ہیں۔ اگر مصنف اور کاتب کے درمیان مرتب ہو تو اس کی پسند یا ناپسند، غلط فہمی، کم علمی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مصلحتوں اور اس کی اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں کی وجہ سے تحریر میں اور بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اصل خطوط خاصی تعداد میں دستیاب ہیں باقی خطوط مطبوعہ صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ان خطوط کے متن میں تبدیلیوں کی وہ تمام مثالیں موجود ہیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس لیے اگر ان خطوط میں مجھے کوئی ایسی قرأت نظر آتی ہے جو میرے خیال سے غالب کی منشا کے خلاف ہے تو میں نے قیاسی تصحیح کر کے حاشیے میں اس کا ذکر کر دیا ہے۔

## بنیادی نسخہ

متنی تنقید کے نقطہ نظر سے خطوط غالب کا متن دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک متن تو وہ جو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے، یعنی غالب کے اصل خطوط۔ ان میں وہ خط بھی شامل ہیں جو ہمیں پہلے مطبوعہ شکل میں ملے تھے لیکن بعد میں ہمیں اصل خطوط بھی دستیاب ہو گئے۔ دوسری قسم کا متن وہ ہے جو اردو سے معلیٰ، "عودِ ہندی" اور نادراتِ غالب وغیرہ میں شائع ہوا ہے۔ اس متن میں غالب کے وہ خطوط بھی ہیں جو اردو سے معلیٰ



کے بعد کے اڈیشنوں میں شامل کیے گئے تھے۔

زیر نظر تنقیدی اڈیشن میں غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ان خطوط کو جن کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوتے ہیں یا جو اصل شکل میں مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ تنقیدی متن تیار کرتے ہوئے ان خطوط کا مطبوعہ خطوط سے موازنہ کر کے اختلافات نسخہ سے بے وجہ ضخامت بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

”اردوئے معلّیٰ اور عودِ ہندی“ کے پہلے اڈیشنوں میں شائع ہونے والے خطوط کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ غالب کے جو خطوط ان دونوں مجموعوں میں مشترک ہیں، ان میں ”اردوئے معلّیٰ“ کے متن کو بنیادی نسخہ بنا کر، عودِ ہندی کے متن سے موازنہ کر کے اختلافات نسخہ دیے گئے ہیں۔ ”اردوئے معلّیٰ“ کے متن کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ مجموعہ دہلی میں شائع ہوا تھا اور عودِ ہندی کے مقابلے میں اس مجموعے میں طباعت کی غلطیاں کم ہیں۔

”اردوئے معلّیٰ“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے:

”... اکثر عبارتیں جو عودِ ہندی میں چھوڑ دی گئی تھیں، اس میں موجود ہیں۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس نسخے کے ترتیب دینے والوں کے سامنے اصل خط تھے۔ البتہ ایک آدھ جگہ ایسا بھی ہے کہ ایک ٹکڑا اس میں حذف ہو گیا ہے اور وہ ”عودِ ہندی“ اور اصل خط دونوں میں موجود ہے۔... اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ ”اردوئے معلّیٰ“ کے ترتیب دینے والوں کے سامنے کچھ اصل خط تھے، کچھ خطوں کی نقلیں، جن میں سے بعض ناقص بھی تھیں۔“

”اردوئے معلّیٰ“ اور ”عودِ ہندی“ کے بہت سے ری پرنٹ شائع ہوئے تھے اور ہر ایک کے متن میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ چونکہ ان ری پرنٹوں کے متن میں تبدیلیوں کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے پورے متن یا اس کے کچھ حصے کا موازنہ اصل خطوط سے کیا گیا تھا، بلکہ یہ تبدیلیاں یا تو طباعت کی غلطیاں ہیں یا جن لوگوں کی نگرانی میں یہ ری پرنٹ شائع ہوئے ہیں

انہوں نے متن کی خود تصحیح کی ہے۔ اس لیے ان ری پرنٹوں میں شائع ہونے والے متن کا بنیادی متن سے موازنہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، ہاں کہیں کہیں قیاسی تصحیح میں ان سے ضرور مدد لی گئی ہے۔

۱۸۹۹ء میں مطبع نامی مجتبائی دہلی سے ”اردوئے معلیٰ“ کا ایک اڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس کے دو حصے تھے پہلا حصہ تو وہی تھا جو ”اردوئے معلیٰ“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں سات دیباچوں اور تقریظوں کے علاوہ غالب کے وہ خطوط شامل کیے گئے، جن میں غالب نے ادبی مسائل پر بحث کی ہے اور جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ یہ خطوط مرزا ہرگوپال تفتہ، ماسٹر پیارے لال، منشی حبیب اللہ ذکا، میاں داد خاں سیاح، شہزادہ بشیر الدین، کیول رام ہتھیار، مولوی کرامت علی، جواہر سنگھ جوہر، منشی ہیرا سنگھ، اور میر مہدی مجروح کے نام ہیں۔ ان تمام خطوط کو بنیادی متن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام غالب کے خطوط پہلی بار مولانا حسرت موہانی کے ”اردوئے معلیٰ“ (علی گڑھ، دسمبر، ۱۹۰۶ء، ص ۵-۲۳) میں شائع ہوئے تھے مگر ان خطوط کا متن خاصا غلط شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس ان میں سے بعض خطوں کی نقلیں موجود تھیں۔ مولوی مہیش پرشاد نے ان نقلوں کی بنیاد پر متن تیار کیا تھا، اس لیے اسی متن کو بنیادی متن بنایا گیا ہے۔

انور الدولہ سعید الملک نواب سعد الدین خاں بہادر صولت جنگ متخلص بہ شفق کے نام غالب کے اکیس خطوط ہیں۔ ان میں سے گیارہ خطوط اعظم گڑھ میں کسی صاحب کے پاس تھے۔ مولوی مہیش نے مطبوعہ متن کا ان اصل خطوط سے موازنہ کیا تھا، اس لیے مولوی صاحب نے شفق کے نام خطوط کا جو متن تیار کیا ہے، اس تنقیدی اڈیشن میں اُسے ہی بنیادی متن بنایا گیا ہے۔

خاصی تعداد میں غالب کے اصل خطوط رضا لائبریری رامپور اور دوسری لائبریریوں



میں محفوظ ہیں، بہت سے خطوط کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان تمام خطوں کے عکس اس تنقیدی اڈیشن میں شامل کر دیے گئے ہیں، تاکہ یہ تمام عکس یکجا محفوظ ہو جائیں۔

ہراڈیشن کے آخر میں بنیادی متن کا ایک اشاریہ دیا گیا ہے، جس میں ہر خط کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا خط پہلی بار کب اور کہاں شائع ہوا تھا۔

## خطوں کی تاریخ وار ترتیب

مولانا ابتیا ز علی خاں حرشی نے پہلی بار مکاتیبِ غالب کے خطوں کو تاریخ وار ترتیب دیا تھا۔ یہ خطوط نوابانِ رام پور اور رام پور سے متعلق چار دیگر افراد کے نام ہیں۔ بعد میں مولوی ہمیش پرشاد، آفاق دہلوی اور غلام رسول مہر وغیرہ نے خطوطِ غالب تاریخ وار ترتیب دیے۔ میں نے بھی تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے ہیں۔ جن خطوں کی تاریخ تحریر کا تعین نہ ہو سکا، انہیں متعلقہ مکتوب الیہ کے نام خطوط کے آخر میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر کسی خط کی تاریخ کا اندازہ نہ ہو سکا لیکن سنہ کا اندازہ ہو گیا ہے تو اُس سنہ کے خطوط کے آخر میں اُس خط کو ترتیب دیا گیا ہے۔

## خطوں کی تاریخ تحریر

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ہر خط میں تاریخ تحریر ضرور لکھتے تھے لیکن یہ اُس مراسلت کا اثر ہو جو پنشن کے سلسلے میں غالب اور برطانوی حکومت کے درمیان تھی۔

غالب نے تاریخ تحریر مختلف طریقوں سے لکھی ہے۔ عام طور سے خط کے آخر میں لکھتے تھے لیکن کبھی خط کے آغاز میں اور کبھی خط کے متن میں بھی لکھ دیا کرتے تھے۔  
میں نے تاریخ تحریر کو خط کے آخر میں دائیں طرف ترتیب دیا ہے تاکہ قاری کو خط کی تاریخ تحریر معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

غالب کبھی صرف عیسوی تاریخ لکھتے تھے، کبھی ہجری اور کبھی دونوں۔ انہوں نے اگر ہجری تاریخ لکھی ہے تو میں نے اس کی عیسوی تاریخ بھی لکھ کر حاشیے میں اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ ایسے خطوط خاصی تعداد میں ہیں جن کی تاریخ تحریر میں غالب نے دن بھی لکھا ہے۔ غالب دن میں طرح سے لکھتے ہیں۔ عام طور سے دنوں کے فارسی نام یعنی سنبہ اور کیشنبہ وغیرہ، کبھی ہندوستانی نام اتوار، سوموار وغیرہ اور کبھی یوم النخیس اور آدینہ وغیرہ۔ کبھی وقت بھی لکھ دیتے مثلاً صبح، چاشتگاہ، نیم روز، وقت نماز ظہر وغیرہ۔

غالب تاریخ تحریر میں پہلے دن، پھر تاریخ، مہینہ اور سنہ لکھتے۔ کبھی سنہ لکھنے کے بجائے ”سال حال“ لکھ دیتے۔

مطبوعہ خطوط میں سہو کتابت کی وجہ سے بعض تاریخیں بدل گئی ہیں۔ خود غالب کے ہاتھ کے جو اصل خطوط دستیاب ہوئے ہیں، ان میں جب ہجری اور عیسوی تاریخوں کی مطابقت کرتے ہیں تو کبھی کبھی ایک دن کا فرق آتا ہے اور یہ فرق اس طرح کا ہوتا ہے کہ فرض کیجئے تاریخ کے اعتبار سے سنبہ ہونا چاہیے لیکن غالب نے جمعہ یا کیشنبہ لکھا ہے۔

چوں کہ ہجری اور عیسوی تاریخوں میں ایک دن کا فرق عام ہے، اس لیے میں نے ایسی تاریخوں کو نہیں بدلا جن سے ایک دن کا فرق آتا ہے، ہاں حاشیے میں اس فرق کا ذکر کر دیا ہے۔ جہاں ایک دن سے زائد کا فرق ہے، وہاں اُسے غالب یا کاتب کا سہو تصور کر کے بدل دیا ہے اور حاشیے میں اس تبدیلی کا ذکر کر دیا ہے۔

جب غالب کے خطوط شائع ہونے لگے تو تاریخ تحریر کو غیر ضروری سمجھ کر عام طور سے



حذف کر دیا گیا۔ ”عودِ ہندی“ میں کافی خطوط کی تاریخِ تحریر کو حذف کر دیا گیا ہے اس کے برعکس ”اردوئے معلّٰی“ میں بیشتر خطوط پر تاریخِ تحریر موجود ہے۔

ایسے خطوط کی بہت بڑی تعداد ہے جن پر تاریخِ تحریر نہیں ہے ان خطوں میں غالب نے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن کی مدد سے میں نے بیشتر خطوں کی تاریخِ تحریر کا تعین کیا ہے۔ اور ہر تاریخِ تحریر کے تعین کے لیے حاشیے میں اپنے مکمل دلائل پیش کیے ہیں تاکہ اگر مجھ سے غلطی ہو تو مستقبل کا محقق اُسے درست کر سکے۔

جن خطوط کے متن سے تاریخِ تحریر کا تعین نہیں ہو سکا، اُن کے لیے میں نے قیاس اور اندازہ سے کام نہیں لیا، بلکہ انھیں بغیر تاریخِ تحریر ہی کے رہنے دیا تاکہ خطوطِ غالب کے نقاد اور سوانح نگار غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔۔

## تنقیدی اڈیشن کے متن کی املا

تنقیدی اڈیشن کی املا میں دو ہوسکتی ہیں: مبنی نقاد متن کے لیے اپنے عہد کی املا کا استعمال کرتا ہے یا اُس املا کا جس میں مصنف نے متن لکھا تھا۔ میں اس حق میں ہوں کہ متن کی املا جدید ہونی چاہیے، کیوں کہ اول تو ہم متن اپنے عہد کے لوگوں کے لیے تیار کرتے ہیں اور دوسرے متن نقاد کا مقصد متن کی بازیافت ہے، املا کی بازیافت ہرگز نہیں۔

زبان کے مختلف عناصر کی طرح املا میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ تبدیلیاں بعض قاعدوں کے تحت ہوتی ہیں اور کچھ بے قاعدہ، محض چین کے تحت۔ اگر ہم آج سے پانچ چھ سو سال کا کوئی دکنی اردو متن مرتب کریں، اور متن کی وہی املا لکھیں جس میں ہمیں متن دستیاب ہوا ہے تو ہمارے عہد کے لوگوں کے لیے اس متن کا پڑھنا بہت مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے اس طرح کے متن ہمیں لازمی طور پر جدید املا میں مرتب کرنے ہوں گے۔ اب ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا کہ فلاں عہد تک کے متن تو

جدید املا میں مرتب ہوں گے اور اس کے بعد کے متن اُسی املا میں لکھے جائیں گے جس میں مصنف یا کاتب نے لکھا تھا۔ ان مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ جو متن ہم مرتب کر رہے ہیں، اگر مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ متن دستیاب ہو گیا ہے تو ہمیں چاہیے کہ تنقیدی اڈیشن کی املا تو جدید ہی رکھیں لیکن مقدمے میں مصنف کی املا کی خصوصیات بیان کر دیں۔

اردو کی بد نصیبی ہے کہ بعض حضرات نے اردو املا کی یہ حالت کر دی ہے کہ اردو کی کوئی معیاری املا نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اردو میں جو لفظ ایک سے زیادہ طریقے سے لکھے جاتے تھے، اُن میں یہ دیکھا جاتا کہ اکثریت ایک مخصوص لفظ کو کس طرح لکھتی ہے، اُسے ہی معیاری مان لیا جاتا۔ ہوا یہ کہ اردو املا کے مسائل حل کرنے والوں نے بہت سے الفاظ کی نئی نئی املا ایجاد کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایک لفظ کئی کئی طرح لکھا جاتا ہے۔ املا کے مسائل میں اُبھرتی ہیں پیدا کرنے والوں میں بعض اہم ادارے بھی شامل ہیں۔

غالب کے خطوط کا متن میں نے اُس املا میں تیار کیا ہے، جو میری املا ہے۔ ہاں غالب کی املا کی خصوصیات تفصیل سے بیان کر دی گئی ہیں۔ میری پوری کوشش رہی ہے کہ ایک لفظ کی میں نے جو املا کی ہے، پورے متن میں وہی برقرار رہے، اگر کہیں ایک لفظ کی املا دو طرح سے ملے تو اس میں میرا نہیں کاتب کا قصور ہے۔

## اوقاف کی علامتیں

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب انگریزی مراسلت کے طریقوں سے خاصے واقف تھے۔

غالباً انگریزی مراسلت کے طریقوں ہی کا اثر تھا کہ غالب ہر خط پر تاریخ تحریر پانڈی سے لکھتے تھے اور عبارت میں پیرا گراف کا خیال رکھتے تھے۔

غالب کے ایسے خطوط موجود ہیں، جن میں غالب نے پیرا گراف نئی سطر سے شروع کیا



ہے، اگرچہ ایسے خطوط کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ ہاں، غالب خط میں جب ایک بات ختم کرتے تو دوسری بات شروع کرنے سے پہلے عام طور سے کوئی نشان بنا دیتے۔ جس جملے سے نئی بات شروع کرتے اُس کے پہلے لفظ پر (س) علامت بنا دیتے۔ یہ علامت بہ قول مولانا امتیاز علی خاں عرشی عربی کے لفظ ”بت“ بہ معنی قطع کی شکل ہے۔ کبھی پیرا گراف ختم کرنے پر ”ڈ“ علامت ایک بار اور کبھی دو بار لکھتے۔ یہ علامت بہ قول عرشی مرحوم ”فقط“ کی طغرائی شکل ہے۔

غالب نے پیرا گراف ختم ہونے پر ”۱۳“ کا ہندسہ کثرت سے لکھا ہے۔ یہ لفظ ”حد“ کے عدد ہیں۔ اس علامت کے بارے میں غالب نے مرزا حاتم علی تہر کو ایک خط میں لکھا تھا ”صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں“

اس تنقیدی اڈیشن میں ہر پیرا گراف نئی سطر سے شروع کیا گیا ہے۔ اوقاف کی وہ علامتیں بھی استعمال کی گئی ہیں جو ہمارے عہد میں رائج ہیں۔

## رقمیں

غالب گنتی کبھی لفظوں میں اور کبھی ہندسوں میں لکھتے تھے۔ روپوں کی تعداد کے لیے بعض اوقات حسابی رقوم لکھتے تھے۔ اس تنقیدی اڈیشن کے متن میں گنتی اور روپوں کی تعداد وغیرہ لفظوں میں لکھی گئی ہے تاکہ طباعت کی غلطی سے محفوظ رہے۔

## غالب کا نام بہ حیثیت مکتوب نگار

غالب عام طور سے خط کے آخر میں تاریخ سے پہلے مکتوب نگار کی حیثیت سے اپنا نام

لکھتے تھے۔ نام لکھنے میں بھی انھوں نے بڑی جدت سے کام لیا ہے۔ جس کا تفصیل ذکر آگے آئے گا۔

میں نے خط کے آخر میں بائیں طرف مکتوب نگار کا نام ترتیب دیا ہے۔

## مکتوب الیہ کے حالات

میں نے مکتوب ایہم کے حالات خاصے تفصیل سے لکھے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے عزیز دوست کاظم علی خاں نے تمام مکتوب ایہم کے حالات بڑی محنت سے لکھ لیے ہیں اور کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں، اس لیے میں نے یہ حالات بہت مختصر کر دیے۔

---



# خطوطِ غالب کے مختلف اڈیشن اور ری پرنٹ

پچھلے سو سال میں جن کتابوں کے سب سے زیادہ ری پرنٹ وراڈیشن شائع ہوئے ہیں، اُن میں غالب کی ”اردوئے معلّٰی“ اور ”عمودِ ہندی“ سرفہرست ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو میں غالب کے خطوط کو غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے اور دوسرے غالب کے خطوط ہمیشہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل رہے۔ اس لیے بعض پبلشر تو ہر سال دو سال بعد ”اردوئے معلّٰی“ یا ”عمودِ ہندی“ کے ری پرنٹ شائع کرتے رہے۔

غالب کے خطوط کے اب تک جتنے ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوئے ہیں، اُن سب کا فراہم کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ اہم اڈیشن اور ری پرنٹ لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ یہاں کچھ قدیم ری پرنٹ اور بعض اہم اڈیشنوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

مہرِ غالب

ابتداء میں غالب کو پسند نہیں تھا کہ اُن کے خطوط مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع

کیے جاتیں۔ جب مرزا ہرگوپال تفتہ اور منشی شیونراتن نے غالب سے اُن کے خطوط مرتب کر کے شائع کرنے کی اجازت مانگی تو غالب نے اُن دونوں کو اس انداز سے منع کیا کہ اُن کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو گئے۔ تقریباً دو سال بعد چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں نے اُن خطوط کو شائع کرنے کا امدادہ کیا جو غالب نے سرور کو لکھے تھے۔ ان لوگوں نے غالب سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سرور نے اس مجموعے پر ایک دیباچہ لکھا اور اُس کا نام ”مہر غالب“ رکھا جو تاریخی نام ہے۔ اس نام سے ۱۳۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء-۱۸۶۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خطوط کا یہ مجموعہ ۱۸۶۱ء یا ۱۸۶۲ء میں مرتب ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ اس مجموعے میں کچھ اور لوگوں کے نام کے خطوط بھی شامل کیے جائیں، انہوں نے مزید خطوط حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعے کی طباعت معرض التوا میں پڑ گئی۔

## انتخاب غالب

غالب نے ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر غالباً انگریز افسروں اور فوجیوں کو اردو پڑھانے کے لیے اپنی اردو نظم و نثر کا ایک مختصر سا انتخاب کیا تھا یہ انتخاب ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ گویا ”عود بندہ“ اور ”اردوئے معلیٰ“ سے پہلے یہ شائع ہو چکا تھا۔ غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے لیے لکھوایا تھا وہ محمد عبدالرزاق راشد کو دستیاب ہو گیا۔ انہوں نے یہ انتخاب مرتب کر کے ۱۹۲۶ء میں چشتیہ پریس، حیدرآباد سے شائع کر دیا۔ اس کا دوسرا ڈیشن ۱۹۴۳ء میں دین محمدی پریس، لاہور سے شائع ہوا۔

اس انتخاب کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ملکیت تھا۔ جس کی فوٹوسٹیٹ کاپی غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ مالک رام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ انتخاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ اس قلمی نسخے میں کل تیس صفحات ہیں۔ ابتدا میں اس انتخاب پر غالب کا دیباچہ ہے۔



اس کے بعد مرزا حب علی بیگ سرور کی "گلزار سرور" اور خواجہ بدر الدین خاں کی "حدائق الانظار" پر لکھے گئے غالب کے وہ دیباچے ہیں، جو اردوئے معلیٰ میں شامل ہیں۔ پھر میر مہدی مجروح کے کے نام غالب کے بارہ خط ہیں۔ اس کے بعد دو نقلیں اور ایک لطیفہ۔ دوسرے حصے میں ۳۹ اردو اشعار ہیں اور آخر میں اس کتاب سے متعلق غالب کی لکھی ہوئی ایک مختصر سی نثر ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں محفوظ اس مجموعے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اور نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ تمام خطوط کے آغاز کے حاشیے میں "مقابلہ نمودہ شد" لکھا گیا ہے۔ متن میں ترمیمات کی گئی ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غالب کی نظر سے گزرا ہے۔

## عودِ ہندی : پہلا ڈیشن

غلام غوث خاں بے قبر، غالب سے اجازت لے کر ان کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ غالب نے نہ صرف بہ خوشی اجازت دی بلکہ خود بھی خطوط کی نقلیں فراہم کیں۔ بے قبر نے خطوط جمع کرنے کا کام ۱۸۶۱ء میں شروع کیا تھا لیکن ۱۸۶۵ء تک اس مجموعے کی طباعت کے آثار نظر نہیں آئے۔ تو بے قبر نے اپنا مرتب کیا ہوا مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا۔ منشی صاحب نے "مہر غالب" اور اس مجموعے کو ملا کر اس کا نام عودِ ہندی رکھا اور خود بھی اس مجموعے پر دیباچہ لکھا۔ مجموعے میں دو فصلیں ہیں پہلی فصل کی ابتدا چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے سے ہوتی ہے۔ اور پھر وہ پچیس خط ہیں جو سرور نے مرتب کیے تھے۔ دوسری فصل میں حسب ذیل حضرات کے نام خطوط ہیں۔ صاحب عالم مارہروی (۲ خط) شاہ عالم مارہروی (۲ خط) انور الدولہ شفق (۲۰ خط) مرزا یوسف علی خاں عزیز (۲ خط) مرزا ہرگوپال تفتہ (۱ خط) مرزا حاتم علی تہر (۱۸ خط) غلام غوث خاں بے قبر (۲۵ خط) عبدالغفور نساخ (۱ خط) ظہیر الدین خاں کی طرف سے ان کے چچا کے نام (۱ خط) نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ کے نام (۱ خط) مردان علی خاں رعنا (۲ خط) مرزا رحیم بیگ (۱ خط)

عبدالرزاق شاکر (۱۰ خط) قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی (۷ خط) مولوی عزیز الدین (خط)  
 سید محمد عباس (خط) منشی غلام بسم اللہ (خط) مجروح (۳۱ خط) میر سرفراز حسین (خط)  
 خطوط کا یہ مجموعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع ہوا۔

### عودِ ہندی کے بارے میں ایک اہم انکشاف

بہت عرصہ ہوا میں نے غالب کے وہ خطوط مرتب کر لیے تھے جن کے متن کی بنیاد  
 ”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلیٰ“ کے پہلے ڈیشنوں پر تھی۔ انجن ترقی اردو (ہند) کا جنرل سکریٹری  
 ہو جانے کے بعد میری مسہر و فیات کچھ اس طرح کی ہو گئیں کہ کافی عرصے تک اس کام کی طرف توجہ  
 نہیں کر سکا۔ اس دوران میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ میری دس پندرہ بہت قیمتی  
 کتابیں ایک ساتھ چوری ہو گئیں۔ ان میں ”عودِ ہندی“ کا وہ پہلا ایڈیشن بھی تھا، جو میں نے  
 پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے خریدا تھا۔ اس وقت میں چور کو بہت کوسا تھا لیکن اب  
 دعائیں دیتا ہوں کہ اگر وہ میری کتابیں چوری نہ کرتا تو ”عودِ ہندی“ کے بارے میں ایک اہم ترین  
 انکشاف میں اور نہ جانے کتنا زمانہ لگتا۔

جب میں نے کام دوبارہ شروع کیا تو انجن ترقی اردو کی لائبریری سے  
 ”عودِ ہندی“ کا پہلا ایڈیشن لے لیا۔ مرتب کیے ہوئے خطوط کا جب ”عودِ ہندی“ سے موازنہ کیا  
 تو بہت زیادہ اختلافات نسخہ نکلے۔ دس پندرہ صفحات کا موازنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا  
 کہ ”عودِ ہندی“ کا وہ پہلا ایڈیشن جو میری ملکیت تھا اور چوری ہو گیا تھا انجن کے اس ایڈیشن  
 سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے نوٹس کھنگالے تو ایک کاغذ پر گم شدہ ”عودِ ہندی“ کے بارے  
 میں نوٹ کی ہوئی تفصیلات مل گئیں۔ یہ ایڈیشن مطبع مجتہبی میرٹھ میں ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو شائع  
 ہوا تھا انجن کے ڈیشن کو دیکھ تو وہ بھی ”مسع مجتہبی میرٹھ میں اسی تاریخ کو چھپا تھا۔ پھر سوال  
 یہ تھا کہ میں نے جو متن تیار کیا تھا، اس میں ”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلیٰ“ کے پہلے ایڈیشنوں کو



بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا تھا اور تمام اختلافات نسخ کی نشان دہی کی تھی، پھر اب وہ اتنا مختلف کیوں ہے۔ میں یہ تو مان سکتا تھا کہ عود ہندی میں کوئی لفظ حذف ہو گیا ہو اور میری نظر چوک گئی ہو لیکن اگر کسی عبارت میں ”اردوئے معلیٰ“ کے مقابلے میں ”عود ہندی“ میں کوئی لفظ زائد ہو تو یہ لفظ میں کہاں سے لایا۔ اور اس کی نشان دہی کیسے کی بھپس میں نے اپنے متن کا موازنہ ”اردوئے معلیٰ“ سے کیا تو معلوم ہوا کہ میں نے جن اختلافات نسخ کی نشان دہی کی ہے وہ بالکل درست ہیں۔

انورالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفق کے نام غائب کے ایک خط کے اختلافات نسخ ملاحظہ ہوں۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ میرا پریشان ہونا کہاں تک جائز تھا۔

عود ہندی پہلا اڈیشن (انجمن)  
قصیدہ

میرا تیار کیا ہوا متن  
قصید (میں نے اس لفظ کے  
بارے میں حاشیے میں لکھا تھا کہ  
”قصید“ سہو کا تب ہے یہ لفظ  
”قصیدہ“ ہے)

ہرزہ

ہرزہ

اور وہ

آوردہ (میں نے لکھا تھا کہ طباعت  
کی غلطی ہے، اصل لفظ ”اور وہ“  
ہے۔)

باہم شیر

ہم شیر

اس نسخے میں یہ لفظ ندارد

سفر

حضور والد

حضور والا

ایک ہی خط میں اتنے اختلافات نسخ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرا سب کا بے کار ہو گیا۔

میں نے اپنے متن کا موازنہ ”عودِ ہندی“ کے اس اڈیشن سے کیا جو مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل نے مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کرایا تھا۔ اس کا متن تقریباً وہی جو میں نے تیار کیا تھا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا کم شدہ ”عودِ ہندی“ کا اڈیشن انجمن کے اڈیشن سے بالکل مختلف تھا۔

اتفاق سے انجمن کی لائبریری میں ”عودِ ہندی“ کا ایک اور پہلا اڈیشن نکل آیا۔ میں نے دونوں اڈیشنوں کے سرورق اور ترقیمے کی عبارتوں کا موازنہ کیا تو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ میں نے ”عودِ ہندی“ کے جس اڈیشن کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا تھا وہ یہی ہے جو دوسری دفعہ میں نے انجمن سے حاصل کیا۔

اگرچہ ترقیمے میں تاریخ اشاعت دونوں میں ایک ہی یعنی ۱۰ رجب ۱۲۸۵ء دی ہے۔ لیکن سرورق کی عبارت میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک اڈیشن کی سرورق کی عبارت یہ ہے :

خداوند بے نسبت بندگی ۔ نہ پری درونہ پراگندگی

بفضل واہب العطیات خالق الخیر والחסنات

انشاء اردو لا جواب موسوم بہ

عودِ ہندی

من تصنیف جناب استادِ زماں علامہ عصر

اسد اللہ خاں المتخلص بن غالب حسب فرمایش مجمع

خوبی ہا جہاں میاں محمد ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ ۔

در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

دوسرے اڈیشن میں دوسری سطر میں ”انشاء اردو“ کے بجائے ”انشاء اردو“ اور

آخری سطر اس طرح ہے :

”در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد“



دونوں اڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں اختلاف کا صاف مطلب ہے کہ دونوں الگ الگ اڈیشن ہیں۔

## دونوں اڈیشنوں کی مماثلتیں

- ۱۔ دونوں اڈیشنوں کی کتابت کا بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے کاتب مختلف ہیں لیکن دوسرے کاتب نے پہلے کاتب کی نقل انتہائی کامیاب طریقے سے کی ہے۔
- ۲۔ ایک اڈیشن میں ہر صفحہ جس لفظ پر ختم ہوتا ہے دوسرے اڈیشن میں بھی اسی لفظ پر ختم ہوتا ہے۔
- ۳۔ دونوں اڈیشنوں کا سائز ایک ہی ہے۔
- ۴۔ دونوں اڈیشنوں میں انیس سطر استعمال کیا گیا ہے۔
- ۵۔ دونوں اڈیشنوں کے آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں۔

## اختلافات

- ۱۔ دونوں اڈیشنوں میں بے شمار اختلافات نسخ ہیں۔
- ۲۔ دونوں کے صفحات تو ایک ہی لفظ پر ختم ہوتے ہیں لیکن سطریں عام طور سے مختلف الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔
- ۳۔ دونوں کے سرورق کی عبارت میں بھی اختلاف ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔
- ۴۔ مخطوطات میں اور انیسویں صدی کے نصف آخر تک کی مطبوعات میں عام قاعدہ تھا کہ جس لفظ پر جفت صفحہ ختم ہوتا تھا۔ اسے دوسرے طاق صفحے کے شروع میں پھر لکھتے تھے۔ ایسا غالباً اس لیے کیا جاتا تھا کہ اگر صفحات آپس میں مل جائیں تو انھیں ترتیب

دیا جاسکے۔ ”عودِ ہندی“ کے ایک اڈیشن میں اس قاعدے کی پابندی کی گئی ہے جبکہ دوسرے میں بالکل نہیں کی گئی۔

”عودِ ہندی“ کی ترتیب مکمل ہونے میں تقریباً پانچ سال لگے تھے، اور اس کی طباعت میں مزید دو سال لگ گئے۔ بالآخر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں ”عودِ ہندی“ شائع ہو گئی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ تعدادِ اشاعت کیا تھی۔

”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلّٰی“ دونوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی ان کی بہت شہرت ہو چکی تھی، اس لیے یہ امرکان ہے کہ اردو والوں کو ان مجموعوں کا بہت انتظار رہا ہو۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے ایک خط میں غالب کو لکھا تھا:

”منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے

دکھائی، سب چھپ گئی، ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خان صاحب نے

قطعہ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کم دے، اسے پھینک رکھا ہے۔ مراد آباد

میں اخبارِ صبوہ طوز کا ہتھم بھی وارد تھا وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی ناتمام

پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔“

اس کا مطلب ہے کہ ”عودِ ہندی“ کی شہرت بہت ہو گئی تھی۔ ابھی اس کا آخری صفحہ چھپا بھی نہیں تھا کہ لوگ خریدنے لگے۔ ”عودِ ہندی“ جب شائع ہوئی ہے تو غالب ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ اُن کے شاگرد اور مداح تقریباً تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے تقریباً دس سال پہلے جب اُن کی ”دستنبو“ شائع ہوئی تو تقریباً چھ مہینے میں ساری فروخت ہو گئی۔ جس پر غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا:

”کتب ”دستنبو“ کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔۔۔۔ دیکھو صاحب

تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔“ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء

کیمن نامی ایک انگریز مدارسِ غرب و شمال کے محکمے میں کسی عہدے پر فائز تھا اُس نے



غالب سے اُن کی اردو نظم و نشر کی فرمائش کی تھی۔ غالباً یہ فرمائش طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر کی گئی تھی۔

ہنری اسٹوارٹ محکمہ صوبہ جات متحدہ کے محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے غالب سے اردو نشر میں ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جسے وہ غالباً اسکول کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس فرمائش کے سلسلے میں غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا تھا:

”جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکا

اُن کی فرمائش ہے اردو کی نشر، وہ انجام پائے تو اُس کے ساتھ اُن کو خط لکھوں“

اس کا مطلب ہے کہ اس زمانے میں اردو نشر کی ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جنہیں نصاب میں شامل کیا جاسکے۔ اس لیے پورا امکان ہے کہ ”عود ہندی“ نصاب میں شامل کر لی گئی ہو یا لائبریریوں کے لیے کافی تعداد میں خریدی گئی ہو

امکان یہ بھی ہے کہ طباعت کے دوران میں کافی آرڈر آگئے ہوں۔ اس لیے بہت جلد دوسرے اڈیشن کی ضرورت پڑ گئی ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسرا اڈیشن چھاپا گیا تو پہلے اڈیشن کی ایسی نقل کیوں کی گئی کہ آخری صفحے پر تاریخ طباعت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

اب ری پرنٹ کی طباعت کی کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ خود منشی ممتاز علی خاں نے دوسرا اڈیشن شائع کیا۔ اگر ایسا تھا تو منشی ممتاز علی خاں ”عود ہندی“ میں فخر سے اس کا اعلان کرتے کہ پہلا اڈیشن ختم ہو گیا اور اب دوسرا اڈیشن چھاپا جا رہا ہے۔ اگر منشی ممتاز علی خاں دوسرا اڈیشن شائع کرتے تو اسے چھپانے کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس زمانے میں مصنف کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا، بلکہ اُلٹا معاملہ ہوتا تھا، مصنف کچھ کتابیں خریدنے کی پیش کش کرتا تھا۔ غالب نے ”دستنبو“ کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا اور اپنے ایک مداح رائے امید سنگھ سے ان پچاس

جلدوں کی قیمت منشی شیونرائن آرام کو دلوائی تو انھوں نے ”دستنبو“ چھاپی، اس لیے منشی ممتاز علی خاں کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس طرح چھپا کر دوسرا اڈیشن چھاپتے۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ ”عودِ ہندی“ کی مقبولیت دیکھ کر کسی نے جعلی اڈیشن شائع کر دیا۔ مگر یہ بھی قرین قیاس نہیں کیوں کہ ”عودِ ہندی“ کی اشاعت کے حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں کیے گئے تھے اور پھر غالب کی وفات ہو چکی تھی اس لیے کوئی بھی دوسرا اڈیشن شائع کر سکتا تھا اور پھر دونوں اڈیشنوں کے آخری چار صفحے بالکل ایک ہیں، اور ایک ساتھ چھپے ہیں۔ تیسری صورت جو قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ ”عودِ ہندی“ کے ۱۸۴۷ صفحات چھپ چکے تھے، قطعہ تاریخ طباعت کے انتظار میں چار صفحے کی آخری کاپی نہیں چھپی تھی۔ جب آخری کاپی چھپنے کی نوبت آئی تو منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ ”عودِ ہندی“ کی مانگ بہت زیادہ ہے اور انھوں نے جتنی کتابیں چھپوائی ہیں وہ نا کافی ہیں۔ ۱۸۴۷ صفحے چھپے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے اس لیے پریس میں ان کے پتھر بھی صاف کر دیے گئے تھے۔ مجبوراً ۱۸۴۷ صفحات کی کتابت کرا کے انھیں چھپا گیا۔ آخری چار صفحے اتنی تعداد میں شائع کیے گئے کہ وہ پوری کتاب کے لیے کافی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۷ صفحات کے متن میں تو بہت زیادہ اختلافات ہیں لیکن آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں۔

متنی نقاد کے لیے ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے پہلا اڈیشن کس کو مانے اور ری پرنٹ کسے تسلیم کرے۔

یقینی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جس کتاب کے سرورق پر ”باتہام محمد ممتاز علی خاں“ لکھا ہوا ہے یہ وہ اڈیشن ہے جو پہلے چھپا تھا۔ کیوں کہ (۱) اس اڈیشن پر محمد ممتاز علی خاں کا نام ہے (۲) اس اڈیشن کا کاتب دوسرے اڈیشن کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور نچستہ کار معلوم ہوتا ہے (۳) پہلے اڈیشن کا کاغذ زیادہ بہتر ہے جبکہ دوسرے اڈیشن کا کاغذ تجارتی انداز کا ہے۔



”عودِ ہندی“ کے جتنے اڈیشن چھپے ہیں ان سب کے ساتھ یہ ہوا کہ کسی نے ایک اڈیشن کو بنیاد بنایا، اور کسی نے دوسرے کو۔ ۱۸۷۸ء میں مطبع نرائنی، دہلی سے ”عودِ ہندی“ کا جو اڈیشن چھپا تھا اس کی بنیاد ”عودِ ہندی“ کے پہلے اڈیشن پر ہے۔ اور ۱۸۸۷ء میں مطبع نول کشور سے جو چھپا تھا اس کی بنیاد ری پرنٹ پر ہے۔ مولوی مہیش پرشاد کو بھی چوں کہ ری پرنٹ کا علم نہیں تھا اس لیے انھوں نے بھی صرف ایک ہی کو بنیاد بنایا ہے جس کی وجہ سے ان کے بتائے ہوئے اختلافات نسخ بے معنی ہو گئے ہیں۔

ہمیں اس کا یقین نہیں کہ ری پرنٹ کون سا ہے اور پہلا اڈیشن کون سا اور اگر فرض کیجیے کسی طرح یہ ثابت بھی ہو جائے کہ پہلا اڈیشن کون سا ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں کہ دوسرے اڈیشن کی کتابت پہلے اڈیشن سے ہوئی تھی یا اصل مسودے سے۔ حال اُن کہ امکان یہی ہے کہ مسودے سے ہوں گی کیوں کہ مسودہ ہوتے ہوئے پبلشر ایک کتاب خراب کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اس لیے متنی نقاد کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ دونوں اڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کی حیثیت سے استعمال کرے۔ میں نے ”غالب کے خطوط“ کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں ایسا ہی کیا ہے۔

## اردوئے معلیٰ : پہلا اڈیشن

”عودِ ہندی“ کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی تھی اور غالب کے چاہنے والوں کا مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دہلی میں حکیم غلام رضا خاں مالک ”اکمل المطالع“ نے غالب کے خطوط چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ غالب نے بعض دوستوں کو خط لکھ کر اپنے خطوط یا اُن کی نقلیں فراہم کیں۔ یہ ممکن ہے کہ طباعت کی نگرانی بھی خود غالب نے کی ہو کیوں کہ ”عودِ ہندی“ کے مقابلے میں اس مجموعے میں کتابت کی غلطیاں کم ہیں۔ میر مہدی مجروح نے اس کا دیباچہ اور

قربان علی بیگ ساگک نے خاتمہ لکھا اور کتاب دو حصوں میں ترتیب دی گئی۔ پہلے حصے میں وہ خطوط شامل کیے گئے جو آسان اور صاف زبان میں تھے اور جن میں ادبی مسائل پر گفتگو نہیں کی گئی، یہ حصہ طالب علموں کے لیے تھا۔ دوسرے حصے میں وہ خطوط شامل کیے گئے، جن میں مشکل مطالب بیان کیے گئے تھے۔ عرشی صاحب کا خیال ہے کہ: ”غالباً پہلی بار صرف حصہ اول شائع ہو سکا، اس لیے کہ کتب خانہ عالیہ رام پور میں جو نسخہ موجود ہے وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصہ اول پر مشتمل ہے۔“ اس کا بھی امکان ہے کہ پہلے حصے کو باقاعدہ کتاب بنا کر، طالب علموں کے لیے اس کے کچھ زائد نسخے چھپواتے گئے ہوں۔

کتاب کے آخر میں غالب کی ایک تحریر شامل ہے جس میں غالب نے لکھا ہے کہ: ”میں نے ازراہ فرط محبت، اپنا حق تالیف نور چشم اقبال نشاں، حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے۔“ اس مجموعے میں خطوں کی مجموعی تعداد ۴۷۰ ہے اور حسب ذیل حضرات کے نام کے خطوط اس میں شامل کیے گئے ہیں۔

نواب میر غلام بابا خاں بہادر (۱۰ خط)۔ میاں داد خاں سیاح (۲۹ خط)۔ منشی حبیب اللہ ڈکا (۱۰ خط)۔ مرزا ہرگوپال تفتہ (۸۹ خط)۔ شاہزادہ بشیر الدین (۳ خط)۔ سید بدر الدین المعروف بہ فقیر (۵ خط)۔ چودھری عبدالغفور مسرور (۶ خط)۔ میر سرفراز حسین (۲ خط)۔ میر مہدی مجروح (۲۳ خط)۔ شاہ عالم (۲ خط)۔ صاحب عالم (۲ خط)۔ عبدالغفور نساخ (۱ خط)۔ قاضی عبدالحجیل جٹون بریلوی (۱۱ خط)۔ مردان علی خاں رعنا مراد آبادی (۲ خط)۔ عبدالرزاق شاگر (۲ خط)۔ مولوی عزیز الدین (۱ خط)۔ مفتی سید عباس (۱ خط)۔ حکیم غلام نجف خاں (۲۳ خط)۔ نجم الدین حیدر خاں (۱ خط)۔ نواب ابراہیم علی خاں وٹا (۵ خط)۔ مولوی احمد حسن قنوجی (۲ خط)۔ حکیم سید احمد حسن مودودی (۱۱ خط)۔ تفضل حسین خاں (۱ خط)۔ مرزا حاتم علی بہر (۱۸ خط)۔ منشی نبی بخش (۲ خط)۔ منشی عبداللطیف (۱ خط)۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر (۴ خط)۔ نواب ضیاء الدین خاں تیر (۱ خط)۔ مرزا شہاب الدین خاں (۷ خط)۔ نواب

انور الدولہ شفق (۱۹ خط)۔ میرن صاحب (۳ خط)۔ قربان علی بیگ خاں ساکت (۲ خط)۔  
 شمشاد علی بیگ خاں رضوان (۲ خط)۔ باقر علی خاں کاکل (۲ خط)۔ حسین مرزا (۴ خط)۔ نواب  
 یوسف مرزا (۱۲ خط)۔ منشی شیونرائن (۳۳ خط)۔ بابو ہرگو بند سہاسے (۲ خط)۔  
 نواب امین الدین خاں بہادر (۶ خط)۔ نواب علاء الدین خاں علائی (۵۶ خط)۔ فرخ مرزا  
 (۱ خط)۔ احمد حسین میکش (۲ خط)۔ حکیم مرتضیٰ خاں (۱ خط)۔ حکیم غلام رضا خاں (۱ خط)۔  
 ماسٹر پیارے لال (۲ خط)۔ جواہر سنگھ جوہر (۲ خط)۔ منشی ہیرا سنگھ (۱ خط)۔ اور  
 بہاری لال مشتاق (۲ خط)۔ ظہیر الدین احمد خاں (۱ خط)۔ یوسف علی خاں عزیز (۱ خط)۔  
 ۴۶۴ صفحات پر مشتمل خطوط کا یہ مجموعہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (مطابق ۶ مارچ  
 ۱۸۶۹ء) کو شائع ہوا، گویا غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد۔

### عودِ ہندی : ری پرنٹ

ستمبر ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے ”عودِ ہندی“ کا ایک ری پرنٹ شائع ہوا۔ اس  
 کے خاتمے کی عبارت میں لکھا گیا ہے کہ: ”پہلے شائقین کی تلاش سے مدد ہو کر مطبع مجتہائی میرٹھ  
 میں طبع ہوا تھا، باقی نہیں رہا۔ لہذا فی الحال حسب اصرار اہل شوق مطبع نامی سرچشمہ فوت  
 جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ میں۔۔۔ روکش مرقع مانی ہوا۔“  
 یہ مجموعہ ۶۶ صفحات پر مشتمل،  $\frac{1}{4} \times \frac{1}{4}$  کے سائز پر شائع ہوا تھا۔

### اردو سے معلیٰ : ری پرنٹ

یہ ری پرنٹ نسخہ نمائپ میں، ۵۰ صفحات پر مشتمل، مارچ ۱۸۸۳ء میں مطبع اردو گائیڈ،  
 کلکتہ سے  $\frac{1}{4} \times \frac{1}{4}$  کے سائز پر شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر جو عبارت لکھی گئی ہے،  
 اُس سے پتا چلتا ہے کہ بحکم سرکار، باہتمام سکرٹری بورڈ آف ایگزامینشن، بذریعہ



صمد کبیر الدین احمد شائع ہوا۔ یہ کتاب نسخ مائپ میں شائع ہوئی۔ اس ری پرنٹ میں میر مہدی مجروح کے دیباچے اور قربان علی بیگ خاں سالک کی تقریظ شامل نہیں کی گئی۔ خطوط میں سے ایسے فقرے بھی نکال دیے گئے، جو حکومت کے نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں تھے۔

## اردوئے معلیٰ: ری پرنٹ

”اکمل المطابع“ سے ”اردوئے معلیٰ“ کا دوسرا ری پرنٹ ۱۰ فروری ۱۸۹۱ء کو شائع ہوا۔ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ”۹ ۱/۲ x ۶ ۱/۲“ کے سائز پر شائع ہوا۔ کتاب کے آخری ورق پر اجازت نامے کے عنوان سے حکیم غلام رضا خاں کا یہ اعلان شائع ہوا کہ: ”میں صرف ایک ہی دفعہ کے لیے ایک ہزار کاپی (کاپی) ”اردوئے معلیٰ“ کی اجازت (جس کا کاپی رائٹ میرے پاس محفوظ ہے) سید فخر الدین صاحب مہتمم مطبع اور محمد اجمل خاں کو دیتا ہوں۔ آئندہ یہ بغیر میری اجازت کے بارگاہ نہیں چھاپ سکتے۔“

## اردوئے معلیٰ: حصہ اول، حصہ دوم

”اردوئے معلیٰ“ کا یہ ادیشن مطبع نامی مجتہائی دہلی سے اپریل ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا حصہ ۳۸۴ اور دوسرا حصہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ”۹ ۱/۲ x ۶ ۱/۲“ ہے۔ دوسرے حصے پر محمد عبدالاحد نے مختصر دیباچہ لکھا ہے۔

اس مجموعے کے حصہ اول کے خطوط وہی ہیں، جو ”اردوئے معلیٰ“ کے پہلے ادیشن میں شائع ہوئے تھے۔ حصہ دوم کی ابتدا میں اطلاع دی گئی ہے کہ: ”حمد و صلوة کے بعد احقر العباد محمد عبدالاحد عفا عنہ الصمد شائقین و التامکین کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جب ”اردوئے معلیٰ“ مرزا غالب ہندوستان کے سعدی مولانا حالی کی اجازت سے مطبع میں چھپی تو مولانا موصوف نے ایک قلمی مسودہ مرزا غالب کے رقت کا اپنے پاس سے بھی عنایت فرمایا،

جس کو احقر نے حصہ دوم، "اردو سے معلیٰ" کے نام سے نامزد کر کے اسی کے آخر میں شامل کر دیا۔ اس حصے میں خاص کر وہ رقعات ہیں، جن میں انھوں نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے یا کوئی نکتہ بتایا ہے اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں۔ اس حصے میں مفتی سید رحمت علی خاں کی "سراج المعرفت" خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان کی "صدائق انظار" پر غالب کے لکھے ہوئے دیباچے، بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی "گلزار سرور" پر تقریظیں، منشی حبیب اللہ ذکا کے دیوان اور سید فرزند احمد صغیر بلگرامی کے رسالہ تذکیر و تانیث پر دیباچے ہیں۔ اس کے بعد مستدرجہ ذیل خطوط ہیں۔

مرزا ہرگوپال تفتہ — ۳۴

ماسٹر پیارے لال — ۱

حبیب اللہ ذکا — ۵

میاں داد خاں سیاح — ۵

شہزادہ بشیر الدین — ۲

منشی کیول رام — ۱

مولوی کرامت علی — ۱

جواہر سنگھ جوہر — ۱

منشی ہیر سنگھ — ۱

میر مہدی مجروح — ۲

اردو سے معلیٰ: حصہ اول و دوم۔ دوسراری پرنٹ

مطبع مجتبائی دہلی سے اپریل ۱۸۹۹ء میں "اردو سے معلیٰ" حصہ اول و دوم جو شائع ہوا تھا،

اُس کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ عزیز دوست کاظم علی خاں کی عنایت سے مجھے معلوم ہوا کہ اردوئے معلّٰی کے اس اڈیشن کے ساتھ بھی تقریباً وہی معاملہ ہے، جو ”عودِ ہندی“ کے پہلے اڈیشن کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کا بھی ایک ایساری پرنٹ شائع ہوا تھا، جس کی تاریخ طباعت وہی شائع کی گئی، جو پہلے اڈیشن پر تھی۔ میں نے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے وہ تو وہی ہے جو پہلے اڈیشن کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ اڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کاظم علی خاں صاحب کے اطلاع دینے پر میں نے اس نسخے کی تلاش شروع کی تو ہر دیال لائبریری میں یہ نسخہ مجھے مل گیا۔

اس ری پرنٹ کے آخر میں تاریخ طباعت اس طرح دی گئی ہے :

”العبد۔ محمد عبدالاحد عفی عنہ پروپرائٹر مطبع مجتبائی دہلی ماہ اپریل ۱۸۹۹ء“

اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ پہلا اڈیشن ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ پہلے اڈیشن کے پہلے اور دوسرے حصے کے آخر میں محمد عبدالاحد کے نام کے ساتھ ”عفی عنہ“ لکھا گیا ہے، جب کہ ری پرنٹ میں دوسرے حصے کے آخر میں تو نام کے ساتھ ”عفی عنہ“ ہی چھپا ہے، لیکن پہلے حصے کے آخر میں محمد عبدالاحد کے ساتھ ”مرحوم و مغفور“ چھپا ہے۔ پہلے اڈیشن کے پہلے حصے کے ۳۸۴ اور دوسرے حصے کے ۶۴ صفحات ہیں۔ اس کے برعکس ری پرنٹ کے پہلے حصے کے ۳۴۷ اور دوسرے حصے کے ۵۶ صفحات ہیں۔

کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے ان دونوں کتابوں کے متن میں خاصے اختلافات ہو گئے ہیں۔ یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ری پرنٹ پر تاریخ طباعت وہی کیوں چھپائی گئی جو پہلے اڈیشن پر تھی۔ کتاب شائع کرنے والوں کی غیر ذمہ داری کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اردوئے معلّٰی : حصہ اول

اردوئے معلّٰی کا یہ ری پرنٹ مطبع فاروقی، دہلی سے سال ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ ۲۸۴ صفحات



پر مشتمل یہ مجموعہ  $\frac{1}{4} \times \frac{1}{4}$  کے سائز پر شائع ہوا۔ کتاب کے آخر میں سید عبدالسلام ابن سید محمد معظم پروفیسر سٹریٹ فاروقی کی طرف سے اعلان ہے کہ: ”کاپی راسٹ محفوظ ہے۔“

## مکمل اردوئے معلیٰ: مشتمل برہر دو حصہ

اردوئے معلیٰ کا یہ ادیشن ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق جولائی ۱۹۲۲ء مطبع مجیدی کانپور

سے ۳۸۴ صفحات پر مشتمل،  $\frac{1}{4} \times \frac{1}{4}$  کے سائز پر شائع ہوا۔

اب تک ”اردوئے معلیٰ“ کے تمام مجموعوں میں مکتوب الیہم کی فہرست نہیں ہوتی تھی اور ایک ہی مکتوب الیہ کے نام کے خطوط یکجا ہونے کے بجائے مجموعے میں بکھرے ہوتے تھے۔ غالباً یہ پہلا مجموعہ ہے، جس میں محمد منیر منیر نے ترتیب متن کا ابتدائی کام کیا ہے۔ سب سے پہلے غالب کے مختصر سوانح دیے گئے ہیں۔ ہر مکتوب الیہ کے نام کے خطوط ایک جگہ کر دیے گئے ہیں خطوط کی فہرست میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے سامنے اس کے نام کے کل خطوط کی تعداد بھی لکھی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں یہ نوٹ دیا گیا ہے: ”چوں کہ یہ مجموعہ بہ ترتیب نو بہ صرف زبر کثیر، تیار کرایا گیا ہے۔ لہذا حق ترتیب بحق مطبع ہذا محفوظ ہے۔ کوئی صاحب بلا اجازت مالک مطبع اس ترتیب سے نہ چھاپیں۔“

## اردوئے معلیٰ مکمل: ہر دو حصہ مع ضمیمہ

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور نے مطبع کریمی سے ستمبر ۱۹۲۳ء میں شائع کیا۔ ۴۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔  $\frac{1}{4} \times \frac{1}{4}$  کے سائز پر چھاپا گیا ہے۔ شروع میں ادیب کا لکھا ہوا پندرہ صفحات پر مشتمل، مرزا غالب دہلوی کے عنوان سے ایک دیباچہ ہے۔ اس دیباچے میں غالب کی زندگی کے کچھ اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی نے اردو سے معلیٰ (علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء) میں غالب کے قدردانوں کے نام بآئیں خط اور ایک خط شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام شائع کیے تھے۔ ان خطوط کو بھی اس مجموعے میں ضمیمے کے تحت شامل کر لیا گیا ہے۔ ضمیمے کے شروع میں شیر محمد سرخوش کی ۶ صفحات پر مشتمل ایک تحریر ہے، جس میں خطوط غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس مجموعے کے ری پرنٹ میرے پیش نظر ہیں۔ پہلا ری پرنٹ جیسا کہ عرض کیا گیا، ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ۱۹۲۶ء میں اور تیسرا ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی اور ری پرنٹ شائع ہوا ہو۔

### عودِ ہندی : ری پرنٹ

رام نرائن لال، الہ آباد سے عودِ ہندی کا یہ ری پرنٹ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ری پرنٹ ۳۱۸ صفحات پر مشتمل اور ۱۴ × ۶ کے سائز پر ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس کے آخر میں ۶۴ صفحات پر مشتمل مشکل الفاظ کی فہرست شامل کی گئی ہے۔

### ادبی خطوطِ غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری

غالب کے خطوط کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ایسے خطوط کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں غالب نے "نکاتِ ادبیہ حل کیے ہیں، اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی کی ہے"۔ ترین صفحات کے دیباچے میں غالب کے خطوط کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر شاید یہ پہلی جامع تحریر ہے۔ پھر خطوط کا انتخاب دیا گیا ہے۔ آخر میں غالب کے تینیس مکتوبِ ایہم کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ اس انداز کا کام اردو میں پہلی بار ہوا ہے۔

یہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

## مکاتیبِ غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی

رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم اور اُن کے صاحب زادے نواب کلب علی خاں ، غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کو دربارِ رام پور سے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جو مرتے دم تک انھیں ملتی رہی، اس لیے غالب اور نوابانِ رام پور میں سلسلہ مراسلت تھا۔ اہل اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ غالب کے خطوط کا بڑا حصہ محکمہ عالیہ دارالانشاء، رام پور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی نے ان خطوط کو مرتب کرا کے شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کام کے لیے اُن کی نظر انتخاب مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسے عالم پر پڑی۔

عرشی صاحب نے غالب کے ۱۱ خطوط کا تنقیدی متن تیار کیا۔ ان خطوط کے مکتوبِ اہم کی تفصیل یہ ہے :

یوسف علی خاں ناظم ————— ۴۲ (۳۸ اردو اور ۴ فارسی)

نواب کلب علی خاں ————— ۶۵

نواب زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں — ۲

خلیفہ احمد علی رام پوری ————— ۱

منشی سیل چند ————— ۶

مولوی محمد حسن ————— ۱

مکاتیبِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں مطبع قیثمہ بمبئی سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن ٹائپ کے ذریعہ چھاپا گیا تھا اور طباعت کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کے چھپے ہی پرنٹ شائع ہوئے۔ آخری اور چھٹاری پرنٹ ۱۹۴۹ء میں رام پور سے شائع ہوا۔

مولانا عرشی نے مکاتیبِ غالب میں ایک سو تراسی صفحات پر شتمل ایک مبسوط مقدمہ لکھا۔



جس میں سرگزشت غالب، تصانیف، لوازماتِ امارت، انگریزی تعلقات، بہادر شاہ ظفر سے تعلقات، تعلقاتِ رام پور، انشائے غالب، متعلقاتِ انشا اور طباعتِ خطوط کے عنوانات کے تحت غالب کے سوانح لکھے ہیں اور غالب کی خطوط نگاری کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس کے بعد خطوط کا متن دیا گیا ہے متن کے بعد اشخاص و قبائل، مقامات اور کتب و اخبارات کے تین مکمل اشاریے دیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے کسی نے خطوط غالب کے اشاریے تیار نہیں کیے تھے۔ عرشی صاحب نے پہلی بار یہ کام کیا ہے۔

مولانا عرشی نے ان خطوط کا تنقیدی اڈیشن انتہائی سائنسی فک انداز میں اور غیر معمولی احتیاط سے تیار کیا ہے پورے متن میں مشکل ہی سے کوئی غلطی نکلے گی۔ خطوط پر بڑی محنت اور عالمانہ انداز سے حواشی لکھے گئے ہیں۔ کسی بھی خط میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہو، جو تشریح طلب ہو، اور عرشی صاحب نے اس پر حاشیہ نہ لکھا ہو۔

میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ”مکاتیبِ غالب“ سے پہلے کسی اردو متن کا ایسے سائنسی فک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد بھی جہاں تک میرا مطالعہ ہے، ایسا تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا جسے ”مکاتیبِ غالب“ کے مقابلے میں رکھا جاسکے۔

## خطوطِ غالب : مرتبہ ہمیش پر شاو

اگرچہ ”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلیٰ“ کے مختلف ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوتے رہے لیکن غالب کے تمام خطوط کو یکجا کر کے اُن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا خیال پہلی بار مولوی ہمیش پر شا کو آیا۔ انھوں نے ہر ممکن ذریعے سے غالب کے خطوط جمع کیے۔ بڑی محنت اور جستجو سے بعض ایسے اصل خطوط بھی تلاش کیے جو غالب کے خطوط کے مجموعوں میں شامل ہو چکے تھے۔ ان خطوط کی بنیاد پر نئے اڈیشن کا متن قائم کیا گیا۔ وہ خطوط بھی یکجا کیے گئے جو

مجموعوں میں شامل نہیں ہو سکے تھے لیکن مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ کچھ ایسے غیر مطبوعہ خطوط بھی حاصل کیے گئے جو غالب کے مکتوب الیہم کے وارثوں کی ملکیت تھے۔ مولوی صاحب نے ”مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی میں شامل نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام سینتیس خطوط بھی اس اڈیشن میں شامل کیے۔

نمود ہندی کے پہلے اڈیشن اور ”اردوئے معلیٰ“ کے پہلے تین اڈیشنوں اور ”مکاتیب غالب“ اور غالب کے جو اصل خطوط یا ان کے عکس فراہم ہوئے تھے، انہیں بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔

متن کی نظر ثانی اور طباعت کی نگرانی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے کی۔

مولانا عرشی کے ”مکاتیب غالب“ کے بعد غالب کے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ تھا، جس کی ترتیب اور طباعت میں اتنا اہتمام کیا گیا۔ یہ اڈیشن دو جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۴۱ء میں ٹائپ میں شائع ہوئی۔ مولوی صاحب دوسری جلد مرتب کر رہے تھے کہ موت انہیں ہم سے چھین لیا۔ اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے مرحوم کے وارثوں سے دوسری جلد کا مسودہ اور خطوط غالب سے متعلق اکٹھا کیا ہوا تمام مواد خرید لیا۔ افسوس ہے کہ انجمن میں دوسری جلد کا مسودہ گم ہو گیا۔

پہلی جلد میں مرزا آفندہ - جواہر سنگھ جوہر - بدرالدین فقیر - عبدالحمیل جنون - انور الدولہ شفق - سید یوسف مرزا - یوسف علی خاں عزیز - احمد حسین میکش - غلام حسنین قدر بلگرامی - نواب یوسف علی خاں ناظم - حکیم غلام نجف خاں - میر مہدی مجروح - شہاب الدین احمد خاں ثاقب - مرزا حاتم علی قہر - صاحبزادہ زین العابدین - علاء الدین احمد خاں علانی - شیونرائن آرام اور دو ایسے خطوط جن کے مکتوب الیہم کے نام معلوم نہیں ہو سکے، شامل ہیں۔

کسی بھی متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں اہم مرحلہ املا کا ہوتا ہے۔ بعض متنی نقادوں کا خیال ہے کہ متن کی املا وہی ہونا چاہیے، جو مصنف کی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ

قدیم متن کو جدید املا میں لکھا جانا چاہیے۔ طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے، ضروری یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ایک ہی طریقہ برتا جائے۔ ”خطوطِ غالب“ میں ایسا نہیں کیا گیا۔ جس کے دو وجوہ ہیں: ایک تو یہ کہ مولوی ہمیش پرشاد کو غالب کی املا کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں تھیں، اور دوسرے اس سلسلے میں انہوں نے کوئی باقاعدہ اصول نہیں بنایا۔

مولوی ہمیش نے ”خطوطِ غالب“ کے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ انہیں کافی تعداد میں غالب کے اصل خطوط دستیاب ہو گئے ہیں لیکن مقدمے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے غالب کی اردو املا کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی املا پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُن کے پیش نظر بہت کم اصل خطوط تھے اور اُن خطوط میں غالب کی املا کی جو روش ہے، اسے ہی ”خطوطِ غالب“ کے متن کی املا بنالیا گیا ہے، جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ ”خطوطِ غالب“ کے مقدمے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں کہ ”خطوطِ غالب“ کے متن کے قائم کرنے میں اُن تمام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے، جنہیں غالب ملتے تھے اور جو صحیح ہیں؛ البتہ اُن کی طرزِ کتابت کی پیروی میں ”ہات“ ”رت“ اور بعضے اور اردو لفظ اُسی طرح لکھے گئے جس طرح غالب لکھا کرتے تھے۔ ”اردوئے معلّیٰ“ کے پہلے اڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ”یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب نے غالب کی طرزِ کتابت یا املا کو اکثر جگہ برقرار رکھا ہے۔ گو بعضی باتوں میں اُس کی پابندی نہیں بھی کی ہے۔۔۔۔۔ اس لیے خطوطِ غالب“ کا متن سوا اُس قلمی مواد کے جو میرے سامنے تھا، اسی نسخے پر قائم کیا گیا۔“ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال درست نہیں۔ کیوں کہ غالب کے جو اصل خطوط دستیاب ہوئے ہیں، اُن کی اور ”اردوئے معلّیٰ“ طبعِ اول کے متن کی املا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مولوی صاحب نے عام طور سے ”اردوئے معلّیٰ“ طبعِ اول کی املا کو بنیاد بنایا ہے، جو ظاہر ہے غالب کی املا سے بہت مختلف ہے اور غالب کی املا کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جو بیانات دیے ہیں، اُن میں سے بعض درست نہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کہتے ہیں:



”ہاتھ“ کو غالب نے جب لکھا ”ہات“ لکھا۔ یہ درست نہیں، کیوں کہ غالب کے خطوط میں اس لفظ کی املا تین طرح ملتی ہے، ”ہاتھ“، ”ہاتھ“ اور ”ہات“ اور بھی کئی لفظ ہیں جن کی املا غالب نے ایک سے زیادہ طریقے طے کی ہے۔ مثلاً ”روانا۔ روانہ“۔ ”خط۔ خط“۔ ”میرزا مرزا“۔ ”مجہ۔ مجہہ“۔ ”نواب۔ نواب“۔ ”روپیے۔ روپیے“ وغیرہ۔ مولوی ہمیش نے ”ہات“، ”روانا“۔ ”خط“، ”کبھی“ ”میرزا“ اور ”کبھی“ ”مرزا“، ”روپیے“ اور ”نواب“ وغیرہ کی املا کو اپنایا ہے۔ مولوی ہمیش نے ”خطوط غالب“ کا متن تیار کرنے میں کئی طریقے اپنائے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ غالب جن الفاظ کی املا ایک سے زیادہ طریقے سے کرتے تھے، ان میں سے ایک کو قبول کر لیا ہے۔ مثلاً ”روانا“، ”ہات“، ”ہاتی“ وغیرہ اور اس ترجیح کی وجہ نہیں بتائی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے بھی ایک لفظ کی املا دو طرح کی ہے۔ مثلاً ”مرزا“ اور ”میرزا“۔ ”نواب“ اور ”نواب“ وغیرہ۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ غالب کی غلط املا کو اپنا لیا گیا ہے۔ مثلاً غالب تمام فارسی الفاظ ”ز“ سے لکھتے تھے، کیوں کہ ان کو غلط فہمی تھی کہ فارسی میں ”ذ“ نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے بھی تمام فارسی الفاظ غالب کی منشا کے مطابق ”ز“ سے لکھے ہیں۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ اگر غالب نے بعض الفاظ کی املا غلط کی ہے، تو ان کو درست املا میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً غالب ”بالفعل“ اور ”بالکل“ لکھتے تھے۔ ان الفاظ کو مولوی صاحب نے درست املا میں لکھا ہے۔

پانچواں طریقہ انگریزی الفاظ کی املا میں اپنایا گیا ہے۔ عام طور سے غالب انگریزی الفاظ کی املا جدید املا سے مختلف کرتے تھے۔ مثلاً غالب ”گورنمنٹ“، ”سارٹی فکٹ“ اور ”لارڈ“ لکھتے تھے، ان الفاظ کو مولوی صاحب نے ”گورنمنٹ“، ”سارٹی فکٹ“ اور ”لارڈ“ لکھا ہے۔ اس کے برعکس بعض انگریزی الفاظ کی املا وہی کی گئی ہے جو غالب کرتے تھے۔ مثلاً ”پنن“ وغیرہ

مختلف طریقے اپنانے کی وجہ سے "خطوط غالب" کے متن کی ایسا ایسی ہو گئی ہے جو نہ جدید ہے اور نہ غالب کی ہے۔

"عود ہندی" اور "اردوے معلیٰ" میں کسی طرح کی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط بھی یکجا نہیں کیے گئے تھے۔ غالباً پہلی بار "اردوے معلیٰ" کے اس اڈیشن میں ترتیب قائم کی گئی جو مطبع مجیدی کانپور سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس اڈیشن میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط یکجا کیے گئے۔ لیکن ابھی صورت حال یہ تھی کہ ایک مکتوب الیہ کے نام کے بعض خطوط "عود ہندی" میں تھے اور بعض "اردوے معلیٰ" میں۔ اس کے علاوہ اب تک خطوط کی تاریخ وار ترتیب کسی مجموعے میں نہیں تھی۔ مولوی مہیش نے پہلی بار ایک مکتوب الیہ کے نام تمام دستیاب خطوط کو یکجا کر کے انہیں تاریخ وار ترتیب دیا۔

"عود ہندی" میں بہت کم خطوں پر تاریخ تحریر ہے۔ غالباً مرتبین نے تاریخیں شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے برعکس "اردوے معلیٰ" کے کافی خطوط پر تاریخیں ہیں۔ تاریخ تحریر کے لحاظ سے غالب کے خطوط کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ خطوط جن پر مکمل تاریخ تحریر ہے۔ دوسرے خطوط وہ جن پر تاریخ یا مہینا یا دونوں ہیں لیکن سنہ نہیں ہے، اور تیسرے وہ جن پر تاریخ تحریر بالکل نہیں۔ مولوی صاحب نے پہلی بار ان خطوط کی تاریخ تحریر متعین کرنے کی کوشش کی، جن پر تاریخ نہیں تھی بعض خطوں پر تو قوسین میں متعین کی ہوئی تاریخ دے دی ہے۔ جن خطوں کی تاریخ تحریر کا تعین نہیں ہو سکا لیکن زمانہ تحریر کا اندازہ ہو گیا ہے تو ان کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والے کو زمانہ تحریر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک ایسا خط ہے جس پر تاریخ تحریر نہیں ہے اور مولوی صاحب کو اندازہ ہوا ہے کہ یہ اگست ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا تو اس خط کو جولائی ۱۸۶۳ء اور ستمبر ۱۸۶۳ء کے درمیان ترتیب دے دیا ہے۔ کافی خطوط ایسے ہیں جن کی تاریخ تحریر کا تعین مولوی صاحب نے کیا ہے۔ لیکن انہوں نے کسی تاریخ کے بارے میں اپنے دلائل پیش نہیں کیے اور بقول: قاضی عبدالودود:



”متعدد خطوط کے زمانہ کتابت کی نسبت جو اطلاعات دی گئی ہیں وہ غیر صریح اور ناکافی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مولوی صاحب کی متعین کی ہوئی اکثر تاریخیں غلط ہیں۔ چوں کہ مولوی صاحب کے مرتبہ ”خطوط غالب“ کو مستند ترین نسخہ تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ان خطوط کی تاریخ تحریر کی بنیاد پر بعض ایسے نتائج نکالے جو درست نہیں تھے۔ ان ناقدوں کا قصور یہ نہیں تھا کہ انھوں نے بعض بے بنیاد باتیں کہیں، ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے مولوی صاحب کی متعین کی ہوئی تاریخوں پر بھروسہ کیا۔ ان تاریخوں کے بارے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔“

تفصیل کے نام ایک خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ لیکن خط میں غالب نے لکھا ہے: ”آج پنجشنبہ، ۱۲ ستمبر کو ڈاک میں بھجوا دیا۔“ مولوی صاحب کو نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر خیال ہوا کہ یہ خط ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ ۱۸۶۳ء میں پنجشنبہ کے دن ستمبر کی تاریخ تھی ۱۲ نہیں۔ مولوی صاحب تے فقرے کو اس طرح کر دیا: ”آج پنجشنبہ، ۱۰ ستمبر [۱۸۶۳ء] کو ڈاک میں بھجوا دیا۔“ تو سین سے اندازہ ہوتا ہے کہ، تو سین میں اضافہ مولوی صاحب کا ہے۔ باقی تمام الفاظ غالب کے ہیں۔

حال آں کہ مولوی صاحب نے ”۱۲ ستمبر“ کو بدل کر ”۱۰ ستمبر“ کر دیا ہے۔ اور اس تبدیلی کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ خطوط کے اندرونی شواہد اس حق میں ہیں کہ یہ تاریخ ”۱۲ ستمبر“ بالکل درست ہے۔ سب سے تعین میں مولوی صاحب سے غلطی ہوئی یہ سنہ ۱۸۶۳ء ”نہیں“ ۱۸۶۱ء ہے۔ اب دوسری طرح کی مثالیں لیجیے۔ ”اردوئے معلّیٰ“ کے پہلے اڈیشن میں علّائی کے نام ایک خط ہے جس پر تاریخ تحریر ”یکشنبہ ۲ جولائی ۱۸۶۲ء“ ہے۔ تقویم کی رو سے اور خط کی اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر یہ ”۱۸۶۲ء“ ہونا چاہیے۔ مولوی صاحب نے ”۱۸۶۲ء“ کو بدل کر ”۱۸۶۳ء“ کر دیا ہے۔ لیکن اس کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ اس طرح تفصیل کے نام ایک خط پر تاریخ تحریر ”۷ دسمبر ۱۸۵۸ء“ درج تھی، جو غلط تھی۔ مولوی صاحب نے اسے درست



کر کے ”۳۷ دسمبر“ کر دیا ہے۔ لیکن اس تصحیح کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔

متنی تنقید کا ایک اہم ترین اصول یہ ہے کہ آپ متن کی ترتیب کے لیے جو بھی اصول اپنائیں۔ اُن کی پابندی شروع سے آخر تک کریں۔ مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب بھی کسی قرأت کا مسئلہ سامنے آیا، انھوں نے اُس قرأت کی بنیاد پر فیصلہ کر لیا، کسی سوچے سمجھے اصول کی بنیاد پر نہیں۔ مولوی صاحب نے بے شمار قرأتیں بدلی ہیں اور اکثر اس کی اطلاع نہیں دی۔ جس سے یقیناً پڑھنے والے کو یہ تاثر ہوتا ہے کہ غالب کے اصل خط یا پہلے اڈیشن میں یہی قرأت تھی۔ حال آں کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسے مقامات بہت کم ہیں جہاں مولوی صاحب نے قیاسی تصحیح کی نشان دہی کی ہے۔

متن کی ترتیب میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم اس متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کر رہے ہیں جو مصنف کے ذہن میں تھا نہ کہ اُس متن کا جو کاغذ پر منتقل ہوا۔ یعنی اگر مصنف سے عبارت میں کسی لفظ کا اضافہ ہو گیا ہے یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے یا کوئی لفظ مکرر لکھا گیا یا کسی لفظ کی املا غلط لکھی گئی تو ان میں سے کوئی چیز مصنف کی منشا کے مطابق نہیں۔ جو متن مصنف کے ذہن میں تھا اُسے کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے سہو ہوا۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ تحریر کی غلطیوں کو درست کر کے حواشی میں اُن کی نشان دہی ضرور کر دیں۔ مولوی صاحب نے یہاں بھی کسی ایک طریقے کی پابندی نہیں کی۔

مثلاً ”خطوط غالب“ میں پہلی تصحیح کی نشان دہی ص ۷ پر کی گئی ہے۔ غالب کے اپنے قلم سے (اصل خط کا عکس) ”خطوط غالب“ میں شامل ہے، ایک لفظ ”سہرت“ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غالب کا سہو قلم ہے ورنہ یہ لفظ ”سورٹھ“ ہے۔ متن میں غلط قرأت رہنے دی گئی اور حاشیے میں صحیح قرأت دی گئی ہے۔

دوسری تصحیح کی نشان دہی ص ۱۴ پر کی گئی ہے۔ متن میں قرأت ہے: ”وہ لکھتا ہے کہ“

راجا مرا، رانی مری“ اصل قرأت یہ ہونی چاہیے۔ ”وہ لکھتا ہے کہ راجا مرا، رانی نہیں مری“

مولوی صاحب نے متن میں قوسین میں ”نہیں“ کا اضافہ کر دیا۔ اور غلط قرأت حاشیے میں دیکھی۔  
یہ گویا تصحیح کا دوسرا طریقہ اپنایا گیا۔

ایک تصحیح کی نشان دہی ص ۱۵ پر کی ہے متن میں ”انہیں روپیے کئی آنے“ خط کی اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ”انہیں روپیے کئی آنے“ ہونا چاہیے۔  
مولوی صاحب نے متن کو درست کر دیا اور اس کی نشان دہی حاشیے میں کر دی۔ یہاں تصحیح متن کا تیسرا طریقہ اپنایا گیا ہے۔

ان تین مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مولوی صاحب نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ جہاں جو مناسب سمجھا ویسا کر لیا۔

”خطوط غالب“ میں متن کی خاصی غلطیاں ہیں۔ تفتہ کے نام غالب کے ایک اصل خط کا عکس بھی مولوی صاحب نے ”خطوط غالب“ میں شامل کیا ہے۔ مولوی صاحب نے عکس کے ساتھ جو متن شائع کیا ہے، اس میں ایک غلطی ہے۔ اس طرح علائی کے نام بھی ایک خط کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس گیارہ سطر خط کا جو متن شائع کیا ہے اس میں پانچ الفاظ غلط ہیں۔ تمام خطوں میں غلطیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے مگر پھر بھی متن کی غلطیاں ہیں کافی تعداد میں۔

متنی تنقید کا ایک اہم ترین اصول یہ بھی ہے کہ متنی نقاد یہ اطلاع دے کہ اس نے کس نسخے کو بنیادی نسخہ بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے؟ مولوی صاحب نے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ غالب کے کون کون سے اصل خطوط مل گئے تھے جن سے انہوں نے مطبوعہ خطوں کا موازنہ کیا ہے۔ ان اصل خطوط کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

”..... انور الدولہ شفیق کے نام کے گیارہ خط اعظم گڑھ میں کسی صاحب کے پاس ہیں۔ پنڈت رامیش دیال صاحب، ڈپٹی کلکٹر کا احسان مند ہوں ان کی

وساطت سے ان خطوں سے مطبوعہ خطوں کا مقابلہ کیا جاسکا ..... نواب  
صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب  
خاں بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن صوبہ متحدہ، پنڈت  
گوپی ناتھ کنزرو صاحب ایڈوکیٹ الہ آباد، آغا محمد اشرف صاحب دہلوی،  
کرائسٹ کالج، کمبرج، سید فرخ حیدر صاحب رئیس شمس آباد (فتح گڑھ)،  
پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب، منشی اقبال حسین بیگ صاحب اودے پور،  
سید بشیر الدین حیدر صاحب موسوی نے مختلف خطوط یا نقل مقابلے کے لیے عنایت  
فرمائے جن سے کتاب کی ترتیب و تکمیل میں بڑی مدد ملی۔

مولوی صاحب کے ان بیانات نے خاصی دشواری پیدا کر دی ہے۔ انور الدولہ شفیق کے نام غالب  
کے ایکس خطوط ہیں۔ ان میں سے گیارہ خط اصل شکل میں مولوی صاحب کو مل گئے تھے مگر  
ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ گیارہ خط کون سے تھے؟ شفیق کے نام خطوط کے متن میں خاصے اختلافات  
نسخ ہیں۔ اگر مولوی صاحب ان خطوط کی نشان دہی کر دیتے تو ظاہر ہے کہ ان کی قراتوں کو مطبوعہ  
خطوں کی قراتوں پر ترجیح دی جاتی۔ مولوی صاحب نے جن لوگوں سے خطوط یا نقلیں حاصل  
کی ہیں ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ان حضرات کی تعداد کافی ہے لیکن وہ کون سے خطوط ہیں  
جن کی اصل یا نقل ان حضرات سے دستیاب ہوئی تھی، اس کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ اگرچہ  
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ”مقدمہ“ میں لکھا ہے کہ :

”خطوط غالب“ کی دوسری جلد کے آخر میں کچھ ضمیمے اور اشاریے ہوں گے۔ انہی  
میں ایک فہرست خطوں کی ہوگی اور اس میں ہر خط کے متعلق یہ بتایا جائے گا کہ  
وہ کہاں سے لیا گیا ہے؟

یہ ضمیمے اور اشاریے ”خطوط غالب“ کی اس دوسری جلد میں شامل تھے، جس کا مسودہ  
مولوی حبیب کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے خرید لیا تھا اور جو انجمن کے دفتر سے گم ہو گیا۔



میرا خیال ہے کہ مولوی ہمیش نے غالب کے کئی اصل خط اور کئی خطوں کے عکس بھی فراہم کیے تھے جنہیں مرحوم دوسری جلد میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بدیہی ہے کہ ان میں سے بیشتر ضائع ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو (مئد) میں میر مہدی بھٹہ کے نام غالب کا اصل خط کچھ لفظوں پر غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پتے اور خطوط غالب کے کچھ عکس موجود ہیں۔ انجمن کو یہ سب چیزیں مولوی ہمیش کے کاغذات میں سے ملی تھیں۔ تمام کو آہستہ کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مولوی صاحب نے پہلی بار غالب کے خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا تھا۔ انھوں نے خطوں کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں جس محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا، وہ قابلِ قدر ہے۔ اگر مرحوم مثنیٰ تنقید کے اہم اصولوں کی پابندی کرتے اور متن کی درستی کا خاص خیالی کرتے تو یہ کام بہت معیاری ہوتا۔

## نادراتِ غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق

میرن دہلوی نے منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ۳۷ خطوط اور منشی عبداللطیف کے نام ایک خط فراہم کر کے مرتب کیے تھے جنھوں کا یہ مجموعہ مسودے کی شکل میں میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کو ملا۔ انھوں نے یہ تمام خطوط ”نادراتِ غالب“ کے نام سے مرتب کیے۔ ”نادراتِ غالب“ ۱۹۴۹ء میں ادارۃ نادرات، کراچی سے شائع ہوئی۔ آفاق صاحب نے مولانا امتیاز علی خاں عثیٰ کی مرتبہ ”مکاتیبِ غالب“ کو اپنا نمونہ بنایا۔ شاید اسی لیے یہ کام خاصا اچھا ہوا۔ ۱۳۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مختلف عنوانات کے تحت منشی نبی بخش حقیر اور غالب کے حالات اور غالب کی تصنیفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالباً پہلی بار غالب کے ۹۲ شاگردوں کے مختصر حوالہ بیان کیے گئے ہیں۔ آخر میں متن کے حوالشی درج ہیں۔ کتاب کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

## خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر

غلام رسول مہر نے غالب کے تمام خطوط یکجا کر کے "خطوطِ غالب" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں کتاب منزل لاہور سے شائع کرائے۔ اس مجموعے میں "مکاتیبِ غالب" اور "نادراتِ غالب" کے خطوط شامل نہیں کیے گئے۔ غالب کے خطوط کا ایسا مجموعہ جس میں تقریباً سب خطوط شامل کر لیے گئے ہوں پہلی بار شائع ہوا۔

"خطوطِ غالب" کے اب تک کم سے کم تین ہی پرنٹ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا ایک می پرنٹ جو غالباً تیسرا ہے، نسخہ ماتپ میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے بھی شائع ہوا۔ طباعت کے اعتبار سے یہی پرنٹ بہت صاف ستھرا اور خوبصورت چھپا ہے۔

مہر صاحب نے اس مجموعے میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حالات بھی ہیں لیکن مأخذ کے حوالے کہیں نہیں دیے گئے خطوط میں بہت سے ایسے واقعات کا ذکر ہے جنہیں عام قاری نہیں سمجھ سکتا تھا، مہر صاحب نے حاشیے میں ایسے بہت سے واقعات کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

جن لوگوں نے مولانا مہر کی دوسری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے، وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مولانا ایک جتید عالم تھے لیکن نہ جانے کیوں غالب کے خطوط کی ترتیب میں انہوں نے بہت لاپرواہی بلکہ غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ مولانا نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے خطوطِ غالب کے عام نسخے لے کر کاتب کو دے دیے اور کتابت پڑھنے کا کام دوسروں سے لیا۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک غالب کے خطوط کا کوئی مجموعہ اتنا غلط نہیں چھپا، جتنا کہ خطوطِ غالب ہے۔ متن کی حالت یہ ہے کہ کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے، جس میں متن کی آٹھ دس سے کم غلطیاں ہوں۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ نواب حسین مرزا کے نام غالب کے چار خط "اردوئے معلیٰ" میں شامل تھے۔

دو مزید خطوں کے عکس بعد میں شائع ہوئے۔ مولانا نے چھٹوں خط اپنے مجموعے میں شامل کر لیے جن خطوط کے عکس اُن کے پیش نظر تھے، اُن میں سے ایک کے متن میں تیس اور دوسرے کے متن میں نو غلطیاں ہیں۔ اس لیے اس مجموعے پر مزید تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔

## غالب کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ اس نوعیت سے دوسرے مجموعوں سے مختلف ہے کہ اس میں صرف وہ خطوط شامل کیے گئے ہیں جو ”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلیٰ“ میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور بعد میں مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

یہ مجموعہ ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں مختلف لوگوں کے نام غالب کے ۴۹ خطوط اور ۱۹ مختلف تحریریں ہیں۔

اس مجموعے میں متنی تنقید کے کسی بنیادی اصول کی پابندی نہیں کی گئی، متن کی ترتیب میں بہت لاپرواہی سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متن میں بے شمار غلطیاں راہِ پاگسین اور ایک اچھا کام نا تجربہ کاری کی نذر ہو گیا۔

## خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد بظرفِ ثانی مالک رام

مہیش پرشاد کے انتقال کے بعد اُن کے مسودات اور ادبی کاغذات انجمن ترقی اردو (ہند) نے خرید لیے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مشورے سے انجمن نے خطوطِ غالب کا دوسرا ادیشن تیار کرنے کا کام مالک رام صاحب کو سونپا۔ یہ کام دو جلدوں میں ہونا تھا۔ پہلی جلد تو وہی جو چھپ چکی تھی اور دوسری جلد کا مسودہ انجمن نے حاصل کر لیا تھا۔ بد نصیبی سے دوسری جلد کا مسودہ انجمن سے گم ہو گیا۔

”خطوطِ غالب“ کا دوسرا ادیشن انجمن ترقی اردو سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس وقت



مالک رام صاحب ہندوستان سے باہر تھے، انجمن کی غلطی سے اس کتاب پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام صاحب کا نام چھپ گیا۔

مالک رام صاحب نے دوسرے اڈیشن میں منشی نبی بخش حقیر اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام کے خطوط کا اضافہ کیا ہے۔

مالک رام صاحب نے مولوی ہمیش پرشاد کی متعین کی ہوئی بعض تاریخوں سے اختلاف کیا ہے اور کچھ ایسے خطوں کی تاریخ تحریر کا تعین کیا ہے جن پر تاریخ نہیں تھی۔

## عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل

۱۹۶۹ء میں ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں غالب کا جشن منایا گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ غالب پر خاصی تعداد میں کتابیں اور مضامین شائع ہوئے۔ اکثر رسالوں نے غالب نمبر مرتب کیے۔ اس طرح غالب کے سوانح، شخصیت و سیرت اور غالب کے معاصروں، شاگردوں، دوستوں اور رشتہ داروں پر کافی مواد سامنے آ گیا۔ لیکن اس جشن کا ایک نقصان بھی ہوا، اور وہ یہ کہ جشن سے کچھ عرصے پہلے ہی غالب پر کتابیں لکھنے یا غالب کی کتابیں مرتب کرنے کے پروگرام بنائے گئے۔ چوں کہ وقت کم تھا اور ہر حال میں ایک محدود مدت میں کام پورا کرنا تھا، اس لیے جشن غالب کے موقع پر چھپنے والی بعض کتابوں کا معیار غیر اطمینان بخش اور بعض کا بہت پست رہا۔ فاضل صاحب کی مرتب کی ہوئی ”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلیٰ“ کا شمار بھی انہیں کتابوں میں ہے۔ اگرچہ ان کی مرتبہ ”عودِ ہندی“ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ فاضل صاحب کے ان دونوں کتابوں کے بغور مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عجلت کی وجہ سے انہوں نے (۱) پہلے سے اپنے کام کا خاکہ نہیں بنایا (۲) تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کے لیے باقاعدہ اصول نہیں بنائے۔ (۳) متن کی املا پہلے سے طے نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی لفظ کی املا دو دو طرح ملتی ہے (۴) متن کی ترتیب میں خاصی

غیر ذمہ داری سے کام لیا اور (۵) اشاریے دوسرے لوگوں سے بنوائے۔

پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ فاضل صاحب نے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" ان دونوں مجموعوں کو الگ الگ کیوں مرتب کیا خطوط کے یہ مجموعے ایک صدی قبل یعنی اُس زمانے میں ترتیب دیے گئے تھے جب ترتیبِ متن کا اردو میں کوئی شعور نہیں تھا۔ ان مجموعوں میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط یکجا نہیں کیے گئے، بلکہ پورے مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر ان مجموعوں میں خطوط، تاریخ وار مرتب نہیں کیے گئے۔ "اردوئے معلّٰی" کے پہلے اڈیشن میں سب سے پہلے میر غلام بابا خاں بہادر کے نام کے خطوط ترتیب دیے گئے ہیں اور یہ ترتیب اس طرح ہے کہ پہلا خط ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء کا، دوسرا ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کا تیسرا ۳ اپریل ۱۸۶۴ء کا چوتھا ۶ اپریل ۱۸۶۳ء کا اور پانچواں ۹ اگست ۱۸۶۶ء کا ہے۔ باقی تمام خطوط کی ترتیب اسی طرح ہے۔ ظاہر ہے کہ ترتیب کا یہ طریقہ بہت غلط ہے۔ ہم "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" کے پہلے اڈیشنوں کے مرتبین کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے لیکن موجودہ زمانے میں اور خاص طور سے عرشی صاحب کے "مکاتیبِ غالب" کی اشاعت کے بعد اگر کوئی متنی نقاد اسی ترتیب کو قائم رکھے تو اُسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ غرض یہ ہے کہ "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" کو الگ الگ شائع کرنے اور ان کی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہ کرنے کا مالی منفعت کے علاوہ اور کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

دونوں مجموعوں کو الگ الگ مرتب کرنے سے جو خامیاں پیدا ہوئیں اُس کی پہلی مثال یہ ہے کہ شاہ عالم کے نام کا خط "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" دونوں مجموعوں میں شامل ہے۔ میں نے فاضل صاحب کے مرتبہ "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" میں اس خط کے متن کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں مجموعوں کے متن میں صرف ایک قرأت کو "اردوئے معلّٰی" کے متن کے حوالے سے درست کیا گیا۔ باقی قرأتوں کے اختلاف کی کسی مجموعے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

دونوں مجموعوں میں اس خط کے متن میں سترہ متنی اختلافات ہیں۔ اور دونوں مجموعوں میں

اس خط کی علاماتِ اوقات میں بھی کافی فرق ہے "عودِ ہندی" کے متن میں چار وصفا حتی حاشیے دیے گئے۔ اسی طرح بغل گیر ہونا، تموز، مقتضی جیسے لفظوں کے معنی "عودِ ہندی" کے حاشیوں میں دیے گئے ہیں "اردوئے معلّٰی" میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

"اردوئے معلّٰی" کے متن کے بارے میں حاشیے میں بتایا گیا ہے کہ "اردوئے معلّٰی" کے پہلے ایڈیشن میں یہ خط کس صفحے پر ہے اور یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ مختلف مطبوعہ مجموعوں میں یہ خط کس کس صفحے پر ہے، "عودِ ہندی" کے حاشیے میں اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں۔ میں نے یہاں صرف شاہ عالم کے نام غالب کے خط کا جائزہ لیا ہے، ورنہ تمام خطوط کا کم و بیش یہی حال ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں شاہ عالم کے نام کے کس متن پر تبصرہ کروں؟ اس متن پر جو فاضل صاحب نے "عودِ ہندی" میں مرتب کیا ہے، یا اس متن پر جسے "اردوئے معلّٰی" میں ترتیب دیا ہے۔ متن کے اختلافات کی وجہ عجلت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی خط کے متن کو دو جگہ مرتب کیا گیا ہے۔ اور دونوں جگہ غیر ذمے داری سے کام لیا گیا ہے۔

فاضل صاحب کے مرتبہ مجموعوں میں متن کی غلطیاں ہیں، لیکن مولانا غلام رسول تہر کے مرتبہ "خطوطِ غالب" کے مقابلے میں خاصی کم۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن کی ہر سطر میں متن کی غلطی ہے۔ مثلاً مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء کے نام کے خط کا عکس، ڈاکٹر مختار الدین نے علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۳۹ء میں شائع کیا تھا۔ فاضل صاحب نے یہ خط "اردوئے معلّٰی" کی جلد دوم کے حصہ سوم میں شامل کیا ہے۔ میں نے ایک ضرورت سے خط کے عکس کا فاضل صاحب کے مرتبہ متن سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ فاضل صاحب کے متن میں پندرہ غلطیاں ہیں۔ ایک خط کے متن میں پندرہ غلطیاں پوری کتاب کو ناقابلِ اعتبار بنانے کے لیے کافی ہیں۔

فاضل صاحب نے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" دونوں میں مختلف طریقے اختیار



کیے ہیں۔ مثلاً ”عودِ ہندی“ میں حاشیے میں یہ نہیں بتایا کہ متعلقہ خط ”عودِ ہندی“ کے کس کس اڈیشن کے کس صفحے پر ہے۔ جب کہ ”اردوئے معلّٰی“ میں ہر خط کے بارے میں یہ اطلاع دی گئی ہے۔ ”عودِ ہندی“ کے حاشیوں میں احیاء، پایاں، رحیل، متوسط، منشوش، توام اور زمرہ جیسے آسان لفظوں کے معنی دیے گئے ہیں۔ ”اردوئے معلّٰی“ میں بہت ہی کم الفاظ کے معنی دینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ ”عودِ ہندی“ کے ان حاشیوں کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے وجہ ضخامت بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غالب کے اکثر خطوط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ فاضل صاحب نے کوشش کی ہے کہ ہر خط پر تاریخ تحریر ضرور دیں۔ اپنی اس کوشش میں خطوں میں تاریخ یا سنہ لکھ کر اس طرح کے بیانات دینے پڑے ہیں۔ ”میرے خیال میں ۱۸۵۸ء کے وسط یا بعد کا ہے۔“ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس خیال کی بنیاد کن دلائل پر ہے۔ ایک خط پر تاریخ تحریر دی ہے ”اکتوبر ۱۸۵۸ء اور اس کے بارے میں لکھا ہے ”تقریباً وسط اکتوبر یا اس سے پہلے“ اس خیال کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی اور یہ بھی نہیں بتایا کہ سنہ کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ذکا کے نام ایک خط پر ”اردوئے معلّٰی“ میں تاریخ تحریر صرف ”۲۷ فروری“ ہے۔ فاضل صاحب نے اسے ۱۸۶۷ء کا بتایا ہے اور اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ ”اردوئے معلّٰی“ میں تاریخ موجود نہیں ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ ۱۸۶۷ء کہاں سے آیا۔ کیول رام ہشیار کے نام کے خط کو سنہ ۱۸۶۷ء کا بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ ”صرف ایک تخمینہ ہے۔“ منشی ہیر سنگھ کے نام کا خط فاضل صاحب ۱۸۶۷ء کا بتاتے ہیں اور اس کے بارے میں حاشیے میں لکھتے ہیں ”پہلے حصے میں ایک خط ہے جو ۱۳ جنوری ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا ہے“ غالباً یہ اس کے کچھ ماہ بعد کا خط ہے۔“

جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں کہ اس طرح کی تاریخیں دینے سے ہمارے نقاد اور غالب پر کام کرنے والے محقق گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخ تحریر پر بھروسہ کر کے بعض اہم نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور حاشیہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ جب تک ہمارے پاس معقول دلائل

نہ ہوں تاریخِ تحریر ہرگز نہیں دینی چاہیے۔

ممکن نہیں ہے کہ فاضل صاحب کو یہ اندازہ نہ ہو گیا ہو کہ غلام رسول تہر کا مرتب کیا ہوا متن ملط ترین ہے، پھر بھی اکثر مہر کے متن کی قراءتیں اختلافاتِ نسخ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ان قراءتوں کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا ہے، یہ نہیں بتایا گیا کیوں کہ اگر مہر کے متن کے تمام اختلافاتِ نسخ پیش کیے جاتے تو یقیناً ایک صفحے کی تین چار سطروں میں فاضل صاحب کا مرتبہ متن ہوتا اور باقی صفحے پر مہر صاحب کے متن کے اختلافاتِ نسخ۔

فاضل صاحب نے غالب کے تمام خطوں کے اشاریے مرتب کر کے غالب پر کام کرنے والوں کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ کام ایسے لوگوں سے کرایا جو غالب کے دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں سے قطعی واقف نہیں ہیں اور جن کا مبلغِ علم بھی بہت کم معلوم ہوتا ہے۔

اکثر ایک ہی نام کے مختلف لوگوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

محمد علی خاں۔ ۴۵۵ - ۵۰۰ - ۷۹۶ - ۸۸۹

ص ۵۰۰ پر جن محمد علی خاں کا ذکر ہے وہ مرزا حاتم علی تہر کے دوست ہیں۔

ص ۴۵۵ کے محمد علی خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ کے لڑکے ہیں۔

ص ۷۹۶ کے محمد علی خاں دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اور

ص ۸۸۹ کے محمد علی خاں کو مثال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ تفتہ کے نام

اس خط میں غالب نے یہ بتایا ہے کہ نام کے ساتھ خطابات کس طرح لکھے جاتے ہیں اور

محمد علی خاں کو مثال کے طور پر لیا ہے۔ اس لیے یہ نام اشاریے میں نہیں آسکتا۔ جانی بہاری لال زندہ

کو اشاریہ میں چار ناموں سے الگ الگ فہرست کیا گیا ہے۔ بابو صاحب، جانی بانکے لال زندہ،

جانی جی، اور زندہ، جانی بانکے لال یہ کام وہی کر سکتا ہے جس نے خطوطِ غالب کا مطالعہ

نہ کیا ہو۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فاضل صاحب نے یہ کام کسی اور سے کرایا ہے۔

اشارے میں اس طرح کی غلطیاں اتنی کثرت سے ہیں کہ پورا اشاریہ گمراہ کن ہو گیا ہے۔  
 ”عودِ ہندی“ کے دیباچے میں فاضل صاحب نے خود اپنے کام کی داد دیتے ہوئے  
 لکھا ہے :

”مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ”عودِ ہندی“ کے اس نسخے سے پہلے کوئی ادیشن  
 اس اہتمام سے مرتب و شائع نہیں ہوا۔ حال اُن کہ اس کی افادیت کے پیش نظر  
 اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے۔“

پورے بیان سے تو نہیں، البتہ اس کے آخری فقرے سے متفق ہوں، اس لیے میں اس  
 فقرے کو دہرانا چاہتا ہوں :

”اس کی افادیت کے پیش نظر اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے۔“

---



# غالب کی اردو املا کی خصوصیات

دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کے تمام الفاظ ٹھیک اسی طرح لکھے جاتے ہوں جس طرح اُن کا تلفظ ادا کیا جاتا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کسی بھی زبان کا رسم الخط اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اس زبان کے صوتی نظام کو پوری طرح تحریری روپ دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زندہ زبان میں ہر سطح پر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ تلفظ اور املا کے مقابلے میں تلفظ کی تبدیلی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے، اس لیے اکثر الفاظ کے تلفظ اور املا میں مطابقت نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات جب کسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ صرف بولی جانے والی زبان کو اپنی بنیاد بناتے ہیں، اُس کے تحریری روپ کو نہیں۔

تلفظ اور املا کے اس طرح کے اختلافات کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں مختلف لوگ ایک لفظ کا تلفظ مختلف طریقے سے کرتے ہیں لیکن لکھتے ایک ہی طرح ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو مختلف لوگ مختلف طریقے سے لکھتے ہیں لیکن اُن کا تلفظ ایک ہی کرتے ہیں۔

اردو دنیا کی اُن زبانوں میں سے ایک ہے جن میں املا اور تلفظ میں عدم مطابقت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کے کئی لسانی اور تاریخی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ اردو کے

صوتی نظام اور رسم الخط کا ارتقا ایک ساتھ نہیں ہوا۔ کھڑی بولی نے مکمل زبان بننے کے بعد فارسی رسم الخط کو اپنایا۔ اس لیے اردو کا صوتی نظام اور رسم الخط ایک دوسرے سے مکمل طور سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں، لیکن دونوں کا صوتی نظام خاصا مختلف ہے۔ فارسی کی مخصوص آوازوں کو اردو میں لکھنا مشکل نہیں تھا کیوں کہ اردو نے فارسی رسم الخط کو اپنایا تھا لیکن اردو کی کچھ مخصوص آوازیں ایسی ہیں، جو فارسی میں نہیں ہیں، وہ ہیں ہا کار اور معکوس آوازیں۔

جن لوگوں کو پہلی بار اردو کو تحریری روپ دینے کی ضرورت پڑی وہ عام طور سے صرف فارسی رسم الخط سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے اردو کے لیے فارسی رسم الخط کو اپنایا۔ کیوں کہ ان کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اردو کی ہا کار اور معکوس آوازوں کو فارسی رسم الخط میں تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ ان آوازوں کے لیے ایسی تحریری علامتیں ایجاد کی گئیں جو صدیوں تک ارتقا کی منزلوں سے گزرتی رہیں۔

تقریباً سولہویں صدی سے اردو میں نظم و نشر کی صورت میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن ابتدائی تین صدی تک اردو املا کے ارتقا کی رفتار بہت سُست رہی۔ انیسویں صدی کے شروع کے ساٹھ ستر برسوں میں یعنی عہدِ غالب میں اردو املا کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔ اور اردو املا میں سب سے زیادہ تبدیلیاں اسی عہد میں رونما ہوئیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہندوستان میں پریس قائم ہونے کی وجہ سے اردو کتابوں کی طباعت کی رفتار خاصی تیز ہو گئی۔ فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی مطبوعات نے اس رفتار کو اور بھی تیز کر دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی حکومت کی انتظامیہ اور تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اردو کو ہمارے تعلیمی نظام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی، اس لیے اردو پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ اب اردو محض شعروشاعری کی نہیں بلکہ روزمرہ کے

استعمال کی زبان بن گئی۔ زبان کا چلن بڑھنے کی وجہ سے اس کی املا پر بھی زیادہ غور کیا گیا۔ انتظامی امور کے سلسلے میں جب انگریزوں نے اردو کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو اردو املا کی معیار بندی کی ضرورت کو پہلے سے زیادہ محسوس کیا گیا ہوگا۔

غالب کے آخری زمانے میں اردو املا میں بعض اہم بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ مثلاً معکوسی اور ہلکار آوازوں کی علامتوں میں باقاعدگی پیدا کی گئی جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ اسی زمانے میں یاسے مجھول اور یاسے معروف میں باقاعدہ تفریق قائم کی گئی۔

غالب ہی کے زمانے میں امیر مینائی نے اپنی کتابوں میں املا کا ایسا اہتمام کیا کہ ان کتابوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو املا کی معیار بندی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا احسن مارہروی نے املا کے مسائل پر غالباً پہلی بار باقاعدہ مضامین لکھے۔

اردو املا کی معیار بندی کے سلسلے میں پہلی منظم کوشش، انجن ترقی اردو (ہند) نے کی۔ انجن نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی سربراہی میں ایک املا کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے بہت سی سفارشات پیش کیں۔ جن میں سے کچھ چلن میں آگئیں اور کچھ اہل اردو کے لیے قابل قبول نہ ہوئیں۔ چند سال پہلے ترقی اردو بورڈ نے ایک املا کمیٹی بنائی۔ ڈاکٹر عابد حسین اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی سفارشات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کر کے شائع کیں۔ پچھلے پچاس برسوں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد قاضی عبدالودود، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اردو املا پر خاصی تعداد میں مضامین لکھے۔

پاکستان میں ڈاکٹر فرسٹان فتحپوری نے ”اردو املا اور رسم الخط“ کے نام سے اردو املا پر اور ہندوستان میں رشید حسن خاں نے ”اردو املا“ کے نام سے کتابیں لکھیں۔

غالب کی اردو تحریروں میں پرانی املا بھی ملتی ہے اور وہ تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں



جو اُس عہد کی املا میں ہو رہی تھیں۔

غالب نے اپنے بعض شاگردوں کے نام خطوط میں املا کے بارے میں ہدایتیں دی ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی کوشش تھی کہ اُن کے شاگرد صحیح املا لکھیں۔ وہ منشی بہاری لال مشتاق کو لکھتے ہیں :

”چوں کہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت

کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے۔ بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمہاری عبارت میں

بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جا بہ جا آگاہ کرتا رہتا ہوں۔“ ۱ جون ۱۸۶۸ء

غالب کے خطوط میں اردو املا کے بارے میں ہدایتیں پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب اردو املا پر بہت توجہ دیتے تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب اس سلسلے میں خاصے غیر محتاط تھے۔

غالب کی املا پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں املا کا یہ بنیادی اصول بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ایک لفظ کی املا مخصوص طریقے سے رائج ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف لکھے تو وہ غلط املا ہے۔ مثلاً ”کرسی“ کو ”کرسی“ لکھا جائے اور ”سرور و نشاط“ کو ”سرور و نشات“، تو یہ غلط املا ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایک لفظ کی املا ایک طرح اور کچھ لوگ دوسری طرح کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ ”کئے“۔ ”دیئے“۔ ”جئے“ لکھتے ہیں اور کچھ لوگ ”کیئے“۔ ”دیئے“۔ ”جیئے“، تو ہم ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں کہنا چاہیے کہ املا میں مختلف ہیں۔

پرتھوی چند مرحوم نے ”مرقع غالب“ میں غالب کے ایک سو تین اصل خطوط کے عکس شائع کیے ہیں اس کے علاوہ خاصی تعداد میں غالب کے اصل خطوط کے عکس مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ تمام عکس اس مجموعے میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ غالب کی املا کا مطالعہ ان تمام عکسوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔۔

## یائے مجہول اور یائے معروف

اردو کی قدیم املا میں یائے مجہول اور یائے معروف میں اس طرح فرق نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ جدید املا میں کیا جاتا ہے۔ دراصل لکھنے والا اس معاملے میں لفظ کی املا سے زیادہ فنِ خوش خطی کا خیال رکھتا تھا۔ اسی لیے یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کی جگہ یائے مجہول لکھنا عام تھا۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اکثر اوقات اردو کے قدیم متنوں میں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ مصنف بعض الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتا تھا اور کبھی کبھی ہمیں اس کا بھی علم نہیں ہو پاتا کہ مصنف کسی مخصوص لفظ کو مذکر لکھتا ہے یا مونث۔

غالب کے ہاتھ کی جتنی تحریریں ملی ہیں، ان میں یائے مجہول اور یائے معروف میں بالکل فرق نہیں کیا گیا۔ غالب کے زمانے میں ان دونوں میں تفریق شروع ہو چکی تھی لیکن کچھ لوگ اس کی پابندی کرتے تھے اور کچھ لوگ نہیں۔ ”عودِ ہندی“ اور ”اردوئے معلیٰ“ کے پہلے ایڈیشن تقریباً ایک ہی زمانے میں شائع ہوئے ہیں ”عودِ ہندی“ میں یائے مجہول اور یائے معروف میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جب کہ ”اردوئے معلیٰ“ میں اس فرق کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

## الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان

قدیم املا میں الفاظ کو ملا کر لکھنے کا عام رجحان تھا۔ جب کہ جدید املا میں کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کو الگ الگ لکھا جائے۔ غالب املا کی قدیم روش سے متاثر ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں :  
نواب صاحب بیگم صاحبہ فصلربیع ہندویکا نکروں نگلیا۔ جوا بمیں غزلونکو وغیرہ  
قدیم املا میں ”اُن نے“ اور ”اُس سے“ بھی ملا کر ”اُنے“ اور ”اُسے“ لکھتے تھے۔

غالب نے ان الفاظ کو الگ الگ لکھا ہے۔

## اعراب بالحرّوف

ترکی رسم الخط میں اعراب بالحرّوف کا قاعدہ ہے۔ یعنی اگر لفظ کے پہلے صوتی کن میں ضمہ ہے تو اُسے واؤ سے بدل دیا جاتا ہے۔ قدیم اردو املا میں بھی یہی طریقہ رائج تھا جو ممکن ہے ترکی رسم الخط سے لیا گیا ہو۔ غالب کے زمانے میں واؤ کے بدلے فارسی پیش کا استعمال کر کے "اوس" اور "اون" وغیرہ کو "اُس" اور "اُن" لکھا جانے لگا تھا۔ غالب نے اُس نئے طریقے کو نہیں اپنایا۔ اُن کے ہاں اعراب بالحرّوف کی شکلیں ملتی ہیں۔

اوس - اون - اونھوں - اوترنا - اوٹھنا - پونہنا ( غالب نے اکثر پونہنا لکھا ہے لیکن ایک دو دفعہ پونہنا بھی لکھا ہے ) اودھر - اوتنا - اوتنی وغیرہ

## پیش کا استعمال

غالب واؤ معروف، واؤ مجہول، پیش معروف اور پیش مجہول پر التزاماً فارسی پیش لگاتے ہیں۔ مثلاً  
تُم - طُرفہ - دُو - مُسر - کھُل - تُو - جُرُم - چُکا - رُہو اور جُو وغیرہ

## ہا کار آوازوں کی لکھاوٹ

اردو کی ہا کار آوازیں خالص ہند آریاتی ہیں اور تعداد میں گیارہ ہیں۔ یہ آوازیں ہیں:  
پھ - تھ - ٹھ - چھ - کھ - بھ - دھ - ڈھ - جھ - گھ اور ژھ

فارسی میں ہا کار آوازیں نہیں ہیں۔ اس لیے جب ان آوازوں والے الفاظ کو فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تو خاصی دقت ہوئی۔ ابتدا میں ہا کار آوازوں کے تحریری اظہار



کے لیے ہائے ملفوظ کا استعمال کیا گیا۔ غالب کے عہد ہی میں ان آوازوں کے لیے ہائے مخلوط یعنی ”دو چشمی ط“ ایجاد کی گئی۔ غالب کے ہاں ”دو چشمی ط“ کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ ان کی املا میں ہاکار آوازوں کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔

اگر ہائے مخلوط لفظ کے شروع میں آئے تو غالب اس طرح املا کرتے ہیں :

بھوکا (بھوکا) بہاری (بہاری) کہاں (کھانا) گھر (گھر) تھوڑا (تھوڑا)

اگر ہائے مخلوط لفظ کے درمیان میں ہو :

رکھی (رکھی) اکھاڑ (اکھاڑ) بوڑھا (بوڑھا) پڑھا (پڑھا) آنکھیں (آنکھیں)

ہاتی (ہاتی) آخری لفظ میں ہاکار آواز کو بندشی آواز ”ت“ سے بدل دیا ہے۔

اگر ہاکار آواز لفظ کے آخر میں آئے تو اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں :

اودھ (اودھ) پڑھ (پڑھ) باندھ (باندھ) بڑھ (بڑھ) چڑھ (چڑھ)

کبھی ہائے ملفوظ اور ہائے مخفی دونوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

دیکھ (دیکھ) ہاتھ (ہاتھ) مجھ (مجھ) ساتھ (ساتھ) سمجھ (سمجھ) جگہ

(جگہ) کہہ (کہہ)

بعض لفظوں کی املا اس طرح بھی کی ہے کہ لفظ کے آخر میں آنے والی ہائے مخلوط

کو سادہ بندشی آوازوں سے بدل کر اس میں ہائے مخفی کا اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً

مجھ (مجھ) تجھ (تجھ) سمجھ (سمجھ)

اور کبھی لفظ کے آخر میں آنے والی ہائے مخلوط کو صرف سادہ بندشی آوازوں

سے بدل دیتے ہیں مثلاً

ہاٹ (ہاٹ) میرٹ (میرٹ) رٹ (رٹ)

## لفظ کے آخر میں الف یا ہاءے مختفی

فارسی میں ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے، جن کے آخر میں تلفظ الف (ه) کا ہے، لیکن انہیں ہاءے مختفی سے لکھتے ہیں۔ ممکن ہے ایران میں ہاءے مختفی اور الف کے تلفظ میں فرق رہا ہو لیکن ہندوستان میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اس لیے اردو میں فارسی کے کچھ ایسے الفاظ جن کے آخر میں اصلاً ہاءے مختفی یا ہاءے ملفوظ تھے، الف سے لکھے جانے لگے اور بعض اردو الفاظ جنہیں الف سے لکھنا چاہیے تھا، ہاءے مختفی سے لکھے جانے لگے۔ اگر ہر اردو لکھنے والا اس طریقے کو اپنالیتا تو پھر یہی املا رائج ہو جاتی۔ ہوا یہ کہ کچھ لوگ تو ہاءے مختفی پر ختم ہونے والے فارسی الفاظ کو ہاءے مختفی سے لکھتے رہے اور کچھ نے الف سے لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح کچھ لوگوں نے بعض اردو الفاظ کو فارسی رسم الخط کے انداز پر ہاءے مختفی سے لکھنا شروع کر دیا۔

غالب کے ہاں ایسے الفاظ کی املا کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ غالب اردو کے بعض الفاظ کو الف ہی سے لکھتے ہیں مثلاً :

پتا۔ مہینا۔ بھروسا۔ کمر

لیکن بعض اردو الفاظ کو ہاءے مختفی یا ہاءے ملفوظ سے لکھتے ہیں مثلاً :

لالہ۔ پودینہ۔ راجہ۔ کلکتہ۔ پرچہ۔ تھانہ۔ چوترہ اور کیوڑہ

بعض فارسی الفاظ کو فارسی رسم الخط میں ان کی املا کے برخلاف غالب الف سے لکھتے ہیں مثلاً :

چھاپے خانہ۔ خاکا۔ نقشا وغیرہ۔

ہائے مخفی یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں

اردو میں ہائے مخفی اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ کا تلفظ فارسی اور عربی کے اس طرح کے الفاظ سے مختلف ہے۔ فارسی میں قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کسی بھی زبان کا ہو، جب وہ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں ہو تو لفظ کے آخر کا الف یا ہائے مخفی یا بے مہول سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ”قصیدہ“ واحد کی صورت میں آئے تو یوں لکھا جائے گا: ”میں نے قصیدہ لکھا“ لیکن اگر جمع کی صورت میں آئے تو اس کا تلفظ اور املا دونوں بدل جاتے ہیں اور اس طرح لکھا جاتا ہے ”میں نے قصیدے لکھے“ اسی طرح واحد محرف حالت میں ”کلکتہ“ کو ”کلکتے“ لکھیں گے۔ مثلاً ”میں کلکتے گیا“ غالب کی تحریروں میں ان الفاظ کی املا ان طریقوں سے ملتی ہے۔

۱۔ واحد محرف کی حالت میں ہائے مخفی پر ختم ہونے والے الفاظ

جمع کے دن

اس رقعہ کو

ابر رحمت کے شکریہ میں

میرے شاہدہ میں

غالب نے اس حالت میں انبالے، کلکتے اور ”قصیدے“ بھی لکھا ہے، مگر بہت کم۔

۲۔ واحد محرف کی حالت میں ”الف“ پر ختم ہونے والے الفاظ غالب نے ہمیشہ

بائے مہول سے لکھے ہیں۔ مثلاً

کتاب پر دھبے آگئے۔

اب بڑھاپے میں کیا کروں۔

چھبے پر بیٹھا تھا



گزارے کو کچھ تو چاہیے۔

۳۔ جمع قائم کی حالت میں ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ پر ختم ہونے والے الفاظ میں نے صفحے گئے۔

میں نے تصدیق بھیجی۔

سو روپیے وصول پائے

(غالب نے اس حالت میں اکثر ”روپیہ“ اور کم تر ”روپیے“ لکھا ہے۔)

اس کے کئی قاعدے ہیں۔

۴۔ جمع قائم کی حالت میں الف پر ختم ہونے والے الفاظ

چار مہینے ہوئے۔

تم نے کئی پتے لکھے۔

چھاپے کی کتاب۔

اکیلے کیسے جاؤں۔

اس تجربے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ یا

الف ہوتا ہے، جمع قائم کی حالت میں غالباً انہیں ہائے مجہول سے لکھتے ہیں اور الف پر

ختم ہونے والے الفاظ جب واحد محرف کی حالت میں آتے ہیں تب بھی غالباً انہیں

ہائے مجہول سے لکھتے ہیں۔

لیکن ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ جب واحد محرف کی حالت میں ہوں تو غالباً

عام طور سے ”ہ“ سے لکھتے ہیں

## نون غنہ اور نون ساکن

غالب کے زمانے تک عام رواج تھا کہ جن الفاظ کے آخر میں ”ن“ آتا ہو، چاہے وہ

نون غنہ ہو چاہے نون ساکن، دونوں صورتوں میں نون غنہ سے لکھتے تھے۔ غالب نے بھی ایسے تمام الفاظ نون غنہ سے لکھے ہیں۔ مثلاً

ہون - مین - ومان - آون - نہیں - شادیاں - نگران - کرین - لوگون -  
فرمائیں - اٹھائیں وغیرہ

## بعض حروف کو ملا کر لکھنے کا رجحان

غالب ایک ہی لفظ کے بعض ایسے حروف کو ملا کر لکھتے تھے، جنہیں جدید املا میں لازمی طور پر الگ الگ لکھا جاتا ہے مثلاً :

حو (دو) "د" اور "و" ملا کر  
بہار (بہادر) "ا" اور "د" ملا کر  
موجہ "و" اور "د" ملا کر  
زیادہ (زیادہ) "ا" "د" اور "ہ" ملا کر  
حال (حال) "ا" اور "ل" ملا کر  
"ذ" اور "ز"

غالب کا دعویٰ تھا کہ فارسی میں "ذ" نہیں ہے۔ اس لیے وہ تمام فارسی الفاظ "ز" سے لکھتے تھے۔ گزشتن - گزاشتن - گذاردن اور پذیرفتن اور ان کے مشتقات مثلاً گزشتہ، سرگزشت، گذرگاہ، درگذر وغیرہ کو غالب "ز" ہی سے لکھتے تھے۔ غالب "ذہ" کو، جو عربی لفظ ہے، "ز" ہی سے لکھتے تھے۔

## پانو اور گانو

تلفظ کے اعتبار سے "پاؤں" اور "گاؤں" کی صحیح املا "پانو" اور "گانو" ہے۔

غالب ہمیشہ "پانو" اور "گانو" لکھا کرتے تھے۔ قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی نے "پاؤں" لکھ دیا تو ۲۲ فروری ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب انہیں تنبیہ کرتے ہیں: "پاؤں کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو۔ درست ہے" جدید املا میں ان الفاظ کی املا پاؤں، گاؤں اور چھاؤں ہی عام ہے۔

## معکوسی آوازیں

چوں کہ فارسی میں معکوسی آوازیں نہیں ہیں اس لیے فارسی رسم الخط میں ان آوازوں کو تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ قدیم اردو املا میں تمام معکوسی آوازوں کے لیے قریب المخرج آوازوں کے مصمتے پر تین نقطے بنادیا کرتے تھے۔ مثلاً

ث (ٹ)      ثھ (ٹھ)

ڈ (ڈ)      ڈھ (ڈھ)

ژ (ژ)      ژھ (ژھ)

پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے کہ گجرات میں بارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں معکوسی آوازوں پر ضرب کی علامت "x" بنا دیتے تھے۔ مثلاً:

ت (ٹ)      ڈ (ڈ) وغیرہ

تین نقطے لگانے سے "ٹ" اور "ث" میں التباس ہوتا تھا۔ کیوں کہ دونوں پر تین نقطے ہوتے تھے۔ اس لیے غالباً نقطوں کی تعداد تین سے بڑھا کر چار کر دی گئی۔ غالب کی املا میں چار نقطے ملتے ہیں۔ لیکن غالب کچھ معکوسی آوازوں پر چار نقطے لگاتے ہیں اور کچھ پر "ط" لکھتے ہیں۔ مثلاً "ٹ" اور "ٹھ" پر چار نقطے لگاتے ہیں لیکن "ڈ"۔ "ڈھ"۔ "ژ" اور "ژھ" پر "ط" بناتے ہیں۔



## یائے تحتانی اور ہمزہ

غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کی ایک فارسی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے لکھا ہے :  
یاد رکھو، یائے تحتانی تین طرح پر ہے :  
جزو کلمہ :

(مصرع) ہمارے برسر مرغان از آن شرف دارد

(مصرع) اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشاے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے۔ جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا،  
گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی محل ہے ؛  
جیسے ”آسیاے چرخ“ یا ”آشناے قدیم“۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ  
نہیں چاہتا ”فداے تو شوم“ ”رہناے تو شوم“ یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے : یائے مصدری، اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح : توحید و  
تشکیروہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری : ”آشنائی“۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا  
قصور۔ توحیدی : ”آشناے“ یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ  
کھاؤ گے۔ اردو املا میں بھی غالب اس اصول کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

چاہیے۔ لیے۔ دیے۔ کیے

ہمارے زمانے میں عام طور سے لوگ ان الفاظ کو ہمزہ سے لکھتے ہیں لیکن بعض لوگ  
ان الفاظ کو ”ی“ سے بھی لکھتے ہیں۔ غالب نے ان الفاظ میں ”ہمزہ“ اور ”ی“ دونوں ہی  
استعمال کیے ہیں۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں :

چاہیے۔ کیے۔ لیئے۔ سینئے۔ روپیئے۔ وغیرہ  
اس طرح کے فارسی الفاظ میں بھی غالب نے ”ہمزہ“ اور ”ی“ دونوں کا استعمال  
کیا ہے۔ مثلاً:

آئیدہ۔ فائدہ۔ پائیدہ۔ فزائیدہ۔ طائر۔ اور جائیز۔ وغیرہ

## فرمائیے

اس لفظ میں غالب نے ”ہمزہ“ اور ”ی“ استعمال کیا ہے اور تشدید لگا کر اس طرح  
لکھا ہے: فرمائیے۔

آئے۔ پائے۔ جائے۔ ہوئے۔

ان چاروں لفظوں کو غالب نے کبھی ”ہمزہ“ سے اور کبھی بغیر ”ہمزہ“ کے لکھا ہے۔ اور اگر آئے گا  
اور جائے گا کو ملا کر لکھا ہے تو ہمزہ کے بجائے ”ی“ سے اس طرح لکھا ہے:  
آیگا۔ جایگا۔

## موتید اور رؤسا

غالب نے ان دونوں الفاظ کو بغیر ”ہمزہ“ کے لکھا ہے۔

ایسے الفاظ جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے

ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے، جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے۔ مثلاً

روانہ اور روانا

زمانہ اور زمانا

تکیہ اور تکیا

مولانا اور مولانا

یہ اور یہ

ایک لفظ ایسا بھی ہے جس کی املا غالب نے تین طرح کی ہے۔ وہ لفظ ہے ”ہاتھ“۔  
غالب نے ”ہات“۔ ”ہاتھہ“ اور ”ہاتھ“ تین طرح لکھا ہے۔

## بعض الفاظ کی املا اور اُن کا تلفظ

کسی بھی متن کی بنیاد پر اس کے مصنف کے تلفظ کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ ضروری نہیں الفاظ کے تلفظ اور اُن کی املا میں مطابقت ہو۔ غالب کی تحریروں میں بعض لفظوں کی املا اس طرح کی گئی ہے کہ جن پر شبہ ہوتا ہے کہ غالب اُن کا تلفظ بھی اس طرح کرتے تھے۔ اگرچہ اس معاملے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

## بوڑھا اور گاڑی

غالب کی تحریروں میں یہ الفاظ اور خاص طور سے لفظ ”بوڑھا“ کثرت سے آیا ہے۔ اور عام طور سے ان دونوں الفاظ کی املا ”بوڑھا“ اور ”گاڑی“ کی گئی ہے لیکن کبھی کبھی ”بوڑھا“ اور ”گاڑی“ بھی ملتے ہیں ممکن ہے کہ غالب ان الفاظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

## گڑ پنکھ

غالب نے ”گڑ پنکھ“ لکھا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ خطوطِ غالب میں صرف ایک بار ملتا ہے۔ اس لیے کہنا مشکل ہے کہ یہ سہو قلم ہے یا غالب اسی طرح تلفظ کرتے تھے۔



## ترپنا

قدیم اردو میں اس لفظ کا تلفظ ”ترپھنا“ ہے۔ غالب بھی اسی تلفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے: ”ترپھنا“ ترجمہ ”تہیدن“ کا املا یوں ہے نہ ”ترپنا“ باسے فارسی اور نون کے درمیان اسے مخلوط تلفظ ضرور ہے۔

## ڈھونڈنا

قدیم اردو میں اس لفظ کا تلفظ ”ڈھونڈھنا“ ہے۔ اور غالب کی تحریروں میں اس لفظ کی املا ”ڈھونڈھنا“ ملتی ہے ممکن ہے وہ اس لفظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

## سوچ

دہلی میں بعض مصوتوں کو انفیاء نے کار حجان عام تھا۔ آج بھی دلی کی کر خنداری بولی میں ”گھانس“، ”چانول“، ”بینچنا“ عام ہیں۔ غالب نے ہر جگہ سوچ لکھا ہے۔ اگر کہیں ”سوچ“ لکھا ہے تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک جگہ غالب نے ”بوٹے“ کے بجائے ”بونٹے“ بھی لکھا ہے۔ ایک مطبوعہ خط میں ”چانول“ ملتا ہے۔

غالب نے بعض الفاظ کی املا اپنے عہد کی رائج املا سے اس طرح مختلف کی ہے کہ ہم اسے غلط املا کہنے پر مجبور ہیں۔ الفاظ کی اس غلط املا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ جو غالب کی اب تک کی دستیاب تحریروں میں غالباً صرف ایک بار آتے ہیں۔ مثلاً :

سہرٹ (سورٹھ)

مومیں جامہ ( مومی جامہ ) وغیرہ  
دوسرے اُن الفاظ کی املا جو میرے خیال سے سہو قلم ہیں۔ مثلاً :

پانچ ساتھ ( پانچ سات )

خورم ( خرم )

دبھی ( دبھی )

گٹھائیں ( گٹھائیں )

تیسرے وہ الفاظ جو غالب نے ایک سے زیادہ بار لکھے ہیں۔ اور جن سے بارے میں وثوق  
کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے ذہن میں ان الفاظ کی املا غلط تھی۔ مثلاً :

بالکل ( بالکل )

بالفعل ( بالفعل )

بالشر ( بالشر )

# غالب کی زبان پر فارسی اثرات

## انگریزی الفاظ کا استعمال

یہ بات واضح ہے کہ اردو نثر فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس لیے ابتدائی اردو نثر پر فارسی کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں پہلی بار اردو نثر کو انفرادیت کے ساتھ باقاعدہ طور پر اپنی حیثیت کو منوانے اور اپنی شناخت کرانے کا موقع ملا تھا۔ ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کا اردو نثر پر زیادہ اثر نہیں ہوا، لیکن بعض سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے جوں جوں اردو نثر کا استعمال بڑھتا گیا، یہ فارسی کے اثر سے آزاد ہوتی گئی۔ پچاس ساٹھ سال کی مدت میں سرسید، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں نثری اعتبار سے بھی اردو نے ایک آزاد اور مکمل زبان کی حیثیت حاصل کر لی۔

غالب کا زمانہ ان لوگوں سے کچھ پہلے کا ہے۔ جب غالب عمر کے آخری حصے میں تھے تو یہ سب لوگ نوجوان تھے۔ غالب بنیادی طور پر فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ دوسرے لفظوں میں غالب کی پہلی تخلیقی زبان فارسی تھی۔ اگرچہ غالب کی روزمرہ گفتگو کی زبان اردو تھی، لیکن جب وہ اردو میں شعر کہتے یا اردو نثر لکھتے تو اُن کے ذہن پر فارسی کا تھوڑا بہت غلبہ ضرور رہتا۔ انھوں نے اردو میں جو دیباچے اور تقریظیں وغیرہ لکھی ہیں، اُن پر فارسی کے خاصے گہرے



اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خطوط میں غالب کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ روزمرہ کی زبان میں باتیں کریں، اس لیے اُن کے خطوط کی زبان بہت صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ خطوط غالب کی نشر پر فارسی کے اثرات ہیں لیکن کم۔ غالب اردو دیباچوں اور تقریظوں کے مقابلے میں اردو خطوط میں فارسی محاوروں یا ان کے اردو ترجموں اور فارسی و عربی کے ان الفاظ کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، جن کا اردو میں چلن نہیں ہوا تھا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کے اردو خطوط میں جو فارسی محاورے اور نسبتاً اجنبی فارسی و عربی لفظ استعمال ہوتے ہیں، یہ پہلی بار غالب نے ہی استعمال کیے ہیں یا یہ اُن کے عہد کی اردو نشر میں بھی رائج تھے اور بعد میں متروک ہو گئے۔ ممکن ہے کہ کچھ الفاظ اور محاورے رائج ہوں اور کچھ غالب نے پہلی بار استعمال کیے ہوں۔ بہر حال اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے خطوط غالب اور عہد غالب کی اردو نشر کا لسانی تجزیہ ضروری ہے، جو ظاہر ہے کہ آسان کام نہیں ہے۔

محمد حسین آزاد اپنے عہد کی گروہ بندی کے شکار ہیں۔ وہ غالب کے نہیں ذوق کے طرف دار ہیں۔ اب حیات میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور ادیب تھے۔ آزاد دیکھتے ہیں :

”مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نشر کا تھا اور اس کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن چوں کہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و روسائے اکبر آباد میں مملو خاندان سے نامی اور مرزائے فارسی ہیں، اسی طرح اردو سے معلیٰ کے مالک ہیں۔“

آزاد اپنے مخصوص انداز میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالب تو فارسی کے شاعر اور ادیب ہیں اس لیے اردو کے شاعروں (یعنی ذوق) سے اُن کا مقابلہ بے سود ہے۔ یہ یقیناً آزاد کی زیادتی ہے۔ اب غالب کے اردو خطوط کے بارے میں آزاد کی رائے ملاحظہ ہو دیکھتے ہیں :

”ان (اردو) خطوط کی عبارت ایسی ہے کہ گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں، تودہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔“  
یہ ٹھیک ہے کہ غالب کے اردو خطوط میں فارسی لفظوں، فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہ استعمال اس طرح ہرگز نہیں ہوا کہ بعض فقرے بہ قول مولانا محمد حسین آزاد ”کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں“ غالب نے فارسی لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال ایسی جستجی کے ساتھ کیا ہے کہ ان سے نثر زیادہ موثر اور زیادہ معنی خیز ہو گئی ہے۔

یہاں ایسے فارسی لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں کی نشان دہی کی جاتی ہے جو غالب نے استعمال کیے ہیں لیکن جو ہمارے عہد کی ادبی نثر میں استعمال نہیں ہوتے، اگرچہ مذہبی تحریروں میں اس طرح کے الفاظ اب بھی مستعمل ہیں۔

اردو نے بہت سے اسم فارسی اور عربی سے مستعار لیے ہیں، لیکن ان کے ساتھ افعال اردو کے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ”کتاب پڑھی“۔ ”قلم بنایا“۔ ”کاغذ پھاڑا“ وغیرہ غالب نے ایسے بعض فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ خود فارسی افعال کا ہی اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض ایسے فارسی محاورے اور ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں، جو جدید اردو میں مستعمل نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

”نشہ نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں“ گلہ رکھتے ہیں ”گلہ داشتین کا ترجمہ۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۶ء

”نشہ نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو ”یاد نہ لانا“ ”یاد نہ لانا“

”یاد نہ آوردن“ کا ترجمہ۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۴ جنوری ۱۸۵۲ء

”میں مشقت کھینچ کر، جو کچھ کہ اب لکھا ہے، وہ لکھ کر تم کو بھیج دیتا۔“ مشقت کھینچنا ”مشقت کشیدن“ کا ترجمہ۔

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء

”دو میم آپڑے ہیں۔ ایک میم محض بے کار ہے۔“ ”آپڑے ہیں“ ”افتادہ اند“ کا ترجمہ۔

بنام انورالدولہ شفق ہر دہم اکتوبر ۱۸۵۵ء

”اگرچہ باور نہیں آیا، لیکن عجب آیا“ ”عجب آنا“ ”عجب آمدن“ کا ترجمہ۔

بنام منشی غلام غوث خاں بے خبر ۱۸۶۲ء

”اُدھی پونجی والے گم نام اپنی شہرت کے لیے مجھ سے لڑتے ہیں۔ واہ واہ اپنے نامور بنانے کو ناحق احمق بگڑتے ہیں“ ”نامور بنانا“ ”نامور ساختن“ کا ترجمہ۔

بنام نواب میر غلام بابا خاں ۷ دسمبر ۱۸۶۵ء

”روپیہ وصول میں آیا۔“ ”وصول میں آنا“ ”یہ معرض وصول آمدن“ کا ترجمہ۔

نوابانِ رام پور کے نام خطوط میں متعدد بار

”مجھ کو تو مفید پڑا۔“ یہ فقرہ ”بہ من مفید افتاد“ کا ترجمہ۔

بنام منشی نبی بخش حقیر اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء

”کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے“

”برہم مارنا“ ”برہم زدن“ کا ترجمہ۔

”یہ امر جلد صورت پکڑ جائیں“ ”صورت پکڑنا“ ”صورت گرفتن“ کا ترجمہ۔



”بابو صاحب کے واسطے میرادل بہت جلا“ ”میرادل بہت جلا“ ”وَلَمْ سُوْخَتْ“  
کا ترجمہ۔

بنام سید بدرالدین احمد فقیر ۳ جنوری ۱۸۵۵ء  
”عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے“ ”پیشہ رکھنا“ ”پیشہ داشتن“  
کا ترجمہ۔

بنام منشی شیونرائن آرام اپریل ۱۸۶۰ء  
”اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے، تو میں مارہرہ کو آتا ہوں“  
”نقش قبول کرنا“ ”نقش قبول کردن“ کا ترجمہ۔

بنام چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۸ء  
”تمہارے تنہا اور بے مربی رہ جانے کا میں نے بہت غم کھایا“ ”غم خوردن“ کا ترجمہ  
بہاری لال مشتاق ۲۶ فروری ۱۸۶۸ء  
”اب تم کو بھی لازم آپڑا ہے“ ”لازم آپڑنا“ ”لازم آمدن“ کا ترجمہ۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء  
اب کچھ ایسی مثالیں ملاحظہ ہوں جہاں غالب نے فارسی الفاظ کو فارسی مفہوم میں ہی  
استعمال کیا ہے۔

فرصت : فارسی میں ”موقع“، ”فراغت“ ”مہلت“ ”چھٹکارا“ ”نجات“ اور خلاصی کے  
مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے یہ لفظ کثرت سے بیماری سے نجات پانے کے مفہوم  
میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

”میاں تفتہ نے کچھ حال آپ کے آشوب چشم کا لکھا تھا، پھر اُن کے ہی  
خط سے یہ بھی دریافت ہوا کہ کچھ فرصت ہے۔“

بنام منشی نبی بخش حقیر ۹ مارچ ۱۸۵۳ء

منشا : فارسی میں یہ لفظ "سبب" اور "مقصد" دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں صرف "مقصد" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ "سبب" کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"منشا تشویش واضطراب کا یہ ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء

تحقیق : فارسی میں یہ لفظ "درست"، "تصدیق"، "یقین"، "چھان بین" اور "دریافت" وغیرہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف آخری دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اسے فارسی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء

یعنی تم کو صحیح حال معلوم ہوگا۔

جریدہ : فارسی میں اس لفظ کا مطلب "تنہا" اور "اکیلا" اور "رسالہ" ہے۔ غالب نے یہ لفظ "تنہا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"جریدہ پبیل ڈاک آئیں گے۔"

بنام حسین مرزا ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء

وحشت : فارسی میں رمیدگی، خوف سے بھاگنا، کنارہ کشی اختیار کرنا اور "سودا" اور "دیوانگی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں صرف "دیوانگی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے یہ لفظ "کنارہ کشی" کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"پھر اس وحشت کی وجہ کیا۔ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے تو اس کتاب اور مثنوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا۔"

بنام تفتہ یکم ستمبر ۱۸۵۸ء

رنجور : فارسی میں یہ لفظ "بیمار" اور "غمزدہ" دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے بیمار کے مفہوم میں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے :

"ایسا نہ ہو کہ گرمی کی تاب نہ لائیں اور روزہ رکھ کر رنجور ہو جائیں۔"

توقف : فارسی میں "دیر" "وقفہ" اور "صبر و تحمل" "رکنا" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف "دیر" اور "وقفہ" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ غالب نے صبر و تحمل کے مضمون میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالب نے لکھا ہے :

"آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر، نقل اتر واکر بھیج دوں۔"

سیاست : فارسی میں "ملکی انتظام" اور "سزا" دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں صرف "ملکی انتظام" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ "سزا" کے معنی میں اس طرح استعمال کیا ہے۔

"مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔"

مسترد : فارسی میں یہ لفظ "واپس کرنا" اور "رد کرنا" دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اردو میں صرف "رد کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب اسے واپس کرنے کے مفہوم میں اس طرح استعمال کرتے ہیں :

"میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا اور اشعار مسترد کر دیے۔"

بنام منشی سیل چند ۱۴ مارچ ۱۸۶۵ء

ہمدرد : غالب نے یہ لفظ ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ : "جو غم تم کو ہے وہی غم مجھے بھی ہے" فارسی میں یہ لفظ "غم خواہ" اور دکھ درد میں ساتھ دینے والے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اردو میں دوسرے معنوں میں مستعمل ہے۔ غالب کی ایک پھوپھی کا انتقال ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصے پہلے منشی نبی بخش حقیر کے



بھی کسی رشتہ دار کا انتقال ہوا تھا۔ غالب نے حقیر کو اپنی پھوپھی کی وفات کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

” میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا..... مر گئی۔“

بنام غشی نبی بخش حقیر ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء

قباحت: فارسی میں اس لفظ کے کئی معنی ہیں: ”برائی“ ”خرابی“ ”وقت“ اور ”مشکل“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اسے فارسی کے اس مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے، جو اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

” ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء

ہرزہ: ”ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ دسمبر ۱۸۵۲ء

بے سروپا: غالب نے یہ لفظ ”بے ساز و سامان“ اور ”تباہ حال“ کے مفہوم میں اس طرح استعمال کیا ہے:

” جو بے سرو پا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔“

سیاح ۳ جون ۱۸۶۱ء

مگر: اردو میں ”لیکن“ کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ شعر اور نثر دونوں

میں شاید کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب

شہر تم کو مگر نہیں آتی

نثر میں غالب لکھتے ہیں:

”حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش  
مطلوب ہے، اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند  
نہیں آتی۔“

بنام یوسف علی خاں نظام ۳ دسمبر ۱۸۵۸ء

احیا : اردو میں ”دوبارہ زندہ کرنے“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں  
”حی“ کی جمع ”احیا“ ”زندہ لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے دوسرے مفہوم  
میں بھی استعمال کیا ہے۔

”دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احیا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔“

بنام حکیم غلام نجف خاں اپریل ۱۸۵۸ء

علاقہ : یہ لفظ اردو میں دلی لگاؤ، زمینی اور جغرافیائی حوالے وغیرہ کے لیے استعمال  
ہوتا ہے۔ فارسی میں یہ لفظ نوکری اور ملازمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے  
اس مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

”مجھ کو فکر جانی کی ہے کہ اسی علاقے میں تم بھی شامل ہو“

بنام مرزا بہر گوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

غالب نے اردو میں فارسی اور عربی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو اردو میں  
مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً :  
”اذمانی“ بمعنی ”یقینی“

”اذمانی ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلے کے ساتھ ہوگا“

بنام حکیم غلام نجف خاں ستمبر ۱۸۵۸ء

”گزاف“ بمعنی یادہ گوئی

”خط کے پہنچنے سے اظہارِ منت پذیری اگر گزاف نہیں تو کیا ہے“

بنام عبدالرزاق شاکر قبل ۱۸۶۵ء

جدید اردو میں "لاف و گزاف" مستعمل ہے۔

"ریب" بمعنی "شک"

"اس میں کیا ریب ہے"

بنام علامہ الدین خاں علائی یکم ستمبر ۱۸۶۲ء

"درنگ" بمعنی "تاخیر"، غالب نے اس لفظ کا استعمال بہت کیا ہے :

"آپ کے خط کا جواب لکھنے میں درنگ اس راہ سے ہوئی"

بنام سید بدرالدین احمد کاشف ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء

"ایمن" بمعنی "محفوظ"

"ہر ایمن ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں"

بنام میر مہدی مجروح ہفتم فروری ۱۸۵۸ء

"بجل" بمعنی "معاف کرنا"

ایک ظالم پانی پت، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اُس

کو بجل کیا۔

بنام میر مہدی مجروح ۷ مارچ ۱۸۵۹ء

"کون" بمعنی "تعمیر" وجود میں آنا

"لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے، مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے

ایک کون ہوگا، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی"

بنام میاں داد خاں ستیاج ۱۱ جون ۱۸۶۱ء

"انفراد" بمعنی "تنہا" "کیل"

"یہاں جتنا بہ انفراد بہہ رہی ہے"



بنام انور الدولہ شفق ۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء

”استعلاج“ بہ معنی ”علاج“

”بی بی بیمار ہے۔ اُس کا استعلاج منظور ہے۔“

بنام علماء الدین خاں علّائی ۲۱ جون ۱۸۶۳ء

”مجموع“ بہ معنی ”تمام“

”ایک بہن، اُس کی مجموع اولاد وہاں“

بنام قدر بلگرامی ۲۲ فروری ۱۸۶۳ء

”زلت“ بہ معنی ”غلطی“

”ہر موقع پر خطا اور زلت مولف کا اشارہ کر دوں گا۔“

بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی ۱۸۶۵ء

”مُبطِل“ بہ معنی ”باطل کرنے والا“ ”غلط ثابت کرنے والا“

”اور الف نون حالیہ کے وجود کا مُبطِل تو نہیں ہوا“

بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیا ۱۸۶۴ء

”مُظنون“ بہ معنی ”شبہ ہونا“

”اگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسال قیمت مُظنون ہے۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۷ فروری ۱۸۵۹ء

غالب کبھی آدھے اور کبھی پورے فقرے فارسی کے لکھ جاتے ہیں۔ چند مثالیں

ملاحظہ ہوں :

”سر آغازِ فصل میں ایسے شمر لے پیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گو نہ میمنت

اور شادمانی ہے“

بنام قاضی عبدالجلیل جنون

”اتحادِ اسمی دلیلِ مودتِ روحانی ہے“

بنام عبدالرزاق شاہ

”اور وہ امر بعد تعجبِ مفرط کے موجبِ نشاطِ مفرط ہوگا“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۱ء

”صریرِ قلمِ تامیوں کے شیون کا خروش ہے“

بنام میر غلام بابا خاں ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء

”بہ سببِ استعمالِ ادویہ حارہ کہ اس مرض میں اس سے گریز نہیں“

بنام منشی نبی بخش حقیر

”جس کے جی میں آئی، وہ متصدی تحریر قواعدِ انشا ہو گیا“

بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء دہلوی ۱۸۶۴ء

غالب کبھی کبھی فارسی کی پوری ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

”ایک مژہ برہم زدن نہیں تھما“

بنام علامہ الدین خاں علانی

”آفتابِ سرکوه ہیں“

بنام جواہر سنگھ جوہر ۹ اپریل ۱۸۵۳ء

”میں خود اس مثنوی کے واسطے خون در جگر ہوں“

بنام چودھری عبدالغفور سرور

”کیا جگر خون کن اتفاق ہے“

بنام نواب میر غلام بابا خاں ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء

”نشرِ لویں کھایا، مگر یہ کہ بہ طریقِ خوشامدِ طبیب سے رجوع کی“

۱۸۵۸ء

بنام علامہ الدین خاں علانی

”فرطِ نجلت سے سرورِ پیش ہو کر قصیدے کو اس لفافے میں بھیجتا ہوں“  
 بنام انور الدولہ شفق ۲۸ اگست ۱۸۶۷ء  
 ”اپنے اپنے عزیزان بہ سفر رفتہ کو لکھا“  
 بنام انور الدولہ شفق

## انگریزی الفاظ کا تلفظ، املا اور اردو ترجمہ

ہندوستان پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے انگریزی اجنبی زبان نہیں رہی تھی۔ دہلی کالج میں انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے ہندوستانیوں میں انگریزی داں طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ثقافتی سطح پر انگریزی سے الفاظ مستعار لینے کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ انتظامیہ اور ادواروں میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحوں کا استعمال عام تھا۔ انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا تھا، لیکن بیشتر انگریزی الفاظ اردو میں لے لیے گئے۔ ان مستعار الفاظ میں صوتی سطح پر بہت سی تبدیلیاں بھی وجود میں آئیں۔

غالب کے انگریزوں سے بہت گہرے مراسم تھے۔ انگریزوں میں غالب کے شاگرد، معتقد، دوست، مداح اور ممدوح، سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے زندگی بھر غالب کی برطانوی حکومت سے مراسلت رہی۔ ان خطوط کا مسودہ عام طور سے غالب فارسی میں لکھتے اور انگریزی میں ترجمہ کرا کے بھیجتے۔

غالب نے فارسی اور اردو نظم و نثر دونوں میں خاصی بڑی تعداد میں انگریزی الفاظ اور بعض انگریزی الفاظ کے اردو ترجموں کا بے تکلف استعمال کیا ہے۔ یہ بتانا تو ممکن نہیں کہ غالب انگریزی الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتے تھے۔ ہاں ان الفاظ کی املا غالب جس طرح کرتے تھے اس سے تلفظ کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جاسکتا ہے۔



پہلے تو انگریزی الفاظ کے وہ اردو ترجمے ملاحظہ ہوں، جو غالب نے استعمال کیے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ترجمے خود غالب نے کیے تھے یا اُس عہد میں رائج تھے۔

Telegram تار برقی، تار بجلی

Steamer دفائی جہاز

Match انگریزی دیاسلاتی

Martial Law جرئی بندوبست

Governor-General حاکم اکبر

Reply Post Card ڈبل خط پوسٹ پیڈ

Photograph آئینہ کی تصویر عکس کی تصویر

Post-master-General بڑا پوسٹ ماسٹر

Division کمشنری

Registered Letter رجسٹری دار خط

غالب نے بعض انگریزی الفاظ کی املا اس طرح کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ان الفاظ کا تلفظ، مروجہ تلفظ سے بہت مختلف کرتے تھے :

Lord لارڈ

Town Duty پان ٹوٹی

Secretary سکریٹری یا سکریٹری

Government گورنمنٹ

Liquor لیکور

Brigadier برگڈیر

Barrack بارک

Pension پنشن

Camp کمپ

Tiffin ٹیفن

Report رپورٹ

Council باہمی مشورہ

بعض الفاظ میں جو صوتی تبدیلی نظر آتی ہے، وہ آج تک برقرار ہے۔ مثلاً،

Collectorate کلکٹری

Registered رجسٹری

Box بکس

Hospital اسپتال

لیکن بعض انگریزی الفاظ کی جو املا غالب نے کی ہے، وہ اردو کے لیے قابل

قبول نہیں رہی۔ مثلاً :

Agent اجنٹ

Number نمبر

Stamp اسٹامپ

Cheque چیک

Certificate سادتی فکٹ

Station اسٹیشن

Resident ریسیڈنٹ

اب وہ انگریزی الفاظ ملاحظہ ہوں جن کی املا آج بھی تقریباً وہی ہے، جو غالب کی

تحریروں میں ملتی ہے :

|            |   |
|------------|---|
| Ticket     | ٹکٹ                                       |
| Doctor     | ڈاکٹر                                     |
| Agreement  | اگریمینٹ (غالب نے "اگریمینٹ" بھی لکھا ہے) |
| Income Tax | انکم ٹیکس                                 |
| Parcel     | پارسل                                     |
| Deputy     | ڈپٹی                                      |
|            | پوسٹ پیڈ                                  |





## غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد

| مکتوب الیہ                            | خطوط کی تعداد |
|---------------------------------------|---------------|
| ۱ مرزا ہرگوپال تفتہ                   | ۱۲۳           |
| ۲ نواب کلب علی خاں                    | ۷۶            |
| ۳ منشی نبی بخش حقیر                   | ۷۱            |
| ۴ نواب علامہ الدین خاں علائی          | ۵۷            |
| ۵ میر مہدی مجروح                      | ۵۰            |
| ۶ نواب یوسف علی خاں ناظم              | ۴۰            |
| ۷ منشی شیونرائتن آرام                 | ۳۶            |
| ۸ میاں داد خاں سیاح                   | ۳۵            |
| ۹ قاضی عبدالحکیل جنون                 | ۳۰            |
| ۱۰ چودھری عبدالغفور مسرور             | ۲۷            |
| ۱۱ خواجہ غلام محوٹ خاں بے خبر         | ۲۵            |
| ۱۲ حکیم غلام شجعت خاں                 | ۲۳            |
| ۱۳ میر غلام حسنین قدر بلگرامی         | ۲۲            |
| ۱۴ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق | ۲۰            |
| ۱۵ مرزا حاتم علی مہر                  | ۱۹            |
| ۱۶ حبیب اللہ ذکا                      | ۱۶            |

|    |  |    |
|----|--|----|
| ۱۲ | نواب یوسف مرزا                               | ۱۷ |
| ۱۱ | حکیم سید احمد حسن مودودی                     | ۱۸ |
| ۱۰ | نواب میر غلام بابا خاں                       | ۱۹ |
| ۱۰ | عبدالرزاق شاکر                               | ۲۰ |
| ۱۰ | مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب                | ۲۱ |
| ۸  | نواب امین الدین احمد خاں                     | ۲۲ |
| ۷  | غشی سیل چند منشی                             | ۲۳ |
| ۶  | سید فرزند احمد صفیر بلگرامی                  | ۲۴ |
| ۶  | ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا        | ۲۵ |
| ۶  | صاحب عالم مارہروی                            | ۲۶ |
| ۵  | نواب میر ابراہیم علی خاں وفا                 | ۲۷ |
| ۵  | سید بدر الدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر صاحب | ۲۸ |
| ۵  | ماسٹر پیارے لال آشوب                         | ۲۹ |
| ۵  | شاہزادہ بشیر الدین توفیق                     | ۳۰ |
| ۴  | محمد حسین خاں                                | ۳۱ |
| ۴  | مولوی نعمان احمد                             | ۳۲ |
| ۳  | جواہر سنگھ جوہر                              | ۳۳ |
| ۳  | شاہ عالم مارہروی                             | ۳۴ |
| ۳  | مرزا یوسف علی خاں عزیز                       | ۳۵ |
| ۳  | میر افضل علی عرف میرن صاحب                   | ۳۶ |
| ۳  | مرزا باقر علی خاں کاکل                       | ۳۷ |

|    |                                    |   |
|----|------------------------------------|---|
| ۳۸ | مولوی ضیاء الدین خاں ضیا           | ۳ |
| ۳۹ | منشی عبداللطیف                     | ۲ |
| ۴۰ | منشی نول کشور                      | ۲ |
| ۴۱ | منشی ہیرا سنگھ                     | ۲ |
| ۴۲ | ہر گوبند سہلے نشاط                 | ۲ |
| ۴۳ | مرزا قربان علی بیگ خاں سالک        | ۲ |
| ۴۴ | مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضواں       | ۲ |
| ۴۵ | میر احمد حسین میکش                 | ۲ |
| ۴۶ | میر سرفراز حسین                    | ۲ |
| ۴۷ | سید سجاد مرزا                      | ۲ |
| ۴۸ | نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں | ۲ |
| ۴۹ | عباس علی خاں بیتاب رام پوری        | ۲ |
| ۵۰ | میر ولایت علی                      | ۲ |
| ۵۱ | محمد نعیم الحق آزاد                | ۲ |
| ۵۲ | نجف علی خاں                        | ۲ |
| ۵۳ | ولایت علی ولایت و عزیز صغی پوری    | ۲ |
| ۵۴ | مردان علی خاں رعنا                 | ۲ |
| ۵۵ | مولوی احمد حسن خاں قنوجی           | ۲ |
| ۵۶ | احمد حسین مینا مرزا پوری           | ۲ |
| ۵۷ | بہاری لال مستحاق                   | ۲ |
| ۵۸ | محمد محسن صد الصدور                | ۱ |



|    |                                   |
|----|-----------------------------------|
| ۵۹ | قاضی محمد نورالدین حسین فائق      |
| ۶۰ | میر بنده علی خاں عرف مرزا میر     |
| ۶۱ | غشی سخاوت حسین                    |
| ۶۲ | مہاراجا سردار سنگھ والی بیکانیر   |
| ۶۳ | منفی سید محمد عباس                |
| ۶۴ | مرزا عباس بیگ                     |
| ۶۵ | مولوی عبدالغفور نساخ              |
| ۶۶ | مولوی عزیز الدین عزیز و صادق      |
| ۶۷ | تفضل حسین خاں                     |
| ۶۸ | مرزا محمد زکریا زکی               |
| ۶۹ | حکیم غلام رضا خاں                 |
| ۷۰ | غشی کیول رام ہشیار                |
| ۷۱ | مولوی کرامت علی                   |
| ۷۲ | مرزا رحیم بیگ                     |
| ۷۳ | شاہ فرزند علی صوفی منیری          |
| ۷۴ | غشی محمد ابراہیم خلیل             |
| ۷۵ | فرقانی میرٹھی                     |
| ۷۶ | محمود مرزا                        |
| ۷۷ | مرزا امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا |
| ۷۸ | نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفہ        |
| ۷۹ | حکیم غلام مرتضیٰ خاں              |

|   |   |    |
|---|---|----|
| ۱ | شیخ لطیف احمد بلگرامی   | ۸۰ |
| ۱ | منظہر علی اور عبداللہ   | ۸۱ |
| ۱ | نواب ضیاء الدین احمد خاں تیر، رختاں   | ۸۲ |
| ۱ | حکیم ظہیر الدین احمد خاں  | ۸۳ |
| ۱ | منشی غلام بسم اللہ  | ۸۴ |
| ۱ | ظہیر الدین کی طرف سے اُن کے چچا کے نام  | ۸۵ |
| ۱ | حکیم محب علی  | ۸۶ |
| ۱ | محمد حسین خاں   | ۸۷ |
| ۱ | شیخ احمد علی احمد رام پوری  | ۸۸ |
| ۱ | محمد امیر   | ۸۹ |
| ۱ | سید محمد زکریا خاں زگی دہلوی  | ۹۰ |
|   | بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ نامہ و داد پیام عز صدور لایا)۔   | ۹۱ |
|   | بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ وہ عرضی کا کاغذ، افشاں کیا ہوا، اور عرضی کا مسودہ میں نے لالہ جنگل کشور کو پرسوں دے دیا ہے)۔ | ۹۲ |
|   | بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ جناب عالی ! یہ خط فتح پور سے آپ کے نام آیا ہے)۔  | ۹۳ |
|   | بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ حضرت میرا حال کیا پوچھتے ہو؟)  | ۹۴ |
|   | کل تعداد ۸۷۳  |    |

خطوطِ غالب کا تنقیدی مطالعہ



## غالب سے قبل اردو کا نشری سرمایہ اور مکتوب نگاری کا آغاز

اس عنوان کے تحت اردو کے اُس نشری سرمایے کا جائزہ لینا مقصود ہے، جو غالب کی اردو مکتوب نگاری سے قبل وجود میں آچکا تھا۔

انیسویں صدی شروع ہونے سے قبل اردو میں میر، سودا، درد، انشا اور مصطفیٰ جیسے عظیم المرتبت شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ زبان اور فن، دونوں ہی اعتبار سے اردو شاعری نچنگی حاصل کر چکی تھی۔ اردو کی بہترین کلاسیکی شاعری کا بڑا حصہ تخلیق ہو چکا تھا۔ لیکن نشر ابھی تک کم مایہ اور تہی داماں تھی۔

اردو نشر کے ابتدائی نمونے پندرھویں صدی سے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی تک چار صدیاں ہوتی ہیں۔ اگر اس طویل عرصے میں لکھی جانے والی اُن نشری کتابوں کی فہرست مرتب کی جاتے، جو مخطوطات کی شکل میں ہمیں دستیاب ہوتی ہیں تو بہت کھینچ تان کے بعد بھی ہماری فہرست پچیس کتابوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کا امکان ہے کہ اردو نشر کے کچھ مخطوطات دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئے ہوں، تو اس فہرست میں پندرہ بیس کتابوں کا اور اضافہ کر لیجئے۔ یہ سب کتابیں تصوف، مذہب اور اخلاقیات کے موضوع پر ہیں یا ان میں سے کچھ داستانیں ہیں۔ اردو کا یہ نشری سرمایہ دوسری زبانوں اور خاص طور پر فارسی سے ترجمہ یا ماخوذ ہے۔

صدیوں تک فارسی ہندوستان میں ایک طاقتور مرکزی حکومت کی زبان رہی تھی اس مرکزی حکومت کے تحت تمام علاقوں میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی۔ چوں کہ مرکز اور

اُس کے تحت تمام علاقوں میں سرکاری سطح پر فارسی کا چلن تھا۔ اس لیے اعلیٰ طبقے کے سکھنے پڑھنے کی زبان فارسی ہی تھی۔ اس طبقے میں وہ افراد بھی تھے جو ایران اور افغانستان سے خود آئے تھے یا جن کے آباؤ اجداد ان مقامات سے ہندوستان آئے تھے اور وہ ہندوستانی بھی جنہوں نے اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے فارسی پر قدرت حاصل کر لی تھی فطری طور پر اس طبقے کی شعروادب کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔ سرکاری اور ادبی مقاصد کے لیے فارسی کے استعمال نے مقامی زبانوں اور بولیوں کو زیادہ پسپانے کا موقع نہیں دیا۔ صوفیوں اور سنتوں نے اپنے مسلک کی تبلیغ کے لیے مقامی زبانوں کا استعمال ضرور کیا لیکن اس کا اثر ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود رہا۔

مرکزی حکومت کے کمزور ہونے سے مختلف علاقوں کی تہذیبی و ثقافتی قدروں اور مقامی زبانوں کو ترقی کا موقع ملا۔ علاقائی وحدتیں وجود میں آئیں۔ تشخص کی تلاش میں اُن علاقائی خصوصیات نے فروغ حاصل کرنا شروع کیا جنہیں فارسی اور ایرانی ذوقِ جمال نے ابھرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ مغلوں کا زوال شروع ہوتے ہی ہندوستان کی نئی مقامی زبانوں کا وہ ارتقا شروع ہو گیا جو کافی عرصے سے جامد تھا۔ اردو بھی ان زبانوں میں سے ایک تھی۔

اردو کا علاقہ وہی تھا جس پر صدیوں تک فارسی نے حکومت کی تھی۔ اردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل تھی اور کھڑی بولی دہلی اور اس کے آس پاس بولے جانے والی بولی تھی۔ فارسی اور عربی کے بے شمار الفاظ اردو میں داخل ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو فارسی کی بہت سی ایسی آوازیں اپنائی پڑیں جو اردو میں نہیں تھیں۔ اردو کو پہلی بار تحریری روپ اُن لوگوں نے دیا جو عام طور سے فارسی کے علاوہ اور کوئی دوسرا رسم الخط نہیں جانتے تھے۔ اس لیے وہ لوگ فارسی رسم الخط اپنانے پر مجبور تھے۔

اردو کو فارسی سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ شمالی ہند میں ادو شاعری کا

آغاز اس طرح ہوا تھا کہ ایک مصرع فارسی کا ہوتا اور دوسرا اردو کا یا آدھا مصرع فارسی کا اور آدھا اردو کا یا "حرف فاعل" فارسی کے ہوتے مختصر سے عرصے میں اردو زبان اور شاعری کو ذہنی کاوش کی خراہ پر اس طرح اُتارا گیا کہ اردو میں تیر، درد اور سودا جیسے بلند مرتبہ شاعروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اگرچہ اردو شاعری نے اصنافِ سخن، شعری روایات، اظہار کے پیرائے، بے شمار الفاظ، تشبیہات و استعارات، تلمیحات، رعایتِ لفظی اور بہت سے روایتی شعری مضامین فارسی سے مستعار لیے، لیکن بہت جلد اس نے خود کو فارسی سے آزاد کر کے ایک باقاعدہ زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔

اٹھارویں صدی کی آخری چند دہائیوں میں، دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان یعنی انگریزی نے ہندوستان کے لسانی منظر نامے میں اپنے وجود کا احساس دلانا شروع کیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولہویں صدی میں یورپ کے مختلف ممالک سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ تجارتی کمپنیاں جب ہندوستان آئیں تو ہندوستانی عوام سے رابطے کے لیے کمپنی سے متعلق بعض افراد کو اردو سیکھنی پڑتی۔ ان کمپنیوں میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے جو اردو اور ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں میں علمی دلچسپی لیتے، اس دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اہل یورپ کے لیے اردو لغت اور قواعد تیار کیے تاکہ انھیں یہ زبان سیکھنے میں آسانی ہو۔ ان حضرات کی علمی کاوشوں پر ابھی تک خاطر خواہ تحقیق نہیں ہوتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں کلکتے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالیے تھے۔ جب اس کمپنی نے صاحبانِ انگریز کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کی ضرورت محسوس کی تو کلکتے میں ۱۰ جولائی ۱۷۸۴ء کو فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج میں یورپ کی تین جدید زبانوں یونانی، لاطینی اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی یعنی اردو، بنگالی، تیلگو، مرٹی اور تامل پڑھانے



کا انتظام کیا گیا۔ کالج میں تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اردو اور اردو بہ خط ناگری پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ جب ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ مغل حکومت برائے نام رہ گئی تو انگریزی نے ہندوستان کی لنگوا فرانکا یعنی اردو کو براہ راست متاثر کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ بہت سی انتظامی اور دفتری انگریزی اصطلاحیں اردو میں داخل ہونی شروع ہو گئیں۔۔

فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات و تالیفات کے وجود میں آنے سے قبل اردو نشر فارسی کے زیر اثر تھی اور یہ اثر اس حد تک تھا کہ اردو کے نثر نگار کثرت سے فارسی الفاظ و ترکیبیں استعمال کرتے تھے بیشتر اوقات فقروں کی قواعدی ساخت بھی فارسی کے انداز پر ہوتی۔ فارسی انشا پردازی کے انداز پر غیر معمولی تکلف و تصنع سے کام لیا جاتا۔ ایک بات کہنے کے لیے بہت سے مترادفات کا استعمال کیا جاتا۔ سیدھی سادی بات تشبیہات و استعارات کے سہارے کہی جاتی۔ رعایت لفظی کا اس طرح استعمال کیا جاتا کہ بات سمجھنا آسان نہ رہتا۔ صنائع لفظی و معنوی کا خاص طور سے التزام کیا جاتا۔ زور بیان اور عبارت آرائی کے نام پر بے جا طوالت سے کام لیا جاتا۔ فارسی حروف ربط کا ترجمہ ”بیچھے“، ”بیچ“، ”کے تین“، ”اوپر“ کیا جاتا۔ اضافت کے لیے ”کا“، ”کے“، ”سے“، ”کے“، ”نے“ وغیرہ مستعمل تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام میں آنے سے پچیس سال قبل یعنی ۱۷۷۵ء میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے ”نوطرز مرصع“ مکمل کی تھی۔ اس داستان کے آغاز کا پہلا پیرا گراف ملاحظہ ہو:

بیچ سرزمین فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا۔ سلیمان قدر،  
فریدوں فر، جہاں بان، دین پرور، رعیت نواز، عدالت گستر، برآرندہ  
حاجات بستہ کاراں، بخشندہ مرادات امیدواراں، فرخندہ سیرنام کہ اشعہ  
شوارق فصل ربانی کا اور شعشہ بوارق فیض سبحانی کا ہمیشہ اوپر لوح پیشانی

اس کے لمعاں و نور افشاں رہتا لیکن شبستانِ عمرو دولت اس کے کا، فروغِ شمعِ زندگانی کے سے کہ مقصدِ فرزندِ ارجمند سے ہے، روشنی نہ رکھتا تھا۔

اس عبارت کے تقریباً تمام فقروں کی قواعدی ساخت فارسی انداز پر ہے۔ پہلے فقرے میں فارسی حرفِ ربط ”و“ کا ترجمہ ”سچ“ کیا گیا ہے۔ اردو میں اس مفہوم کے لیے ”میں“ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ حرفِ ربط اسم سے پہلے نہیں آسم کے بعد آتا ہے۔ دوسرے فقرے میں صفت کے طور پر تمام فارسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ اشعہ شوارقِ فصلِ ربانی کا اور شعشہ بوارقِ فیضِ سبحانی کا۔ یہاں فارسی اضافت کا ترجمہ حرفِ ربط کے طور پر ”کا“ کیا گیا ہے، لیکن اس کا استعمال اردو قواعد کے خلاف ہے۔ ”شبستانِ عمرو دولت اس کے کا“ میں ”دولت اس“ کا ترجمہ ”دولت اس کے کا“ کیا گیا ہے۔ فروغِ شمعِ زندگانی کے سے ”فارسی میں یہ اس طرح ہوگا ”از فروغِ شمعِ زندگانی“ ”از“ کا ترجمہ ”کے سے“ ہے اور اب جدید اردو قواعد کی رو سے یہ ترجمہ اور فقروں کی ساخت قطعاً غلط ہے۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اردو شاعری کو فارسی کے اثر سے آزاد ہونے کا کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اردو شرا بھی فارسی ہی کے ساتھ میں چل رہی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے اردو شاعر کو فارسی کے اثر سے آزاد کیا۔ جان گلکرسٹ نے ”باغ و بہار“ کی تالیف کے لیے میرامن کو یہ ہدایت دی تھی۔

”جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تک گنگا جمناب ہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو، عورت، مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔“

میرامن کو جان گلکرسٹ کی یہ ہدایت اردو نشر کے ارتقا کی اہم ترین منزل ہے۔ گلکرسٹ کی شعوری کوشش تھی کہ اردو نشر فارسی کے اثر سے باہر نکل کر خود اپنی سرزمین کی آزاد فضاؤں میں سانس لے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ باغ و بہار اور فورٹ ولیم کالج کی دوسری کتابیں درسی مقاصد سے تالیف یا ترجمہ کرائی گئی تھیں۔ اب تک اردو نشر اس طبقے کے لیے نکھی گئی تھی، جو فارسی سے بخوبی واقف تھا اور جس کے مشرقی مزاج کو عبارت کی رنگینی اور پیچیدگی بہت پسند تھی۔ اب پہلی بار کچھ ایسے لوگوں کو اردو سکھانے کے لیے اردو کی نثری تالیفات اور تراجم کی ضرورت پڑی، جن کی مادری زبان انگریزی تھی، اور جنہیں اپنے ادبی ذوق کی آسودگی سے زیادہ وہ زبان سیکھنے کی ضرورت تھی، جو ہندوستانی عوام سے رابطے کا کام کر سکتی ہو۔ اب آپ باغ و بہار کی داستان کا پہلا پیرا گراف ملاحظہ فرمائیں:

”اب آغاز قصے کا کرتا ہوں۔ ذرا کان دھ کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کے یوں نکھا ہے اور کہنے والے نے اس طرح کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاکم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت تھا اور شہر قسطنطنیہ جس کو استنبول کہتے ہیں، اس کا پائے تخت تھا۔“

”باغ و بہار“ میں پہلی بار اردو نشر نے اپنی مکمل شناخت کرائی ہے اور پہلی بار اپنی قواعدی ساخت کی پابندی کی ہے۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ جدید نشر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کی ”باغ و بہار“ اور دوسری تالیفات سے ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا اثر اس عہد کے دوسرے نثر نگاروں پر نہ ہوا ہو۔ اس کالج میں نکھی جانے والی نشر نے یہ احساس عام کر دیا تھا کہ اگر اردو نشر کو اپنی انفرادیت حاصل کرنی ہے تو فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور محمد شاہی روشوں سے گریز کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ خاں انشا کی ”رانی کیتی کی کہانی“ اس سمت میں ایک مبالغہ آمیز کوشش ہے۔



رجب علی بیگ سرور نے ”فسانہ عجائب“ میں میرامن کی زبان پر اعتراض کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود میرامن کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ میرامن نے ”باغ و بہار“ میں اپنی زبان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ اس کی بازگشت سرور کے ”فسانہ عجائب“ میں اس طرح ملتی ہے۔ یہ قول سرور اُن کے دوستوں نے درخواست کی :

” تو اس قصہ پر اگندہ کوازا آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظور نظر اہل بصر ہو، لیکن تقصیر معاف ہو لغت سے صاف ہو..... جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں!“

کے چل کر سرور لکھتے ہیں :

” نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل عربی فارسی کا مشکل تھا، اپنے

نزدیک اسے دور کیا اور جو کلمہ سہل متمنع محاورے کا تھا، وہ رہنے دیا۔“

سرور رنگین بیانی سے ضرور کام لیتے ہیں لیکن ”فسانہ عجائب“ کے کچھ حصے سادگی، شگفتگی اور فصاحت کے لحاظ سے ”باغ و بہار“ کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ جو اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ رجب علی بیگ سرور جیسا نثر نگار بھی فورٹ ولیم کالج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ جدید اردو نثر کے ارتقا میں دوسری اہم منزل دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی ہے جو ۱۸۴۳ء میں دلی میں قائم ہوئی اس سوسائٹی نے ہندوستانی طالب علموں کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کیں، جن میں بیشتر مختلف علوم کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔

فورٹ ولیم کالج نے اگرچہ جدید اردو نثر کی ابتدا کی تھی لیکن اُس کی مطبوعات، اخلاقیات، تاریخ، داستان، لغت اور صرف و نحو تک ہی محدود تھیں، دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اپنے ترجموں کے ذریعے پہلی بار ہندوستانی ذہن کو مغربی فکر اور

مغربی ادب سے آشنا کیا۔

دلی کالج اور سوسائٹی کی مطبوعات نے اردو نشر کے جدید آہنگ کے لیے فضا بالکل ہموار کر دی اور اس نشر کو فروغ حاصل ہوا اردو اخبار نویسی سے۔

اگرچہ اردو کے پہلے اخبار ”جام جہاں نما“ کا سلسلہ ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے اجرا ہوا لیکن دہلی میں پہلا اردو اخبار ”دہلی اخبار“ کے نام سے ۱۸۳۲ء میں جاری ہوا، جس کے اڈیٹر مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ اسی سال یعنی ۱۸۳۲ء میں سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ”سید الاخبار“ جاری کیا۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان دہلی سے کم سے کم بارہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ ان کے نام ہیں سراج الاخبار، ”صادق الاخبار“ فارسی میں اور ”دہلی اردو اخبار“، ”سید الاخبار“، ”مظہر حق“، ”محب ہند“، ”فوائد الناظرین“، ”تحفۃ الخدائق“، ”قرآن السعدین“، ”دقیق الاخبار“، ”نور مغربی“ اور ”نور مشرقی“ اردو میں ان اخباروں کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ ”سید الاخبار“، ”محب ہند“، ”قرآن السعدین“ اور ”فوائد الناظرین“ کے خریداروں میں ہندوستانی کم اور انگریز زیادہ تھے۔ ظاہر ہے اڈیٹرز کو اخبار کی زبان کا وہی معیار قائم کرنا پڑا ہوگا جو فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کا تھا۔ یعنی صاف، سادہ، سلیس اور روزمرہ کی زبان۔

غالب جدید اردو نشر کے موجد ہرگز نہیں تھے،

کیوں کہ اُن کی نشر نگاری کے آغاز سے تقریباً پچاس سال قبل اردو نشر جدیدیت کے راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ غالب نے ”قاطع برہان“ کے سلسلے میں اردو نشر میں چار رسالے لکھے تھے۔ ان کے علاوہ مختلف کتابوں پر دیباچے اور تقریظیں اور کچھ متفرق تحسیریں لکھیں۔ چوں کہ یہ چاروں رسالے ”قاطع برہان“ کے معرکے کے سلسلے میں لکھے گئے تھے اور ان میں الفاظ پر بحث کی گئی تھی۔ اس لیے ان رسالوں کی خوبی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ صاف اور سادہ اردو نشر میں ہیں۔ اردو نشر میں غالب کا اصل کا نامہ اُن کے



خطوط ہیں۔

یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ اردو مکتوب نگاری میں کس نے پہلی بار طرز جدید کو اختیار کیا۔ حالی نے یادگار غالب میں غالب کی خطوط نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُس کی پوری پوری تقلید ہو سکی!

حالی نے غالب کے خطوط کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف حرف صحیح ہے۔ حالی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غالب اردو مکتوب نگاری کے موجد اور باوا آدم ہیں، وہ تو صرف یہ کہ رہے ہیں کہ خطوط میں غالب نے جو رنگ اختیار کیا، وہ منفرد تھا۔ یعنی غالب سے پہلے کوئی بھی اردو خط میں یہ انداز اختیار نہ کر سکا اور نہ کوئی اُن کی تقلید میں کامیاب ہو سکا یہی بات اُن کی شاعری کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے۔ اُن کا مطلب یہ کہاں ہے کہ غالب فارسی اور اردو شاعری کے موجد تھے۔

جوش عقیدت میں ہمارے بہت سے ناقدین نے اردو مکتوب نگاری کا موجد غالب کو قرار دے کر مکتوب نگاری کی تاریخ ہی غالب سے شروع کی۔

ماسٹر رام چندر کے ”محب ہند“ (جلد نمبر ۲۹، بابت دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء) میں مکتوب نگاری کے فن پر ایک چھوٹا سا نوٹ شائع ہوا تھا۔ جس میں جدید اصول بیان کیے گئے۔ پنڈت برج موہن داتا تریہ کیفی نے اس نوٹ کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو مکتوب نگاری کے طرز جدید کے موجد ماسٹر رام چندر تھے اور بہ قول پنڈت کیفی ”ظن غالب یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا اور ان کی طبع و قاعد نے اُس سے ضرور اثر لیا ہوگا۔“

ماسٹر رام چندر کا نوٹ دسمبر ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ جب کہ اب تک کے دستیاب



خطوط میں غالب کا قدیم ترین اردو خط وہ ہے، جو ۱۸۴۶ء یا اس سے قبل غالب نے تفتہ کو لکھا تھا۔ گویا ماسٹر رام چندر کا نوٹ شائع ہونے سے تقریباً ڈیڑھ یا دو سال قبل۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تاریخ سے قبل بھی غالب نے اردو میں ایسے خطوط لکھے نہ ہوں۔

غالب کی "ہنج آہنگ" کے ابتدائی تین آہنگ ۱۸۲۵ء میں لکھے گئے۔ لیکن "ہنج آہنگ" کی طباعت کی نوبت اگست ۱۸۴۹ء میں آئی۔ اگرچہ آہنگ اول میں غالب نے خطوط نویسوں کی سہولت کے لیے القاب و آداب اور شکر و شکوہ اور شادی و غم کے متعارفہ اور رسمی الفاظ تحریر کیے ہیں "لیکن اسی آہنگ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اس روش سے بیگانگی میرا شیوہ ہے"۔ اسی آہنگ میں غالب نے مکتوب نگاری کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ مکتوب الیہ کی حیثیت کے مطابق القاب ملا کر اپنا مدعا بیان کرنا شروع کر دیں۔ طویل القاب و آداب اور خیریت و عافیت پوچھنا حشو و زائد ہے۔ خط لکھنے والے کو چاہیے کہ تحریر کو تقریر سے دور نہ کرے اور تحریر کو گفتگو کا رنگ دے۔"

ممکن ہے کہ غالب نے یہ الفاظ ۱۸۲۵ء میں آہنگ اول لکھتے ہوئے نہ لکھے ہوں بلکہ طباعت کے وقت اضافہ کیے ہوں، تب بھی ماسٹر رام چندر کا نوٹ شائع ہونے سے کم سے کم چار مہینے پہلے لکھے تھے کیوں کہ "ہنج آہنگ" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔

غالب اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن انگریزی مکتوب نگاری کے اصول و ضوابط سے پوری طرح واقف تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پینشن کے سلسلے میں برطانوی حکومت سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ غالب کو حکومت کے خط انگریزی میں ملتے تھے اور غالب حکومت کے افسران کو انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں خط لکھتے تھے۔ غالب خط کا مسودہ فارسی یا اردو میں تیار کرتے تھے اور ایسے لوگوں سے ترجمہ کرواتے تھے جو انگریزی اور انگریزی مکتوب نگاری کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی

میں غالب کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو انھوں نے برطانوی حکومت کے اعلیٰ افسران کو پینشن کے سلسلے میں لکھے تھے۔ ان خطوط میں مطلب کی بات بیان کی گئی ہے۔ ایک فقرہ بھی زائد نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خیر و عافیت اور دعائیہ کلمے وغیرہ بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مکتوب لکھنے کا انداز غالب نے انگریزوں اور انگریزی داں ہندوستانیوں سے سیکھا ہوگا۔ اور اس عہد میں برطانوی حکومت سے انگریزی میں خط و کتابت صرف غالب ہی کی نہیں، بیشتر لوگوں کی تھی۔ اس لیے جدید طرز پر مکتوب نگاری کے آغاز کا سہرا نہ تو ماسٹر رام چندر کے سر باندھا جاسکتا ہے اور نہ غالب کے سر۔ ”طرز جدید“ کا شعور عام ہو چکا تھا۔ تو کیا اردو نثر اور اردو مکتوب نگاری میں غالب کی کوئی اہمیت نہیں؟ جی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالب اردو نثر کے موجد ہیں اور نہ اردو مکتوب نگاری کے بادا آدم۔ لیکن غالب کے خطوط اردو مکتوب نگاری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ کیوں کہ غالب کے جدت پسند ذہن نے اس فن کو نیا آب و رنگ دیا ہے۔ غالب نے خود بھی کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ آسان، صاف، سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک زبان میں اردو مکتوب نگاری کا انھوں نے آغاز کیا ہے۔ ہاں غالب نے بار بار یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ اور خط کو ملاقات کا بدل بنا دیا ہے اور ان کا یہ دعویٰ سو فی صدی درست ہے۔

غالب کی اردو نثر نگاری کے بارے میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے :  
 ”حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۵۷ء - ۱۸۶۹ء) مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا“  
 ڈاکٹر ظہار نصاریٰ کا بیان ہے کہ :

”اس زمانے (یعنی ۱۸۵۷ء) میں اور اس کے بعد جب تک وہ (مرزا غالب) زندہ رہے ان کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم اور اردو میں زیادہ“

ان دونوں حضرات کے بیانات بالکل درست ہیں، لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ

بیان ڈاکٹر معین الرحمن کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

” انقلاب ۱۹۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا۔ جب کہ شرنگار غالب کا ظہور اس انقلاب کے بعد ہوا !“

شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر ظہار نصاریٰ دونوں کے بیانات درست ہیں۔ لیکن ڈاکٹر معین الرحمن کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے ۱۹۵۷ء کے بعد شعروشاعری ترک کر کے پوری توجہ نشر کی طرف مبذول کر دی۔ یہ صحیح نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن کے اس بیان کی خاصی پذیرائی ہوئی۔

پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ اس بیان میں ڈاکٹر معین الرحمن نے سامنے کی حقیقت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ محمد عبدالرحمن چغتائی نے اس فقرے کی داد دیتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنے اس موقف کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ اور اس کی تائید میں ایسی محکم شہادتیں پیش کی ہیں اور خوش تدبیری سے نتائج نکالے ہیں کہ ان کی بات ماننے بغیر چارہ نہیں۔

مجھے اس فقرے کے دونوں حصوں سے اختلاف ہے۔ انقلاب ۱۹۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو نہیں چھینا، کیوں کہ شاعر غالب ۱۹۵۷ء سے بہت پہلے ہم سے چھینے جا چکے تھے اور نہ ہی شرنگار غالب کا ظہور ۱۹۵۷ء کے بعد ہوا کیوں کہ یہ ظہور بہت پہلے ہو چکا تھا۔

پہلے اُن کی شاعری کو لیجیے۔ یہ تو عام طور پر ہوتا ہے کہ فنکار مدت تک تخلیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور جب اس کا موڈ آتا ہے تو ساری کسر نکل جاتی ہے لیکن غالب کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ ذاتی زندگی کی ناکامی نے ان کے دل و دماغ کو اس بُری طرح متاثر کیا تھا کہ ان کے تخلیقی سوتے بہت پہلے خشک ہونے لگے تھے۔

غالب کی زندگی کا سب سے پہلا المناک واقعہ پنشن کے معاملے میں اُن کی ناکامی



تھی۔ غالب بہت امیدوں سے کلکتے گئے تھے۔ کلکتے کے سفر اور وہاں کے قیام نے انہیں بہت مقروض کر دیا تھا۔ جب جنوری ۱۸۳۱ء میں اُن کے خلاف فیصلہ ہوا تو اُن کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اور یہ قول غالب ”قرض الگ۔ رسوائی الگ اور مستقبل کا خوف الگ“ اس واقعے سے غالب ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ انہیں شعر گوئی سے دلچسپی نہیں رہی۔ یہ قول مولانا امتیاز علی خاں عرشی :

”اور ستمبر جنوری ۱۸۳۱ء میں مقدمہ اُن کے خلاف فیصلہ ہوا، تو مستقبل کے خوفناک تصور نے اُن کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہنچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکر شعرو سخن سے منفر کا اظہار کیا۔ اب وہ غزل کہتے بھٹے مگر دوستوں کے اصرار پر اور قصائد بھی لکھتے تھے مگر مالی پریشانیوں کے بھوت کو دفع کرنے کے لیے“

مولوی سراج الدین احمد سے غالب کی ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی اور کلکتے سے واپسی پر اُن سے خط و کتابت ہوئی۔ مولوی صاحب کے نام غالب کا ایک فارسی خط ہے جس پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مولانا عرشی کا خیال ہے کہ یہ ۱۸۳۵ء یا ۱۸۳۶ء میں لکھا گیا۔ غالب لکھتے ہیں :

”تازہ غزل بھیجنے کے بارے میں آپ کا ارشاد سرائیکھوں پر۔ مگر دل کی خونابہ فشانی اور فکر کی جگر کاوی کے بغیر غزل موزوں نہیں ہوتی اگر مجھے غم روزگار سے تھوڑی سی بھی مہلت ملتی تو پھر آپ میری فکر کے جوہر دیکھتے۔ بہر حال اس افسردگی کے باوجود جس وقت بھی کوئی شعر زبان پر آجائے گا اُسے سپرد قلم کر کے خدمت گرامی میں بھیج دوں گا“ ————— (فارسی سے ترجمہ)

۱۸۴۰ء میں جب رام پور کے نواب محمد سعید خاں تخت نشین ہوئے تو اُن کے بھائی نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ نے اس موقع کے لیے غالب سے قصیدے کی فرمائش کی۔ غالب اُن کے نام ایک فارسی خط میں جواب دیتے ہیں :

” لیکن کیا کروں کہ شعر گوئی کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو زبان سخن کہاں سے ملے؟ آپ جیسے دیدہ و صاحبِ دل سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ شعر کہنے کے لیے دل کا ایک سو ہونا ضروری ہے یقین کیجئے کہ یہ دل صد پارہ جو میرے سینے میں ہے میرا دشمن بن گیا ہے اور اب سخن گستری اور معنی آفرینی کا اہل نہیں رہا۔۔۔۔۔ امید ہے کہ اس گزارش کے بعد آپ نظم و نشر کے لحاظ سے مجھے مردہ تصور فرمائیں گے اور دعائے خیر میں یاد رکھیں گے! ————— (فارسی سے ترجمہ)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب سخن گستری اور معنی آفرینی سے متنفر ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ ذہنی اعتبار سے شعر گوئی کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب قصیدہ ضرور لکھتے، کیوں کہ اس کا پورا امکان تھا کہ غالب کو اس قصیدے پر انعام ملتا۔ یہ خیال رکھیے کہ اس وقت غالب کی عمر تقریباً ۴۳ سال ہے اور ابھی ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں سترہ سال باقی ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا اس میں اشعار کی تعداد ۹۵۰ تھی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۱۱۱ ہو گئی گویا چھ سال میں کم و بیش سولہ شعر کا اضافہ ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تو اس میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ ہو گئی اور چوتھا اور غالب کی زندگی کا آخری ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۸۰۳ ہو گئی۔ ممکن ہے کہ غالب نے زیادہ تعداد میں شعر کہے ہوں لیکن انتخاب انہیں اشعار کا کیا۔ پھر بھی منتخب اشعار کی تعداد سے ان اشعار کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جو اُس زمانے میں کہے ہوں گے۔

ان اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان غالب نے شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی اس لیے ۱۸۴۷ء کے ایڈیشن میں صرف سولہ اشعار کا اضافہ

ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں غالب قلعے میں ملازم ہو گئے تو بادشاہ اور تہزادوں کے اصرار پر انھیں مجبوراً اردو میں غزلیں کہنی پڑیں۔

غالب اپنی اس مجبوری کا ذکر انور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق کے نام اس طرح کرتے ہیں:

”ہر چند ایک مدت سے طبیعت اردو شعر کہنے پر مائل نہیں لیکن کبھی کبھی بادشاہ کی رضا جوئی اور ملکہ عالیہ کے فرمان کی تعمیل میں اردو میں بھی شعر کہنے پڑتے ہیں!“ (ہنج آہنگ، اردو ترجمہ، ص ۱۵۰)

۲ جنوری ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں سید بدر الدین احمد المعروف بہ فقیر کو لکھتے ہیں،

”آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، سودہ یا تمہارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس“

گویا قلعے کی ملازمت کے دوران غالب نے اردو میں کچھ غزلیں کہیں اور فارسی میں شاید ایک بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان اردو کا جب تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ۶۸۵ اور چوتھے ایڈیشن میں مزید چھ شعر کا اضافہ ہوا۔ اگر پہلے ایڈیشن کے سنہ طباعت یعنی ۱۸۴۱ء سے آخری ایڈیشن کے سنہ طباعت ۱۸۶۳ء تک کہے گئے اردو اشعار کی سالانہ اوسط نکالی جائے تو غالب نے انیس سال میں کم و بیش ۷۲ اشعار یعنی اوسطاً پختیس شعر فی سال کہے۔ اگر غالب قلعے میں ملازم نہ ہوتے ہوتے اور بادشاہ کی مجبوری نہ ہوتی تو ان اشعار کی تعداد غالباً اور بھی کم ہوتی۔

اس کا مطلب ہے کہ پنشن کے مقدمے میں ناکامی، مالی دشواری، ۱۸۴۱ء اور پھر ۱۸۴۲ء میں جوئے کے الزام میں گرفتاری جیسے واقعات نے غالب کی تخلیقی قوت



۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہی سلب کر لی تھی۔ اور غدر نے نہیں بلکہ غالب کی زندگی کے اندوہناک واقعات نے شاعر غالب کو ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہم سے چھین لیا تھا۔

ڈاکٹر معین الرحمن کے بیان کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ: ”نثر نگار غالب کا ظہور ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔“ اگر معین الرحمن صاحب کہتے کہ غالب نے ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثر پر زیادہ زور دیا، تو یہ بات قابل اعتراض نہیں تھی۔ کیوں کہ غالب کا ۱۸۵۷ء سے پہلے فارسی اور اردو نثری سرمایہ اتنا کم نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

غالب نے ۱۸۵۷ء سے قبل نمشی نبی بخش حقیر، مرزا ہرگوپال تفتہ، نواب یوسف مرزا، بدرالدین احمد کاشف اور نمشی عبداللطیف وغیرہ کے نام اردو میں جو خط لکھے ہیں، ان میں سے سو کے قریب دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان خطوط کا  $\frac{1}{4}$  حصہ ۱۸۵۷ء سے قبل لکھا گیا تھا۔ اس کا امکان زیادہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے غالب کے خطوط زیادہ تعداد میں ضائع ہوتے ہوں۔ غرض اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نثر نگار غالب کا ظہور ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا، ہاں ۱۸۵۷ء کے بعد غالب نے اردو نثر اور خاص طور سے اردو مکتوب نگاری پر زیادہ توجہ دی۔



# غالب کا پہلا دستیاب اردو خط

یہ کہنا مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ غالب نے اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کب کیا اور اُن کا پہلا اردو خط کون سا ہے۔ غالب کے عہد میں خط و کتابت کی زبان فارسی تھی اور اُن کی آخری عمر میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کی تھی۔ اس لیے زندگی کے بڑے حصے تک غالب فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے رہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُس دوران میں غالب نے اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہ ہوگا۔ کچھ خطوط ضرور لکھے ہوں گے۔ اُن کو کچھ ایسے لوگوں کو بھی خط لکھنے پڑے ہوں گے جو صرف اردو ہی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ غالب کے ایسے بیشتر خطوط محفوظ نہیں رہے جو انھوں نے شاعروں، ادیبوں اور عالموں کو لکھے تھے اور جو غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے تو پھر ہم اُن لوگوں سے خطوط کو محفوظ رکھنے کی کیسے توقع کر سکتے ہیں جو اُن کی ادبی اہمیت سے قطعی واقف نہیں تھے۔ قاضی عبدالودود کا یہ خیال بالکل درست ہے :

”غالب سے سروکار رکھنے والوں میں ایسے لوگ، جو لکھنا پڑھنا جاننے کے باوجود فارسی سے بالکل ناواقف ہوں یا اُس سے کافی واقفیت نہ رکھتے ہوں، ضرور ہوں گے اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے مراسلت بھی ہوتی

ہوگی۔ انھیں فارسی میں خط لکھنے کے معنی یہ ہوتے کہ خواہ مخواہ ترجمہ کرانے کی زحمت دی جائے۔ ناچار اردو ہی میں خط لکھنا پڑا ہوگا۔ اسی طرح کبھی کبھی ناخواندہ لوگوں کو بھی خط لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور انھیں بھی فارسی کی جگہ اردو میں خط لکھا ہوگا۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم، گمان غالب ہے کہ ناخواندہ ہوں۔ بنارس و کلکتہ سے جو خط غالب نے انھیں بھیجے تھے اور جن کا ذکر چھج مل کے نام کے خطوط میں ہے، وہ کس زبان میں ہوں گے؟

غالب نے فارسی میں مراسلت ترک کرنے اور اردو میں باقاعدہ مکتوب نگاری شروع کرنے سے قبل یقیناً اردو میں خطوط لکھے ہوں گے، چاہے اُن کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس لیے غالب کے پہلے اردو خط کی نشان دہی کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ غالب کے اُس پہلے اردو خط کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جو ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ اور ہم اس زمانے کا تعین کر سکتے ہیں، جب غالب نے فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ خطوط لکھنے شروع کیے اور اس زمانے کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب غالب کی اردو مکتوب نگاری میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔

غالب کی اردو مکتوب نگاری کے آغاز کے بارے میں پہلا بیان مولانا الطاف حسین حالی کا ہے۔ انھوں نے یادگار غالب میں لکھا ہے :

”معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سنہ ۱۸۵۷ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمدن ”مہر نیمروز“ کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُس وقت بہ ضرورت اُن کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے سمجھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہر نیمروز کی



ترتیب و انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں، شاق معلوم ہوتی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۱ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدیوں سے محنت پڑی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے!

مضمحل ہو گئے قوی غالب

اب عناصر میں اعتدال کہاں؟

یہ تو ممکن ہے کہ جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد غالب نے فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ خطوط لکھنے شروع کر دیے ہوں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ اس تاریخ سے پہلے انھوں نے اردو میں کوئی خط نہ لکھا ہو، اس کا بھی امکان نہیں کہ اس تاریخ کے بعد غالب نے فارسی میں بالکل خط نہ لکھے ہوں۔ بعض ناقدوں نے حالی کے اس بیان کی روشنی میں یہ لکھنا شروع کر دیا کہ غالب نے اردو مکتوب نگاری کا آغاز جولائی ۱۸۵۰ء میں کیا تھا۔ یہ درست نہیں۔ حالی کا قول ہے کہ: ”اس وقت یہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی“ اس کا غالباً مفہوم یہ ہے کہ ”مہرِ نیروز“ کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے غالب نے بعض لوگوں کو جو خطوط لکھے، وہ اردو میں تھے۔ ممکن ہے حالی کا یہ مطلب نہ ہو لیکن ہمارے بعض نقادوں نے اس عبارت کا یہی مفہوم سمجھا ہے۔ یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔ غالب نے ”مہرِ نیروز“ کا مواد خود اکٹھا کیا نہ اس کا مسودہ تیار کیا۔ انھوں نے ۱۵ نومبر ۱۸۵۲ء اور ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء کو جو خطوط منشی نبی بخش حقیر کو لکھے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ”کار پردازان شاہی“ اردو میں مسودہ تیار کر کے بھیج دیا کرتے تھے۔ غالب کا کام صرف اس اردو مسودے

کافارسی میں ترجمہ کرنا تھا۔ اگرچہ کوئی قطعی ثبوت نہیں لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ مسودہ حکیم احسن اللہ خاں کی نگرانی میں تیار ہوتا ہو یا مسودہ تیار ہونے کے بعد حکیم صاحب اس پر ایک نظر ڈال لیتے ہوں۔ بہر حال ”مہرِ نیروز“ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ غالب نے جولائی ۱۸۵۷ء میں شروع کیا اور اگست ۱۸۵۷ء کو یعنی چار سال اور ایک مہینے میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اتنی بڑی مدت میں ۱۱۶ صفحات کا ترجمہ، غالب کو اتنا مصروف نہیں رکھ سکتا تھا کہ غالب کو فارسی میں خطوط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملے!

غلام رسول قہر کے خیال میں غالب کے دستیاب شدہ خطوط میں سب سے قدیم خط وہ ہے، جو غالب نے جواہر سنگھ جوہر کو لکھا تھا۔ اور جس میں لنگی کی فرمائش کی تھی۔ اس خط پر تاریخ تحریر یکم دسمبر ۱۸۳۸ء ہے۔ اردو میں جواہر سنگھ جوہر کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط کے آخر میں غالب لکھتے ہیں:

”کیوں صاحب، وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آتی۔ بہت دن ہوئے

جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا۔“

امکان یہی ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۳۸ء کے آخر میں یا ۱۸۳۹ء کے اوائل میں لکھا گیا۔ اس لیے غلام رسول قہر کے خیال میں اب تک غالب کے جو اردو خطوط ملے ہیں، ان میں یہ قدیم ترین ہے۔

مولوی مہیش پرشاد کے مرتبہ خطوط غالب کی جلد اول میں (جوہر کے نام اردو خط اس جلد میں شامل نہیں ہیں اور دوسری جلد شائع نہ ہو سکی) غالب کا قدیم ترین خط وہ ہے جو غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مہیش پرشاد نے اس خط کی تاریخ تحریر اگست ۱۸۳۹ء متعین کی ہے۔ اگرچہ مولوی صاحب نے اپنے دلائل پیش نہیں کیے، لیکن انہوں نے اس تاریخ کا تعین غالباً اس بنیاد پر کیا ہے کہ اس خط میں غالب نے تفتہ کے دیوانِ اول پر جو تقریظ لکھی تھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے "اسعد الاخبار" میں دیوان تفتہ کے بارے میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی ..

"دیوان تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے، ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے۔ وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہوگا۔ اُس کی ضخامت ۴۵ جز کے قریب ہے اور قیمت چار روپے۔ بعد اختتام کے پانچ ہوجائیں گے.... خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثنا خواں ہیں!"

اس اقتباس کے آخری فقرے میں غالباً اسی تقریظ کا حوالہ ہے۔ جو غالب نے لکھی تھی۔ اس لیے مولوی ہمیش پرشاد کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کے نام غالب کا زیر بحث خط اگست ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔ گویا اب دو قدیم ترین خط ہو گئے۔ ایک تو جواہر سنگھ جوہر کے نام جو دسمبر ۱۸۴۸ء کے آخر میں یا ۱۸۴۹ء کے اوائل اور غالباً جنوری ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔ اور دوسرا خط تفتہ کے نام، جو اگست ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔

غالب کے ایک اور خط کا پتا چلتا ہے، جو ان دونوں خطوں سے پہلے کا ہے، وہ خط بھی مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔

مولوی ہمیش پرشاد نے تفتہ کے نام غالب کے اس خط کی تاریخ تحریر تو متعین نہیں کی، لیکن اسے ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء اور ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء کے خطوط کے درمیان مرتب کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے تفتہ کے دو فارسی اشعار پر اصلاح دی ہے، اور تفتہ کا ایک مصرع نقل کیا ہے:

زاہدا، این سخت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی  
حق غفورست، گناہے شدہ ام تا چہ شود



بازار دل خود از چنیں کار

آزار چه می کنی دلم را

اسی خط میں تفتہ کا ایک مصرع اور نقل کیا گیا ہے :

خاربا در راہش افشایم کہ چوں خواہد شدن

یہ دونوں شعر دیوان اول میں موجود ہیں۔ چوں کہ میرے پیش نظر تفتہ کا جو دیوان اول ہے، وہ ناقص الآخر ہے اور صرف م کی ردیف تک ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تیسرا شعر بن غزل کا ہے وہ بھی دیوان اول میں ہے یا نہیں۔

۱۸ دسمبر ۱۸۴۸ء کے اسعد الاخبار میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ :

”ان دنوں میں دیوان تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے

اور یہ وہی دیوان ہے، جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا

تھا۔ بہ سبب عدم الفرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی۔“

دیوان تفتہ کے بارے میں اس اشتہار پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :

”اواخر ۱۸۴۷ء میں دیوان کا اشتہار چھپا تھا؛ مگر دیوان اس وقت کس شکل میں تھا اس کا

مطلق علم نہیں، قیاس چاہتا ہے کہ مکمل ہوا مجھے قاضی صاحب کے اس خیال سے اتفاق

ہے کہ اواخر ۱۸۴۷ء میں دیوان تفتہ مرتب ہو چکا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ تفتہ کے نام

غالب کا زیر بحث خط اوائل ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تفتہ نے غالب کی اصلاح کو نہیں مانا۔ اور دونوں اشعار دیوان

میں شامل کر لیے۔ اس کا امکان ہے کہ دیوان میں غزلیں شامل کرنے کے بعد غالب کو اصلاح

کے لیے بھیجی گئیں اور غالب نے خط کا جواب اتنی تاخیر سے دیا کہ دیوان کا وہ حصہ چھپ

چکا تھا جس میں یہ اشعار تھے۔ میرے خیال سے ایسا نہیں ہے، اس سلسلے میں میری دلیل

یہ ہے کہ تفتہ کے دیوان اول کا جو نسخہ اس وقت میرے پیش نظر ہے، وہ تفتہ کی ملکیت رہ چکا ہے

کیوں کہ بہت سی غزلوں پر لکھا ہوا ہے۔ ”ایں غزل بعد نظر ثانی در دیوان دوم نوشتہ شد“ بعض اشعار اور بعض مصرع قلمزد کر کے دوسرے لکھے گئے ہیں۔ اگر دیوان اول کی طباعت کے بعد غالب کی اصلاح تفتہ کو ملتی تو دیوان اول کے اس مطبوعہ نسخے پر تفتہ ان اشعار کو قلمزد کر کے اصلاح شدہ اشعار لکھ دیتے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تک غالب کے جتنے اردو خطوط کی بازیافت ہوئی ہے، ان میں قدیم ترین خط وہی ہے، جو تفتہ کے نام ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا۔

جلال الدین صاحب کو ۱۹۷۵ء میں غالب کے سولہ فارسی اور پانچ اردو غیر مطبوعہ خطوط ایک قدیم مخطوطے میں ملے تھے۔ جلال الدین صاحب نے ان خطوط کا تعارف ”ہماری زبان“ نئی دہلی کی ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں کرایا ہے۔ یہ قول اُن کے یہ خطوط فرخ آباد کے نواب تاج حسین خاں، علی حسین خاں ناظم، امانت علی خاں بلخ، امداد علی خاں صاحبزادہ عرف چھوٹے خاں فرخ آبادی اور حکیم امام الدین خاں دہلوی کے نام ہیں۔ اور یہ سب خطوط بہ قول جلال الدین صاحب ۲۵ اپریل ۱۸۴۶ء اور ۱۳ نومبر ۱۸۴۶ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

ان خطوط کا تعارف کرائے ہوئے سات سال گزر چکے ہیں لیکن جلال الدین صاحب نے ابھی تک یہ خطوط شائع نہیں کیے۔ اس لیے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں۔ اگر جلال صاحب انہیں چھاپ کر میرا شبہ غلط ثابت کر دیں تو اردو میں غالب کا پہلا دستیاب خط ۲۵ اپریل ۱۸۴۶ء کا قرار پائے گا۔

# مکتوب نگاری کا فن

مکتوب نگاری فنون لطیفہ کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک باقاعدہ بلکہ اور فنون کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور زیادہ شائستہ فن ہے۔ اسی لیے بعض اہل قلم نے اسے لطیف ترین فن کہا ہے۔ اور فنون کی طرح اس فن میں بھی بہترین نقوش وہی ہیں جو خونِ جگر سے ابھارے گئے ہیں۔ دوسرے فنون لطیفہ کی طرح اس میں بھی خاتمہ خوں چکاں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے بہترین مکتوب نگار عام طور سے وہی لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں پر سینے کے بل چلے ہیں اور ان کے خطوط اس سفر کی روداد ہیں۔ ان خطوط میں فنکار کے جادو جگانے والے قلم نے ذاتی و شخصی غم و الم کی داستانوں کو کبھی درد انگیز لب و لہجہ میں بیان کیا ہے اور کبھی طنز و مزاح کے سہارے انھیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ ذاتی اور شخصی تجربوں کو اپنے سلیقے، شائستگی و لطافت اور شخصیت کے رچاؤ سے آفاقیت اور اجتماعیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

اگر کوئی ہمارے ہمسایے کی زندگی کے تمام واقعات من عن سناے تو ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی، بلکہ شاید ہم بور ہو جائیں، لیکن اگر ہم کسی ایسے روزن سے جھانکیں جس کا رخ ہمسایے کے گھر کی طرف ہو اور جس سے ہم اپنے ہمسایے کی نجی زندگی دیکھ سکیں اور اسے زندگی کے معمولی مشاغل میں مصروف دیکھیں تو دلچسپی ہمیں اس روزن سے ہٹنے نہیں دے گی۔



کھڑکیوں، پردوں اور چیمبوں کے پیچھے سے گھنٹوں جھانکتی رہنے والی آنکھیں انسان کی اس فطرت سے مجبور ہیں جو دوسرے لوگوں کے خطوط پڑھنے پر ہمیں اکساتی ہے۔ خود نوشت حالات اور روزنامے بھی دلچسپ ہوتے ہیں لیکن خطوط کا مطالعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، خاص طور پر دوسرے کے خطوط کا۔ خود نوشت حالات اور روزنامے لکھتے ہوئے لکھنے والے کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ایک سے نہیں، ہزاروں افراد سے مخاطب ہے، اس لیے اپنی شخصیت، کردار اور خیالات اور نظریات پر کچھ نہ کچھ پردے ضرور ڈالے رہتا ہے۔ نجی خط صرف دو آدمیوں کا معاملہ ہے۔ عام طور پر مکتوب نگار کو یقین ہوتا ہے کہ خط مکتوب الیہ تک پہنچ کر عدم کی پُر اسرار وادیوں میں گم ہو جائے گا اور اس کا راز ہمیشہ راز رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے بیشتر خطوط اور خاص طور پر محبت نامے جس میں عاشق کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے وجود میں نہ آتے۔ یہ خطوط عام طور سے عاشق اور محبوب میں سے کسی ایک کے یا دونوں کے مرنے کے بعد شائع ہوتے ہیں۔ نپولین جس کی ساری زندگی قتل و غارت گری میں گزری اور انسانی تاریخ میں جس کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ مختلف زبانوں میں اس پر تیس ہزار سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جب اپنی محبوبہ جوزفین کو خط لکھتا ہے تو اس کا جسم اور روح دونوں دو زانو ہو جاتے ہیں اور وہ ایک عام انسان نظر آنے لگتا ہے۔ نپولین کے وہ خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اس نے اٹلی سے جوزفین کو لکھے تھے۔ اس وقت وہ کمانڈر کی حیثیت سے انسانی خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ اگر یہ خط گم ہو جاتے تو شاہد ہمیں کبھی یہ اندازہ نہ ہوتا کہ نپولین جیسے ظالم اور جابر کے سینے میں بھی انسان کا دل تھا۔ وہ بھی کسی انسان کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے پورے سماجی کردار کی نفی کر سکتا تھا۔ اور جس لطیف کے لیے اس کے احساسات اور جذبات بھی ایسے ہی نازک اور لطیف تھے جیسے محبت کرنے والے سر پھرے دیوانوں کے ہوتے ہیں۔ اردو میں اس کی مثال علامہ شبلی ہیں۔ اگر عطیہ کے نام ان کے خطوط ضائع ہو گئے ہوتے تو ہمیں

کبھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شبلی جیسے عالم اور "الفاروق" و "سیرت النبی" کے مصنف کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی تھا۔ اُن کا ایک ایسا کردار بھی تھا جو اُن کے تمام سماجی کردار کے متضاد تھا۔ عطیہ یورپ سے واپس آتی ہیں تو شبلی انہیں لکھتے ہیں :

"ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے مراجعت پر مبارک باد قبول ہو۔ میری زندگی کا یہ سخت المناک واقعہ ہے کہ مبارک باد میرے لب کے بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہے۔ . . تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک مختصر مدیہ ہے۔ کیا تم ان دونوں حقیر چیزوں کو قبول کر سکتی ہو؟ شہنشاہ ایڈورڈ اور پریزیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبے سے اتر نہیں سکتا، ہاں یہ صحیح ہے لیکن یاد رکھو، آفتاب ذرہ پر بھی چمکتا ہے۔ میں خود نہ آسکا لیکن عن قریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی۔"

عطیہ کو آفتاب اور خود کو ذرہ کہنے والا، یہ وہ شخص ہے جو اپنے عہد کی بعض اہم ترین ہستیوں کی عظمت سے منکر تھا۔

نپولین، ہنری شتم، مادام دوہیری، ایلزبتھ بیرٹ، رابرٹ براؤننگ، کیٹس، شیلی، باٹرن، وکٹر ہیوگو، گائی ڈی موپاساں، والٹیر، جارج برنارڈشا کے خطوط یورپ کے مکتوبی ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو میں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے بعض خطوط اور شبلی، صفیہ اختر اور سجاد ظہیر کے محبت نامے قابل ذکر ہیں۔

خط شخصی چیز ہے۔ اس میں صرف ایک آواز ابھرتی ہے اور وہ ہے مکتوب نگار کی آواز، جو سونی صدی ذاتی ہوتی ہے۔ یہ آواز مکتوب نگار کی دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے، اس آواز سے بھی، جو مکتوب نگار کی سماجی آواز ہوتی ہے اور اس آواز سے بھی جو اس کے تخلیقی فن میں گونجتی ہے۔ یہ آواز ایک ایسے انسان کی ہوتی ہے جو عظیم فنکار ہوتے ہوئے بھی ایک عام



انسان ہے، اور عام انسانوں کی طرح کھانا پیتا، جاگتا اور سوتا ہے، جو خلوت کدے میں اپنے چہرے اور تہ درتہ شخصیت پر سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ اگر مکتوب نگار کو زندگی کا فہم و ادراک ہے، اگر نبض کائنات پر اس کی انگلیاں ہیں اور اس کی ثروت نگاہی انسانی نفسیات کے پیچ و خم سے واقف ہے تو اس کی آواز آفاقی اور غیر فانی بن جاتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال صرف غالب ہیں۔

زندگی کی طرح خطوں کا دامن بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ ان میں وہ تمام رنگ ہوتے ہیں جو زندگی کی قوس قزح کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان میں ہجر کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، وصل کے مزدے سناتے جاتے ہیں، مصائب و آلام کا ذکر کیا جاتا ہے، ناکامیوں پر اظہارِ غم ہوتا ہے، کامیابیوں پر اظہارِ مسرت ہوتا ہے، مبارک باد دی جاتی ہے، تعزیت کی جاتی ہے، نفرت و محبت، خلوص و ریا اور مہر و وفا غرض ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو مکتوب نگار اپنی ذاتی غرض سے لکھتا ہے اور ایسے بھی جن سے دوسروں کی سہلائی مقصود ہوتی ہے۔ خطوط میں کبھی انسان غیظ و غضب میں بھرا ہوا شیر نظر آتا ہے اور کبھی اس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو قلم برداشتہ نکھے جاتے ہیں اور ایسے بھی جن میں غور و فکر کے سوسو بناؤ ہوتے ہیں خطوط وہ بھی ہوتے ہیں جو صرف شائع کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں اور وہ بھی خطوط ہیں جنہیں شائع کرنے کی مکتوب نگار کبھی اجازت نہیں دیتا۔ خطوط کئی کئی صفحے کے بھی ہوتے ہیں اور چند لفظوں کے بھی۔ خط کاغذ کے ٹکڑوں پر بکھرے ہوئے محض بے جان الفاظ نہیں بلکہ زندہ شے ہیں۔

یہ بولتے ہیں۔ ایک دھڑکتے دل کی صدا میں دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ مکتوب نگار کا مخاطب کوئی ہو اور وہ کسی بھی عہد کا انسان ہو، وہ اگر اس فن میں کامیاب ہے تو یہ خط زمین پر رہنے والے ہر عہد کے انسان کے لیے ہیں اور جب بھی یہ خط کوئی پڑھے گا اُسے محسوس ہوگا کہ وہ اسی زمانے میں پہنچ گیا ہے اور مکتوب نگار کا مخاطب وہی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دلی اجڑنے کے واقعات



تاریخی کتابوں میں بھی درج ہیں اور غالب نے اپنے خطوں میں بھی لکھے ہیں لیکن خطوط غالب پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دلی سو سال قبل نہیں آج اجڑ رہی ہے اور غالب کے مخاطب میر مہدی مجروح نہیں ہم ہیں۔

غالب نے کئی بار مکتوب نگاری کو بات چیت کہا ہے۔ بالکل یہی بات غالب سے کئی سو سال قبل سروسرو نے کہی تھی۔ ولیم کو پر نے یہی بات ذرا گھما کر کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: ”اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے میں انسان کو ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ ترسیل کا ذریعہ زبان ہو یا خط ان دونوں کی جگہ کوئی اور شے نہیں لے سکتی۔ اس کا مطلب ہے جو شخص بھی اس فن کے رموز سے واقف ہوتا ہے وہ اس راز کو سمجھ لیتا ہے کہ مکتوب نگاری گفتگو کا نعم البدل ہے جو کاغذ اور سیاہی کی ایجاد نے ہم کو دیا ہے۔“ لیکن خط اور گفتگو ایک دوسرے کا سو فی صدی بدل نہیں۔ خط گفتگو سے زیادہ مدلل ہوتا ہے، زیادہ واضح اور زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ اس میں بات سوج سمجھ کر کی جاتی ہے۔

ممکن ہے مکتوب نگار کے پاس ایسی کوئی خبر یا بات نہ ہو جو وہ مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتا ہو، اور اس کا واسطہ ایسے شخص سے ہو جس سے کچھ نہ کچھ باتیں ضرور کرنی ہوں۔ یا یہ قول غالب:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں مختار سے نام کے

ایسی صورت میں خبروں اور اہم باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کہنے کی ہوتی ہیں۔ غالب کا ایک خط ملاحظہ ہو۔ اس میں انھیں صرف یہ کہنا ہے ”یہ کیسے ممکن ہے تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ دوں؟“ بس اتنی سی بات غالب کی زبانی سنئے۔ نشی سناوت حسین کو لکھتے ہیں:

”سُبْحَانَ الْمَدْرِ! آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں، اپنے کو نفرین کروں اگر شتاب

نہ لکھوں۔ اس وقت ڈاک کے ہر کارے نے تمہارا خط دیا۔ ادھر پڑھا ادھر

جواب لکھنے کا قصد کیا۔ میں ایک شخص گوشہ نشین، فلک زدہ، اندوہ گین،

نہ اہل دنیا نہ اہل دین۔ مجھ جیسے نیکے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو، اُس کے خط کا جواب لکھنا کیوں مجھ پر شاق ہو۔ ظاہر اتم خود مجمع حسن اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو میرا اس قدر اشتیاق ہو۔ یاں، ایک بری بھلی شاعری، اُس کا حال یہ کہ آگے جو کچھ کہا سو کہا، اب شاعر بھی نہیں رہا۔ بہر حال تمہاری فقیر نوازی کا شکر گزار اور طالب دیدار ہوں۔“

۴ فروری ۱۸۶۱ء

دیکھا آپ نے؟ کچھ بھی نہ کہا اور سب کچھ کہہ دیا۔ غالب کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن انداز بیان سے بات کو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ ممکن نہیں مکتوب الیہ خوش نہ ہوا ہو۔ اچھے مکتوب نگار کی ایک خاص پہچان یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی حُسن اور خوبصورتی تلاش کر لیتا ہو اور زندگی میں ہونے والے معمولی اور بہ ظاہر ناقابل توجہ واقعات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو۔

اعلیٰ درجہ کے خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ وہ خواہ کتنے ہی نجی کیوں نہ ہوں اور موضوع کے اعتبار سے کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں اُن میں مکتوب نگار کے قلم نے ایسی گل افشائیاں کی ہوں۔ اور مکتوب میں ایسا تنوع، رنگارنگی و بوقلمی اور دلچسپی پیدا کی ہو کہ مکتوب نگار کی داستان ہر پڑھنے والے کی داستان بن گئی ہو۔ جو خصوصیات کسی فن پارے کو ادبِ عالیہ میں جگہ دیتی ہیں، ٹھیک وہی خصوصیات اعلیٰ مکاتیب کے لیے بھی ضروری ہیں، یعنی ہر عہد کے لوگوں کے ذوق کی تشفی کا سامان ان میں موجود ہوتا ہے۔ ادبِ عالیہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر ہر عہد کے انسان کا تعلق اپنے تخلیقی دور سے قائم کرتا ہے۔ یونان کے عہدِ قدیم سے ہمارا تعلق ہو مر کی ایلید اور اوڈیسی کے واسطے سے ہے۔ قدیم ہندوستان سے ہماری جذباتی وابستگی رامائن اور مہا بھارت کی وجہ سے ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تصویر ہمارے ذہنوں میں وہ ہے جو غالب نے پیش کی ہے۔

خطوں کی اہمیت صرف ان کے موضوعات ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اُن کے

اسلوب کی بھی اہمیت ہے۔ رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث خاں بے خبر کے خطوط میں بھی تنوع مضامین ہے۔ ان میں بھی اپنے عہد کی تصویریں ملتی ہیں۔ لیکن یہی تصویریں سرور اور بے خبر کے مکاتیب میں مدہم اور غیر دلکش ہیں، غالب کے ہاں جیتی جاگتی اور دلاویز نظر آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالب کے کمال فن نے ان میں زندگی ڈالی ہے۔ خطوط غالب کی زبان اور اسلوب نہ صرف اردو کے اعلیٰ ترین مکتوباتی ادب کا نمونہ ہیں بلکہ پوری اردو نثر کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ اسی لیے ممکن نہیں کہ اردو نثر کی کوئی تاریخ نکھی جائے اور اس میں خطوط غالب کا ذکر نہ ہو۔

سوانح نگاری کے بہترین مآخذ خطوط ہوتے ہیں فنکار کے خاندانی حالات اس کی زندگی کے بیشتر واقعات، اُس کے عقائد و نظریات، اس کی سیرت و شخصیت کا پورا علم ان ہی خطوط سے ہوتا ہے۔ فنکار اپنے پیش رو فنکاروں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، اپنے ہم عصروں کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اپنے فن اور خود اپنی ذات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، یہ سب بہت واضح انداز میں تو فنکار کے خطوط میں، اور اکثر ذرا مبہم آپ بیتوں اور روزناموں میں ملے گا۔

خطوط کی ادبی اہمیت کسی طرح بھی تخلیقی کارناموں سے کم نہیں۔ جس طرح ادب کی مختلف اصناف سخن کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح خطوط بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، بلکہ بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ اختصار کی وجہ سے اس صنف کو نثر کی دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے اور لوگ ناول اور افسانے کے مقابلے میں خطوط کا مطالعہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔

بعض لوگ محض اپنے خطوط کی وجہ سے زندہ ہیں۔ بیگمات اودھ کے خطوط اگرچہ دوسرے اوتیسویں درجہ کے ہیں اور اکثر خطوط دوسرے لوگوں سے نکھوائے گئے ہیں لیکن ان بیگمات کا نام اردو ادب میں صرف ان خطوط کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ اگر غلام غوث خاں بے خبر اردو میں خط نہ لکھتے تو تاریخ ادب اردو میں ان کا نام صرف غالب کے مکتوب الیہ کی حیثیت ہی سے



آتا۔ غالب کی مقبولیت کا راز اُن کے اردو خطوط میں بھی ہے۔ حالی نے ذرا مبالغے سے کام لیتے ہوئے یادگار غالب میں لکھا ہے :

”جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوتی ہے ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوتی۔“

میتھیو آرنلڈ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ : ”کارلائل ان مضمونوں اور تاریخوں کے بل پر انگریزی ادب میں زندہ نہیں رہے گا جن سے پوری الماری بھری ہوتی ہے بلکہ وہ بیش قیمت مراسلت جو اس کے ادراک میں ہوتی تھی، اُس کے سر پر بقاءے دوام کا تاج رکھے گی۔“

مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر کسی مکتوب کے لکھے جانے کا کوئی محرک نہ ہو یا وہ کسی خط کے جواب میں نہ لکھا گیا ہو تو اسے مکتوب کہنا بہت مشکل ہے۔ ہر اس تحریر کو جو خط کی فارم میں لکھی گئی ہو مکتوباتی ادب میں جگہ دینا مناسب نہیں، کیوں کہ بعض اوقات اس فارم میں انشا پردازی کے جوہر بھی دکھائے جاتے ہیں یا اُن کی تحریر کا محرک کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔ اردو میں ابوالکلام آزاد کے خطوط، قاضی عبدالغفار کے ”بیلی کے خطوط“ کا محرک وہ نہیں تھا جو خط لکھنے کا ہوتا ہے۔ آزاد کے خطوط اچھے انشائیے ہیں، اسی طرح ”بیلی“ کے خطوط دلچسپ ناول کی تکمیل کرتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی (DISCOVERY OF INDIA) تاریخ کی الماری میں رکھی جائے گی۔ جانسن کے بعض خطوط جو اُس نے چیٹر فیلڈ کے نام لکھے ہیں، مولانا آزاد کے خطوط کے ساتھ رکھے جائیں گے۔

مکاتیب کا ادبی مرتبہ کچھ بھی ہو، وہ بُرے ہوں یا اچھے، عظیم آدمی کے ہوں یا معمولی انسان کے، ادیب اور شاعر کے ہوں یا سیاست داں کے، ان میں ادبی خوبیاں ہوں یا نہیں، لیکن فن تاریخ نویسی کے نقطہ نظر سے اُن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کوئی مورخ اس عہد میں

لکھے گئے خط کو نظر انداز نہیں کر سکتا، جس عہد کی وہ سیاسی اور سماجی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ ذاتی خطوط اور خاصاً اقتدار کے کاروباری خطوط سے انتہائی اہم مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خطوں کے ذریعے ہی ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ واقعات جو تاریخی کتابوں کی زینت ہیں، کبھی زندہ حقیقت بھی تھے۔ تاریخی واقعات معلوم کرنے کے ماخذ اور بھی ہیں لیکن یہ جاننے کے لیے کہ ان لوگوں کا رد عمل کیا تھا جو ان واقعات کے ذمہ دار تھے اور وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے جن پر ان واقعات کا اثر ہوا تھا، ہمیں ذاتی خطوں، روزناموں اور آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ایک حساس ذہن پر کیا اثر ہوا، دلی کی تباہی اور بربادی نے ایک شاعر کے قلب و ذہن کو کس طرح متاثر کیا، اگر یہ معلوم کرنا ہے تو کوئی تاریخی کتاب آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ البتہ میر تقی میر کی ”ذکر میر“ میں یہ تاثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ملیں گے۔ مرزا مظہر اور شاہ ولی اللہ کے خطوط میں بادشاہوں امیروں اور رئیسوں کی بالتفصیل داستانیں تو نہیں ملیں گی لیکن ان کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اس عہد کے ذہن انسان کے تاثرات ضرور ملیں گے۔ خطوں اور روزناموں میں فنکار جس طرح چاہے حکایتِ خوں چکاں لکھے، اس میں ہاتھ قلم ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔

مکتوب نگاری کا فن آسان ترین فن ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ کسبِ فن کی ضرورت نہیں، کسی استاد سے صلاح مشورہ بھی ضروری نہیں۔ موٹی موٹی کتابوں کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے یہ جاننے کی بھی ضرورت نہیں کہ آپ سے پہلے اساتذہ اس فن میں کیا کیا کمالات دکھا گئے ہیں پھر بھی خط کے لیے قلم اور دوات سے زیادہ اور کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔ غزل کی طرح خط لکھنا بہت آسان ہے، لیکن ایک اچھا خط یا اچھی غزل لکھنا بہت مشکل ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لکھا ہوا خط اہم ہو اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر عظیم مکتوب نگار کے تمام خطوط ایک ہی درجے کے ہوں۔ آج ہر روز ڈاک سے کروڑوں بلکہ اربوں خط ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ ان میں کتنے خط ہیں جو مکاتیبی ادب ہیں



جگہ پاسکیں گے۔ شاید مہینوں بلکہ برسوں میں دو یا تین۔ اس بات کو ایچ۔ ڈی۔ تھورونے ذرا مختلف انداز میں یوں کہا ہے: ”جہاں تک خطوں کا تعلق ہے پوسٹ آفس کے بغیر بھی میرا کام چل سکتا ہے، کیوں کہ ساری زندگی میں مجھے صرف ایک یا دو خط ایسے ملے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر محسوس ہوا کہ ڈاک کے پیسے وصول ہو گئے۔“

مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی قدیم ہے جتنی فنِ تحریر کی۔ کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درخت کے پتوں، دھات کی پلیٹوں، چمڑوں اور مٹی کی لوحوں پر لکھتا تھا تب بھی خط لکھے جاتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مغربی ایشیا کے حکمرانوں کی خط و کتابت مصر کے فراعنہ سے تھی۔ ۱۸۸۶ء میں بحرنا کے مقام پر کھدائی کے دوران تین سو مٹی کی لوحیں نکلی تھیں جن پر فراعنہ کے نام خطوط کندہ تھے۔ یونان کے زرمیہ نگار ہومر اور مورخ ہیرودوٹس کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ انسانی تاریخ میں یہ اعزاز اہل روم کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنائیں ادبی مورخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں روم کے قابل اور پڑھے لکھے لوگ بہت دور واقع صوبوں کی گورنری کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اپنے صوبے کے حالات بتانے اور روم کے حالات جاننے کے لیے خط و کتابت ناگزیر تھی۔ سروساںی عہد کا مکتوب نگار ہے۔

جب اسلام وجود میں آیا تو عرب میں یہ فن غیر ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ خط لکھنا ایک پیشہ تھا۔ اس پیشے کے اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کے عہد میں اس فن نے خاطر خواہ ترقی کی۔ خود آنحضرتؐ کے خطوط موجود ہیں۔ مسلمانوں میں خط و کتابت کی ترقی کے تقریباً وہی اسباب ہیں جو روم میں تھے، یعنی سیاسی ضرورت حضرت عمرؓ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے خط و کتابت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار دارالانشاء قائم کیا۔ ایک مرکزی محکمہ مدینہ میں تھا، باقی تمام صوبوں میں سرکاری سطح پر ایسے محکمے قائم



کیے گئے۔ دارالانشا صرف لائق اور قابل لوگوں کے سپرد ہوتا۔ حضرت عمر کا اصرار تھا کہ صوبہ دار اپنے اپنے صوبوں کے حالات اس طرح بیان کریں کہ پوری تصویر سامنے آجائے۔ چنانچہ صوبہ دار ہمیشہ اس کا خیال رکھتے۔ ابن العاص نے مصر کی فتح پر حضرت عمر کو جو خط لکھا تھا وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اس عہد میں خط و کتابت صرف کاروبار تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے انہیں دنیا کے مکتوباتی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس خط کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

امیر المومنین کا مکتوب گرامی، خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے، ورود فرما ہوا جس میں مجھ سے مصر کے متعلق تفصیلات طلب کی گئی ہیں۔ امیر المومنین ! مصر ایک نہایت زرخیز اور سرسبز دشا داب جگہ ہے۔ اس کا طول ایک مہینے اور عرض دس مہینے کی مسافت ہے۔ اسے ایک خاکی رنگ کے پہاڑ اور خاکسری رنگ کے ایک ریگ زار نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اس کے وسط میں دریائے نیل بہتا ہے جس کا خرام سحر مبارک ہے اور روانی شب مسعود۔ اس کا بہاؤ کبھی تیز ہوتا ہے اور کبھی سُست جیسے آفتاب و ماہتاب کی رفتار۔ مخصوص اوقات میں اس کی لہریں اتنی سفید اور شیریں ہو جاتی ہیں کہ دودھ کی دھاریں معلوم ہونے لگتی ہیں اور مکھیاں ان پر بھنبھناتی ہیں۔ زمین کے چشمے اور تیز رونالے جب اس میں طغیانی پیدا کر دیتے ہیں تو وہ چنگھاڑنے لگتا ہے اور جب اس کی موجیں بلند ہو کر کناروں کو پہنچ جاتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ہلکی ہلکی ڈونگیوں کے سوا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ اور وہ کشتیاں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادلوں میں جنہیں ڈھلتے دن کی چاندنی کہیے، تیر رہی ہیں جب اس کی طغیانی شباب کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جس شان سے چڑھا تھا اُسی شان سے اُلٹے پاؤں اتر جاتا ہے۔ اس وقت

لوگ نکلتے ہیں زمین گود کر اس میں دانہ ڈالتے ہیں اور پروردگار سے اس کے پھلنے اور پھولنے کے اُمید دار ہوتے ہیں۔ جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ بھی بغیر کسی جدوجہد کے اس سے پھل پاتے ہیں۔ جب دانہ پھوٹتا ہے تو نمی اسے پانی پلاتی ہے اور زمین اسے غذا بہم پہنچاتی ہے۔ اور اس وقت یا امیر المومنین، مصر کی زمین رنگ برنگ کے چولے بدلتی ہے۔ ابھی چمکتا موتی ہے تو ابھی عنبر اشہب، ابھی زمرہ سبز ہے تو ابھی گندمی چہرہ۔ پاک ہے وہ خالق کائنات جس نے مصر کو ان نعمتوں سے نوازا اور رونق و آبادی سے امتیاز بخشا۔ البتہ یہاں کسی بڑے آدمی کے متعلق معمولی آدمی کی بات نہیں مانی جاتی، اور یہاں کا خراج وقتِ معینہ سے پہلے وصول نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں کی آمدنی کا تہائی حصہ نہروں اور پلوں کے کام میں صرف ہوتا رہے۔ جب یہاں کے حالات استحکام پذیر ہو جائیں گے تو آمدنی بڑھ جائے گی۔ آغاز و انجام میں خدا سے بزرگ و برتر ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

حضرت عمر سے پہلے حضرت ابوبکر کے زمانے میں حضرت عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابت کاتب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر کے کاتب حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن ابی بن خلف تھے۔ حضرت عثمان یہ کام مروان بن حکم سے لیتے تھے۔ حضرت علی کے عہد میں حضرت عبد بن ابی رافع اور حضرت سعید بن نجران الہمدانی یہ کام کرتے تھے۔ اسلامی حکومتوں میں بنو امیہ اور بنی عباس کے عہد میں اس فن نے خوب ترقی کی اور اس محکمہ کا نام دیوان الانشا پڑ گیا۔ مامون الرشید کے زمانے سے ہی فارسی زبان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ عجمیوں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں سے عربی کو نکال دیا، جس کا اثر فطری طور پر خط و کتابت پر بھی پڑا۔ یہاں سے فارسی انشا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جب ہلاکو خان نے دولتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا تو عربی کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا اور

فارسی انشا کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔

خط لکھنے والوں کو پہلے کاتب کہا جاتا تھا۔ لیکن اب فارسی زبان کے زیر اثر انھیں دوات دار، دبیر اور منشی کہا جانے لگا۔ مسلمانوں میں وزارت کا مستقل عہدہ قائم ہونے تک منشیوں کو بادشاہ سے سب سے زیادہ تقرب حاصل تھا۔

فنِ مکتوب نگاری پر فارسی میں بہت کتابیں لکھی گئیں خطوط کے مجموعے مرتب ہوئے۔ رشید الدین فضل اللہ کے مکاتیب کا مجموعہ منشیاتِ رشیدی کے نام سے مرتب ہوا۔ مولانا عبدالرحمن جامی کے خطوط ”رقعاتِ جامی“ مکاتیبِ ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔

انگریزی کے مکتوب نگاروں میں سب سے پہلے ولیم کوپر اور چارلس ایمب کے نام آتے ہیں۔ یہ دونوں زندگی کے ہنگاموں سے دور تھے لیکن ان دونوں کو خط لکھنے کا شوق تھا۔ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے انھوں نے اپنے خطوط کا مواد حاصل کیا ہے۔ عورتوں میں تھامس کارلائل کی بیوی جین کارلائل اور فرانس کی مادام ڈی سیون نے غیر فانی خطوط لکھے ہیں۔





# شگفتنِ گل ہائے ناز

کسی بھی فن کار کی تخلیقی قوتیں عام طور پر پچاس برس کی عمر کے بعد سلب ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ فنی سطح پر ہمت اور اسلوب میں کچھ اور زیادہ بخشگی اور نکھار پیدا ہو جائے لیکن جہاں تک اُس کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے، جس میں فکر احساس اور جذبہ شامل ہے، فنکار زیادہ تر خود کو دہرانے لگتا ہے۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے، اس پر تو ماہرین نفسیات ہی بہتر طریقے سے روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن عام خیال یہی ہے کہ پچاس کے بعد چوں کہ فنکار کے قویٰ مضحمل ہونے لگتے ہیں، اس لیے جذبے اور احساس میں وہ شدت باقی نہیں رہتی اور فکر کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ تاہم اس عمر میں عقلیت اور قوت استدلال بڑھ جاتی ہے۔ فکر و خیال میں منطقی پہلو زیادہ اجاگر ہونے لگتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فنکار جوش اور ولولے سے محروم ہو جاتا ہے۔ غالب نے اپنی اس کیفیت کا اظہار نظم اور نثر دونوں میں کیا ہے :

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی

یقین ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

یہی بات نثری پیرائے میں ایک خط میں غالب نے ان الفاظ میں کہی ہے :

صناعت شعراء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق  
چاہیے، انگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔ چونسٹھ برس  
کی عمر، ولولہ شباب کہاں؟ رعایت فن، اس کے اسباب کہاں اِنَّا يَدْلُو  
وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ :

بنام چودھری عبدالغفور سرور

شاعری اور خاص طور سے غزل کا حسن، ایجاز و اختصار، رمز و کنایہ، اشاریت،  
اجمال اور آہنگ میں ہے۔ شاعری عام طور سے عقلیت اور منطقی استدلال کی متحمل نہیں  
ہوتی، جب کہ شرط طالبہ کرتی ہے، عقلیت کا فکری اور منطقی استدلال کا اور تفصیل و  
جزئیات اور قطعیت اور عرضیت کا۔

شاعری آرائشِ گفتار کے بغیر ممکن نہیں، اور آرائشِ گفتار کے لیے جس یک سوئی،  
جوش و ولولہ، ذہنی و جسمانی طاقت و صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے، غالب عمر کے  
آخری حصے میں اُس سے محروم ہو چکے تھے۔ اسی لیے وہ شاعری اور خاص طور سے فارسی  
شاعری اور فارسی نثر نگاری سے دامن بچانے لگے تھے۔ حال آں کہ غالب کی زندگی کا  
بڑا حصہ وہ ہے، جس میں ذہنی پریشانیوں نے بھی انہیں شعر گوئی سے باز رکھا۔

غالب کے قلمی مضمحل ضرور ہو چکے تھے، لیکن اُن کے دماغ کی آگ روشن تھی بلکہ کامنا  
کے شعور اور ذات کی آگہی نے اس آگ کو روشن تر کر دیا تھا۔ تجربوں اور مشاہدوں نے فکر  
میں زیادہ پختگی و بالیدگی، احساس میں زیادہ گہرائی اور گیرائی اور جذبات میں ٹھہراؤ پیدا  
کر دیا تھا۔

غالب نے اردو میں خطوط ضرورتاً لکھنا شروع کیے تھے۔ لیکن خطوط نویسی میں اظہار  
کے امکانات نے بہت جلد ان کے اندر چھپے ہوئے اس فنکار کو جگادیا جو ردیف و  
قافیہ کی مشقت سے تھک کر سو گیا تھا۔ پچاس برس کے بعد فنکار کے ذہن، جذبے

اور فکر میں ہونے والی وہ تبدیلیاں جو تخلیقی عمل کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، نشر کے اس نئے وسیع اور کشادہ میدان میں غالب کے لیے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئیں۔ غالب کی نثر نگاری کا آغاز فارسی کی ”پنج آہنگ“ سے ہوا۔ یہ کتاب ۱۸۲۵ء میں مرتب ہوئی تھی لیکن اس کے شائع ہونے کی نوبت ۱۸۲۹ء میں آئی۔ ”پنج آہنگ“ کے ابتدائی دو آہنگوں میں سے غالب نے پہلے آہنگ میں القاب و آداب لکھنے کے طریقوں سے بحث کی اور دوسرے آہنگ میں بعض مصادر، مصطلحات اور فارسی الفاظ کے معنی وغیرہ بیان کیے ہیں۔ باقی تین آہنگوں میں غالب کے اشعار، تقاریظ اور عبارات متفرقہ اور فارسی خطوط کا انتخاب شامل ہیں۔ غالب کی دوسری فارسی کتاب ”مہرِ نیم روز“ ہے۔ یہ خاندان تیموریہ کی تاریخ کی پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد مکمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کا اردو مسودہ غالب کو ملتا تھا اور غالب اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۴ء تک غالب کا نشری سرمایہ فارسی میں یہ دو کتابیں اور خاصی تعداد میں فارسی اور اردو خطوط تھا۔ ۱۸۵۴ء کے انقلاب کی وجہ سے غالب تنہائی اور گوشہ گیری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کہیں سے مولوی محمد حسین تبریزی کی مشہور لغت ”برہانِ قاطع“ اور ”دستیر“ ہاتھ آگئیں۔ زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے اور ذہنی اعتبار سے خود کو مصروف رکھنے کے لیے غالب نے خود کو ان کتابوں کے مطالعے میں غرق کر دیا۔ ”برہانِ قاطع“ کے مطالعے کے دوران انھیں محمد حسین تبریزی سے اختلاف ہوا۔ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ انھوں نے حاشیے پر اختلافات درج کر دیے۔ اس طرح گویا غالب کے علمی کام کا آغاز ہوا۔ ابھی غالب ”برہانِ قاطع“ کا مطالعہ کر ہی رہے تھے کہ انھیں روزنامے کے انداز میں ایک کتاب ”دستنبو“ لکھنے کا خیال آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ”دستنبو“ لکھنے کے لیے انھوں نے ”برہانِ قاطع“ کا مطالعہ شروع کیا ہو۔ الفاظ کی اصل اور ان کے معنی پر غور کرتے ہوئے غالب کو خیال آیا کہ ”دستنبو“ ایسی فارسی میں لکھی جائے جس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہ آئے۔



”دستنبو“ کی تالیف کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ غالب برطانوی حکومت پر اپنی بے گناہی ثابت کریں لیکن انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں انگریزوں پر اپنی فارسی دانی کا سکہ بھی بٹھا دیا جاتے۔ بہر حال بے کاری میں ایک اور مشغلہ ہاتھ آیا۔ کچھ وقت ”دستنبو“ کے لکھنے میں لگا اور کچھ اس کی طباعت کے اہتمام میں۔ کچھ عرصے بعد ”برہان قاطع“ پر اعتراضات ترتیب دے کر ”قاطع برہان“ کے نام سے شائع کیے۔ کتاب کا چھپنا تھا کہ خود غالب پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ بعض اہل علم ”برچھیاں اور بھالے لے کر غالب کی طرف دوڑے پھر تو ایک مستقل مشغلہ ہاتھ آگیا۔ اس معرکے میں غالب نے ”نامہ غالب“ اور ”تیغ تیز“ دو رسالے اپنے نام سے شائع کیے اور دو رسالے ”لطائف عجیب“ میاں داد خاں سیاح کے نام سے اور ”سوالات عبدالکریم“ عبدالکریم کے نام سے شائع کیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے یہ علمی کام زندگی کے اس حصے میں کیا، جب انھیں سب سے زیادہ ذہنی پریشانیوں کا سامنا تھا۔ صحت جواب دے چکی تھی، اور بہ قول اُن کے بے دست و پا ہو چکے تھے۔ یہ سب وقت گزارنے کے مشغلے تھے۔ اس سلسلے کا سب سے اہم مشغلہ تھا خطوط نویسی۔ علمی مشاغل میں مصروف رہ کر غالب کچھ دیر کے لیے خود کو بھول جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے لیکن خطوط کے سہارے تو انھوں نے ایک بزم سجا رکھی تھی۔ جس میں اُن کے عزیز، دوست، معتقد، مداح، ممدوح اور شاگرد سب ہی شریک تھے۔ اس بزم کی فضا اکثر شگفتہ اور تصنع و تکلف سے پاک رہتی۔ غالب ان اہل بزم کو اپنے دکھ درد میں شریک کرتے۔ اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے اور کامیابیوں پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے۔ یہی نہیں بلکہ غالب اس بزم میں شریک ہونے والوں کی خوشی اور غم میں خود بھی برابر کے شریک رہتے۔

غالب کے خطوط کی نشر میں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک منفرد طرز فکر واضح ہے جو موج تہ نشین کی طرح جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان

خطوط میں غالب کی خلافتانہ صلاحیت، اور شر کے ہم آہنگ متوازن شاعرانہ صناعی بھرپور امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں تجربات اور احساسات کی رنگارنگی ہے۔ اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوطِ غالب اُس عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی، سماجی اور تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردِ عمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں، شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔ غرض انسان کی روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل کی گونج بھرپور طریقے پر اردو نشر میں پہلی بار خطوطِ غالب ہی میں سُنائی دیتی ہے۔

وہ غالب جو شاعری میں پوری کائنات سے مبارزہ طلب ہے اور ہر بڑی طاقت سے نبرد آزما ہے خطوط میں اپنی معمولی ضرورتوں اور احتیاجوں کے حصار میں گرفتار نظر آتا ہے، وہ اہل ثروت کے سامنے کاسہ گدائی لیے کھڑا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے دربار میں گزر گزرا کر دُعائیں دے رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے ”خدا حضرت کو سلامت رکھے، مجھ سے اپنا بیج نکلتے کو بہ عوضِ خدمت تنخواہ دیتے ہو۔“ اور کبھی عرض کرتا ہے ”مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے مگر حضور، جو عطا فرمانا ہے جلد ارشاد ہو۔“

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہیں کہ ہم

لئے پھر آتے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

شاعری میں خود بینی و خود داری کا یہ عظیم تصور پیش کرنے والا انسان انگریزوں کے ہندوستانی منشی کی خوشامد میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ غلامِ نحوٹ خاں بے خبر دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعر ہیں۔ چوں کہ صوبہ غرب و شمال کے لفٹننٹ گورنر کے میرِ منشی ہیں، غالب انھیں لکھتے ہیں :

” اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔ ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے

خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لاتے۔“

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء

امیر خسرو کے علاوہ غالب ہندوستان کے کسی اور فارسی شاعر کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے ایک شاگرد اور تیسرے درجے کے شاعر نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے، وہ مجھ سے سن لیجئے اور میرے داد دینے کی داد دیجئے۔ مولانا قلیق نے متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفق اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری متاخرین یعنی صائب و کلیم و قدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔“

غالب نے شاعری میں اپنی ایک تخیلی اور مثالی شخصیت کا بُت تراش رکھا تھا۔ لیکن خطوط میں ہمیں جو شخصیت نظر آتی ہے، اُس میں انسانی کردار کی بلندی بھی ہے اور پستی بھی۔ خود داری اور خود نگری بھی ہے اور خوشامد، تملق اور دریوزہ گری بھی۔ حق و صداقت بھی ہے اور دروغ گوئی و مصلحت کوشی بھی۔

دن پھر طوافِ کوئے ملامت کو جاتے ہے

پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

کی تفسیر بھی ان خطوط میں نظر آتی ہے۔

تہی دستی، مفلسی، ناقدری، بے عزتی اور ناکامی غالب کی حسرتِ تعمیر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔ زندگی کے آخری لمحوں تک وہ زندہ رہنے کے لیے جہاد کرتے رہے۔

اگر غالب میں غیر معمولی قوتِ ارادی اور زندہ رہنے کا سلیقہ نہ ہوتا تو وہ مرنے سے بہت پہلے مر گئے ہوتے۔



ان خطوط میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں، دلکشیوں، بلندیوں، پستیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ شاعری میں غالب کی آواز ہمیں کافی دور سے سنائی دیتی ہے، لیکن خطوط میں وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہم سے محو گفتگو ہیں۔ شاعری میں وہ ہمارے دکھ درد اور ہماری نفسیاتی الجھنوں کا مداوا ایک مفکر، فلسفی، صوفی اور ایک اخلاقی مصلح کی حیثیت سے کرتے ہیں لیکن خطوط میں وہ ایک حقیقت پسند اور عملی انسان کی حیثیت سے ہمارے دکھ درد اور خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں ایک منطقی دماغ کا نہیں بلکہ ایک حساس اور دھڑکتے ہوئے دل اور سانس لیتی زندگی کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اگر صرف اُن انگریز عہدیداروں کے حالات کا جائزہ لیا جاتے جن سے غالب کے تعلقات تھے یا جن سے پنشن کے سلسلے میں غالب نے رابطہ قائم کیا تھا تو انیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اگر ان فارسی شاعروں اور لغت نویسوں کا تذکرہ مرتب کیا جاتے جن کا ذکر غالب کے خطوط میں آیا ہے تو فارسی ادب کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو جائے گی، جس میں فارسی کے اہم ترین ایرانی اور ہندوستانی شعرا کا ذکر ہوگا۔ اسی طرح اردو شاعروں اور ادیبوں کا بھی نسبتاً ایک مختصر سا تذکرہ ان خطوط کی بنیاد پر مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم صرف ”دستنبو“ اور غالب کے خطوط کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا مطالعہ کریں تو اس سے متعلق بیشتر اہم واقعات اور شخصیتیں ہماری نظر میں آجاتی ہیں۔ اس لیے غالب کے عہد کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے مطالعے کے لیے بھی خطوط غالب اہم ترین مآخذ ہیں۔ غالب کے عہد کی بعض ریاستوں مثلاً رام پور، بیکانیر، الور، بھرت پور، فیروز پور، لوہارو، حیدرآباد، اودھ، بے پور، باندہ وغیرہ کے حالات پر بھی غالب کے

خطوط سے کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔

غالب کی گفتگو میں جو خود اعتمادی اور ان کی شخصیت میں جو تاب و توانائی ہے، اس کے لیے شخصیت کا منفرد ہونا ضروری ہے اور منفرد شخصیت اسی کی بنتی ہے، جس نے اپنی انا کی نگہ داری کی ہو۔

خطوط غالب کے جلوہ صد رنگ میں سب سے زیادہ تیکھا اور شوخ رنگ غالب کی انا اور انفرادیت کا ہی ہے۔ انفرادیت تو ہر انسان کی ہوتی ہے لیکن عام انسانوں کی انفرادیت کی لواٹنی مدہم ہوتی ہے کہ مخصوص سماجی گروہ یا طبقے کی اجتماعی انفرادیت کی تیز روشنی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور صرف انسانی نفسیات کے ماہرین نفسیات ہی اس دبی ہوئی اور کمزور انفرادیت کو تلاش کر پاتے ہیں۔

انفرادیت کو فروغ انا سے حاصل ہوتا ہے جس انسان کی انا میں جتنی زیادہ قوت ہوگی اتنی ہی اس کی انفرادیت بلند ہوگی، انا کے سرچشمے مختلف ہیں۔ خاندانی وقار، علم و فن، سیاسی اقتدار اور دولت وغیرہ۔ انا سے انفرادیت حاصل ہوتی ہے اور انفرادیت سے شہرت اور عزت۔ شہرت فرد کے سماجی گروہ تک محدود رہے گی یا پورے ملک میں پھیلے گی یا زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہوگی، اس کا انحصار انفرادیت کی قوت پر ہوتا ہے۔ فرد میں انفرادیت کی لے جتنی زیادہ تیز ہوگی، اتنی ہی اس کی شہرت ہوگی۔ غالب کی انا میں زبردست توانائی ہے۔ اور اس انا کے سرچشمے تین ہیں۔ خاندانی وقار، مہارت فن اور فارسی دانی۔ جاگیر داری نظام میں خاندانی برتری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لہذا فرد کی قدر و قیمت اُس کی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ اُس کے حسب نسب پر ہوتی ہے۔ غالب کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے خاندان کے سلسلے میں دروغ گوئی سے بھی کام لینا پڑا۔ یہ قول قاضی عبدالودود :

”غالب نے پہلے اپنے کو ترک ایک افراسیابی النسل کہا اور بغیر اس کے کہ

اس کی تردید کریں، سلجوقیوں کو ہنگو نر کا دعوے کیا، اس کے بعد اپنے کو سلجوقی کہا اور بالآخر سنجر و برکیارق کی اولاد ہونے کے مدعی ہوئے۔۔۔۔ ڈاکٹر یوسف حسین کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے کہ غالب اور بک تھے۔ ہند میں اس کے ساتھ خوشگوار تصورات وابستہ نہیں، ذہن ایک کی طرف گیا، جو اور کچھ نہیں تو اس کا قافیہ ہو سکتا تھا!

فارسی دانی کا لوہا منوانے کے لیے غالب نے "قاطع برہان" کا فضیلتا کھڑا کر دیا۔ یہ غالب کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ اور غالب پر بہت زیادہ حملے ہو رہے تھے، لیکن غالب نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ معرکہ ادبی مباحث سے گزر کر گالی گلوچ تک پہنچا اور نوبت یہاں تک آئی کہ غالب کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اگرچہ "برہان قاطع" پر غالب کے کافی اعتراضات بے بنیاد تھے۔ لیکن یہ ادبی معرکہ غالب کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

فارسی پر غیر معمولی قدرت ثابت کرنے کے لیے غالب کو کبھی کبھی اپنے مزاج کے خلاف پٹیرے باز یوں سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً انھوں نے "دستنبو" بہ قول اُن کے خالص فارسی قدیم میں لکھی ہے۔ اس کے بارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۷ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نشر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جاتے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔"

ہندیم اگست ۱۸۵۷ء

پوری احتیاط کے باوجود عربی کے کچھ الفاظ "دستنبو" میں شامل ہو ہی گئے۔ فارسی زبان پر اپنی غیر معمولی قدرت ثابت کرنے کے لیے اگر غالب نے "دستنبو" اور "قاطع برہان" جیسی کتابیں لکھیں یا دوستوں اور شاگردوں کے نام خطوں میں ہندوستانی



فرہنگ نویسوں اور شاعروں کو جو بُرا بھلا کہا اور گالیاں دیں تو چلیے کوئی بات نہیں۔  
 ستم یہ ہے کہ غالب نواب کلب علی خاں سے الجھ گئے اور یہ نہ سوچا کہ اگر نواب صاحب نے  
 ناراض ہو کر تنخواہ بند کر دی تو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ ہوا یہ کہ غالب اور نواب  
 صاحب میں کچھ فارسی الفاظ پر بحث ہو گئی۔ نواب صاحب نے ایک خط میں غالب کو  
 لکھا کہ "ارتنگ و ارتنگ" متحر المعنی ہیں اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلہ  
 بنانے کے معنی میں آتا ہے۔

غالب نے نواب صاحب کو اس کے جواب میں لکھا :  
 "فقیر اشعار قدما کا معتقد، اُن لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جولغات اُن کے  
 کلام میں ہیں، اُن کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں، میں  
 اُن کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں۔ اب جو پیر و مرشد لے لکھا کہ "ارتنگ و  
 ارتنگ" متحر المعنی اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلہ بنانے  
 کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا، لیکن نہ اُن صاحبوں کے  
 قیاس کے بہ موجب، بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق" ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء  
 ظاہر ہے کہ اس خط کا نواب صاحب پر بُرا اثر ہوا۔ انھوں نے غالب کی تنخواہ تو  
 بند نہیں کی لیکن پھر اپنی نشر اصلاح کے لیے غالب کو کبھی نہیں بھیجا۔

غالب وبائے عام میں نہیں مرنا چاہتے۔ وہ جب ڈاڑھی منڈواتے ہیں تو سر پر بھی اُسترا  
 پہرہ لیتے ہیں۔ انھیں اپنی وہ ہیئت و حالت قطعی پسند نہیں تھی، جو عوام الناس کی ہو۔  
 خط کے لفافوں کے انتخاب میں بھی ان کی انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ انھیں  
 منشی شیونرائن آرام کے بھیجے ہوئے لفافے صرف اس لیے پسند نہیں کہ اُن پر عام  
 انداز میں "بہ مقام" اور "در مقام" اور "ماہ و تاریخ" چھپا ہوا ہے۔

یہ غالب کی انا ہی تھی جو انھیں دوستوں کو بار بار یہ لکھنے پر مجبور کرتی تھی کہ خط کے

پتے پر صرف اُن کا نام اور دلی لکھا جاتے۔ اگر کوئی پتا ذرا تفصیل سے لکھتا تو ناراض ہو جاتے بعض اوقات اپنی ناراضگی کا اظہار بہت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ایک دفعہ علائی کی جو شامت آئی تو غالب سے اُن کا پتا پوچھ لیا۔ غالب تو بھڑک اُٹھے۔ علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امر د کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اُس سے قطع نظر نہ کرو اور اُس مسخرے کو گناہ و ذلیل نہ سمجھ لو تو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں، ہزار بار خط اطرافِ جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خط فارسی اور انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آتے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھاں نہ لکھا جاتے، ہر کارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف ”دہلی“ لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجے خط کے پہنچنے کا میں ضامن“ ۳ اپریل ۱۸۶۱ء

نواب انور الدولہ نے غالب کا پتا ذرا تفصیل سے لکھ دیا۔ دیکھیے گل افشانی گفتار: ”خط کا عنوان دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید شہر کے محلات کی کوئی فہرست یا پروسیوں کے جمع و خرچ کا حساب ہے۔“ (فارسی سے ترجمہ)

غالب کی یہی آنا اُن کے خطوط میں بے شمار روپ دھارے نظر آتی ہے یہی انفرادیت  
ایک طرف حسین نگار خانوں کی تخلیق کرتی ہے تو دوسری طرف اردو کو ایک نئے آب و  
رنگ اور نئے تب و تاب سے آشنا کرتی ہے۔

## القاب و آداب

غالب نے نواب انور الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھا ہے :  
” پیرو مرشد ! یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ

میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔“ ۲۹ جون ۱۸۵۶ء

ہمارے بعض ناقدوں نے غالب کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ غالب نے  
خطوط میں القاب و آداب لکھنا ترک کر دیا تھا۔ خطوط غالب کے مطالعے سے یہ بات  
غلط ثابت ہوتی ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام غالب نے ایک سو تیس خطوط میں سے  
صرف بیس خطوط میں القاب نہیں لکھے۔ نواب علامہ الدین خاں علّائی کے نام اٹھاون  
خطوط ہیں جن میں سے صرف چھ خطوط ایسے ہیں، جن میں القاب نہیں لکھے گئے۔ میاں  
داد خاں سیاح کے نام پینتیس خطوط میں ایک خط بھی ایسا نہیں جس میں القاب نہ ہو۔  
میر مہدی مجروح کے نام پچاس میں سے صرف چھ، چودھری عبدالغفور سرور کے نام  
ستائیس میں سے دو، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام پچیس میں سے تین اور  
نواب انور الدولہ شفق کے نام بیس میں سے صرف دو خطوط ایسے ہیں جو القاب سے  
عاری ہیں۔ گویا غالب کے القاب اور آداب کے استعمال کے بارے میں جو کچھ  
ہمارے نقاد کہتے رہے ہیں، وہ درست نہیں۔ دراصل غالب نے شفق کے نام خط  
میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے القاب لکھنا بالکل بند  
کر دیا بلکہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ لمبے لمبے، پُر تکلف اور پُر تصنع القاب کا استعمال



انہوں نے بند کر دیا ہے۔ غالب نے ”پنج آہنگ“ کے آہنگ اول میں اپنا یہ موقف اس طرح بیان کیا ہے :

”مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق پکارتا ہوں (یعنی القاب

نکھتا ہوں) القاب اور آداب اور عافیت حشو زائد ہے“ (فارسی سے ترجمہ)

اردو خطوط میں القاب نکھتے ہوئے غالب کا بالکل یہی رویہ ہے۔ وہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق چھوٹا سا القاب لکھ کر، مطلب کی بات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے، جن میں القاب نہیں لکھے گئے۔

عام طور سے صرف القاب پڑھ کر ہمیں مکتوب الیہ سے غالب کے ذہنی رشتے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان القابوں میں بے تکلفی، بے ساختگی اور گفتگو کا انداز ہے۔ کبھی کبھی یہ القاب خط کے مضمون کے مطابق ہوتے ہیں۔ غالب نے علاقائی کے نام خطوط میں حسب ذیل القاب لکھے ہیں :

”اجی مولانا علاقائی - مرزا علاقائی مولائی - میری جان - صاحب - جانا عالی شان۔

مرزا - میاں - سعادت و اقبال نشان - یار بھتیجے گویا بھائی مولانا علاقائی وغیرہ“

تفتہ کے نام خطوط کے القاب ملاحظہ ہوں :

”مہاراج - بندہ پرور - کاشانہ دل کے ماہ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ۔

نور نظر و نخت جگر - اجی مرزا تفتہ - بر خوردار - میرے مہربان“

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں جو القاب لکھا ہے، اُس سے خط کے مضمون کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں : ”جو یاے حالِ دہلی و الور سلام لو“ اور یہ صرف القاب ہی نہیں بلکہ ایک موضوع مصرع بھی ہے۔

غالب اپنے چھوٹوں کو مہاراج - سید صاحب - میاں - صاحب - سید -

فرزندِ دل بند - مرزا - میری جان - بر خوردار - بھائی، نور چشم - راحتِ جاں - اقبال نشان

جان من - سعادت و اقبال نشان - سعادت نشان و غیرہ جیسے القاب لکھتے ہیں۔  
 جب غالب اپنے ہم عمروں اور ایسے لوگوں کو خط لکھتے، جن کا کچھ سماجی وقار  
 تھا، خواہ وہ غالب کے شاگرد ہی کیوں نہ ہوں، تو غالب القاب میں بے تکلفی سے  
 کام نہ لیتے۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، نواب انور الدولہ شفیق اور شہزادہ بشیر الدین  
 جیسے لوگوں کو پیر و مرشد - بندہ پرور - جناب عالی - قبلہ و کعبہ - قبلہ حاجات اور  
 خداوند نعمت جیسے القاب لکھتے ہیں :

بعض لوگ ایسے بھی تھے، جن کی سماجی حیثیت سے مرعوب ہو کر غالب طویل  
 اور پُر تصنع القاب بھی لکھتے تھے۔ نواب میر غلام بابا خاں کے نام خطوط میں غالب نے  
 اسی طرح کے القاب لکھے ہیں :

” سبحان اللہ تعالیٰ شانہ ما اعظم برہانہ جناب مستطاب ، نواب

میر غلام بابا خاں “

” ستودہ بہر زبان و نامور بہر دریا ، نواب صاحب ، شفیق کرم گستر ،

مرقضوی تبار ، نواب میر غلام بابا خاں بہادر “

” نواب صاحب ، جمیل المناقب ، عمیم الاحسان ، عالی شان ، والا دودمان

زاد مجدکم “

۱۸۵۷ء سے وفات کے وقت تک غالب کو نوابانِ رام پور کے نام سو روپے کی  
 وصولیاتی کی اطلاع کے لیے مہینے میں کم سے کم ایک خط لکھنا ضروری تھا۔ وہ خطوط الگ  
 ہیں، جو غالب نے مزید روپے طلب کرنے یا کلام پر اصلاح یا دوسرے معاملات کے سلسلے  
 میں لکھے ہیں۔ اتنے خطوط میں ہمیشہ ایک نیا القاب لکھنا غالب کے لیے بہت مشکل  
 تھا۔ انھوں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کی وفات  
 کے بعد نواب کلب علی خاں کو اکثر خطوط میں ”حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت لکھا۔

صرف تین چار خطوط میں ”جناب عالی“ ”حضور“ یا ”ولی نعمت آیہ رحمت“ (بغیر حضرت کے) لکھ کر اپنی قائم کردہ روایت سے انحراف کیا ہے۔

کبھی کبھی غالب القاب کو متفق کر کے شروع ہی سے پڑھنے والے کی خط میں دلچسپی قائم کر دیتے ہیں۔ نواب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں ”میری جان۔ خدا تیرا نگہبان“۔ شیخ عبداللطیف بکرامی کو القاب لکھتے ہیں ”میاں لطیف۔ مزاج شریف“۔ میر سرفراز حسین کے نام خط کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں ”میری جان کے چہن۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین“۔ میاں دادخاں سیاح کو ایک خط میں القاب لکھتے ہیں ”سعادت و اقبال نشاں۔ منشی میاں دادخاں“۔

اردو خطوط نویسی کو غالب کی دین یہ نہیں ہے کہ انھوں نے القاب اور آداب لکھنے بند کر دیے بلکہ اُن کی دین یہ ہے کہ ایک تو القاب کو مختصر کیا اور دوسرے القاب کو مکتوب الیہ سے اپنے ذہنی رشتے کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جس کی وجہ سے القاب میں تصنع اور تکلف کے بجائے ایک فطری انداز پیدا ہو گیا۔ اور ”یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے“ جیسی چیزوں سے اردو خطوط کو نجات دلائی۔

## غالب کا آئین نامہ نگاری

غالب نے ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں قاضی عبدالجلیل جنوں کو لکھا ہے :

”دوسرا سبب یہ کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک نکھوں اور کیا نکھوں؟

میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب

ضروری التحریر نہ ہو تو کیا نکھوں“

یہ بات بالکل درست ہے کہ غالب کے خطوط کی بنیاد زیادہ تر مطلب نویسی پر ہے۔



غالب کوشش کرتے ہیں کہ سیدھی سادی اور مختصر زبان میں اس طرح بات کہیں کہ پڑھنے والا فوراً ان کا مافی الضمیر سمجھ لے۔ یہ حیثیت شاعر غالب بہت مشکل پسند اور خاصے پیچیدہ ہیں۔ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے کلام کی اتنی شرحیں لکھی گئیں اور بہت سے اشعار کی شرح لکھتے ہوئے ان کے شارحین کے درمیان خاصا اختلاف بھی رہا۔ پھر خطوط میں غالب اتنی سادگی اور صفائی کیوں برتنا چاہتے ہیں، اس کا جواب غالب نے خود اپنے ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ مرزا علی بخش خاں کو لکھتے سے لکھتے ہیں:

”مطالب بہت زیادہ ہیں اور پیچیدہ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں۔ غور کیجئے کہ میں کیا کہ رہا ہوں۔ میرا مقصود کیا ہے۔ اور آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔“  
(فارسی سے ترجمہ)

غالب نے ایک اور فارسی خط میں مرزا علی بخش خاں کو لکھا ہے:

”جانِ برادر! بات کو خواہ مخواہ طول دینے سے اثر بھی کم رہ جاتا ہے، اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں، اس لیے چاہتا ہوں کہ بات کو مختصر کہ کر مؤثر بناؤں اور سننے والا بھی بات کی تہہ تک جلد پہنچ جائے۔ محض کارِ برآری پر آمادہ کرنا گو کہ مقصد نہیں ہے مگر ایسی صورت میں جب کہ کہنے والا یہ کوشش کرے کہ تحریر تکلم سے اتنی اجنبی نہ ہو کہ تحریر و تکلم میں باہم دگر نسبت اور پیوستگی باقی نہ رہے اور ایک کا عکس دوسرے کے چہرے پر نہ پڑ سکے۔“ (فارسی سے ترجمہ)

اگر کوئی دوست یا شاگرد غالب کو ایسا خط لکھتا جس میں ثرولیدہ بیانی ہوتی اور مطلب کی باتوں کے بجائے ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں کی گئی ہوتیں تو غالب ناراض ہو جاتے۔ میر مہدی مجروح نے ایک خط میں نہ جانے کون سے ایسے واقعات اور کون سی ایسی باتیں

لکھ دیں، جن میں غالب کو دلچسپی نہیں تھی۔ خط پڑھ کر غالب کتنے بے مزہ ہوتے، اس کا اندازہ مجروح کے نام خط کی اس دلچسپ عبارت سے لگائیے:

واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے۔ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا۔ میرا بچھونا مجھ کو ملا۔ میرا حمام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور، کوئی آئیو، کوئی آئیو، فرد ہو گیا۔ میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔

بنام میر مہدی مجروح ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء

غالب خطوط نویسی میں سادگی، بیان پر بہت زور دیتے۔ انہیں خطوں میں پر تصنع اور پر تکلف عبارت ہرگز پسند نہیں تھی۔ غالب نے میر مہدی مجروح کو خط لکھا جس میں سیدھی سادی زبان میں مطلب کی باتیں لکھ دیں۔ خط غالباً مختصر تھا۔ مجروح نے خط کے مختصر ہونے کی شکایت لکھی غالب نے بہت دلچسپ انداز میں اس شکایت کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا، اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ بر خوردار میر میر فرارز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔

کیوں سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور ہاے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔

چاہے اب ہے ابر بے باراں ہے بخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔  
چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ  
ہیں۔ امر ضروری کو نکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمھاری  
خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں دہی  
بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟  
خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو سودے کے ساتھ نہیں لکھی تھی، اب لکھ بھیجی قصور معاف  
کرو، خفانہ ہو۔

بنام میر مہدی مجروح ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء

مرزا حاتم علی قہر نے غالب کو خط لکھا اور اُس میں محدث شاہی روٹوں سے کام لیا۔  
غالب نے اُن کے خط کا جواب دیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قہر کے خط میں پرکھوہ  
الفاظ اور پر تصنع عبارت تو تھی لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی جو غالب کے لیے دلچسپی کا  
باعث ہو۔ جس پر غالب نے برا فروختہ ہو کر لیکن بہت دلچسپ انداز میں اس خط کا  
جواب دیا۔ لکھتے ہیں:

”اگر تم مناسب جانو، تو ایک بات میری مانو، رقعات عالم گیری یا انشاے  
خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اُس میں سے پسند آیا کرے، وہ خط  
میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے  
آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔“

بنام مرزا حاتم علی قہر ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء

اب تک غالب کے خطوط کے جو اقتباسات پیش کیے گئے، اُن سے اندازہ ہوتا  
ہے کہ شاید غالب ”ثوقیہ خطوط“ لکھنے کے خلاف تھے اور انھوں نے اپنے عہد کے مروجہ  
آئین نامہ نگاری کو ترک کر کے صرف مطلب نویسی پر ہی اپنے خطوط کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن



یہ بات سو فی صدی درست نہیں۔ غالب نے بہت بڑی تعداد میں "ثوقیہ خطوط" بھی لکھے ہیں اور اپنے شاگردوں اور دوستوں سے، ایسے خطوط کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ دراصل غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ مکتوب نگار خط میں صرف "مطلب نویسی" کرے، یعنی "اپنے مقصد برآری" کے لیے خط لکھے اور باتیں بھی لکھے لیکن صرف ایسی باتیں کہ جن میں مکتوب الیہ کو دلچسپی ہو۔

غالب ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے لوگ غالب کو صرف مطلب کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہ لکھیں۔ انھوں نے تفتہ اور دوسرے لوگوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ اپنی خیریت کے خطوط بار بار بھیجتے رہا کریں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! اپنے پر لازم کرلو، ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا، دو خط، تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔"

مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

ظاہر ہے کہ جب آدمی اپنی خیریت و عافیت کی اطلاع دینے کے لیے خط لکھے گا تو اس میں صرف مطلب نویسی اور مقصد نویسی کہاں سے آئے گی۔

## خطوط میں مکالمہ نویسی

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کا غالب کی زندگی پر سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ وہ تنہا رہ گئے۔ دوست، عزیز، شاگرد اور دوسرے ملنے والوں میں سے بیشتر مارے گئے، باقی فرار ہو گئے۔ اپنی اس تنہائی کا غالب نے کیسے درد انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

"وہی بالاخا۔۔۔ اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی

آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہر دوں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گئے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟

تفتہ سے خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہوئے اپنی تنہائی کا حال بیان کرتے ہیں:

”مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج ہسینا بھر ہو گیا ہوگا، یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۹ جون ۱۸۵۶ء

غالب نے خطوں کے ذریعے اپنی خلوت میں جلوت اور اپنی تنہائی میں انجمن کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دن کا بڑا حصہ خط پڑھنے، ان کا جواب لکھنے اور لفافے بنانے میں صرف ہو جاتا۔ غالب اپنی اس مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے پر جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔۔۔۔۔ دن اُن (خطوط) کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۷ دسمبر ۱۸۵۶ء

غالب خطوط نویسی کو گفت گو کا بدل سمجھتے ہیں۔ اردو میں باقاعدہ خطوط نویسی سے بہت قبل غالب کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ خط میں تحریر کو تقریر کا آئینہ ہونا چاہیے۔ (غالب نے علی بخش خاں کے نام جس فارسی خط میں یہ بات کہی تھی، اس کا اقتباس پہلے نقل کیا

جا چکا ہے، اردو خطوط میں تو غالب نے بارہا اس بات کو دہرایا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”اسی وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزہ ملا تو دونوں کا جواب لکھ کر روانہ کیا“

بنام میر مہدی مجروح ۷ مارچ ۱۸۵۹ء

ایک اور فارسی خط میں غالب لکھتے ہیں:

”میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جو بھی لکھتا ہوں، اردو میں لکھتا ہوں۔ نہ سخن آرائی نہ خود نمائی۔ تحریر کو گفتگو بنا لیا ہے“ (فارسی سے ترجمہ)

بنام منشی نول کشور جولائی ۱۸۶۰ء

خطوط کے ذریعے اس گفتگو کو غالب ”مکالمہ“ کہتے ہیں۔ مرزا تفتہ کا بہت دن سے خط نہیں آیا۔ غالب ایک خط میں اس کی شکایت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”میں تمہارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو، تمہارا اور اُن کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے، جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو، مکالمہ کیوں موقوف ہے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء

اب خطوط غالب کے کچھ اور اقتباسات ملاحظہ ہوں، جن میں غالب نے مراسلے کو

مکالمہ کہا ہے:

”بھائی! مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ الشریہ دن بھی یاد آئیں گے“

بنام مرزا حاتم علی مہر ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء

”مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا



ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

بنام مرزا حاتم علی قہر ۱۷ اواخر نومبر ۱۸۵۸ء

”بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کوہے، مکالمہ ہے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء

”یہ میں باتیں کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف

نہیں جو مکالمہ زبانی میں ہوتا ہے۔ یعنی میں ہی بک رہا ہوں تم کچھ نہیں کہتے“

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء

یہ چار اقتباسات اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ خطوط میں غالب نے جو ”مکالمہ“ کا لفظ

استعمال کیا ہے، اُسے بعض نقادوں نے ڈرامے کے ڈائیلاگ کے مفہوم میں سمجھ کر یہ

ثابت کیا ہے کہ غالب نے خطوط نویسی کو مکالمہ یعنی ڈائیلاگ بنا دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔

مکالمے سے غالب کی مراد محض ”گفتگو“ ہے۔ جیسا کہ ان چاروں اقتباسات سے ثابت

ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالب نے خطوط میں باقاعدہ مکالمے بھی لکھے ہیں مگر سینکڑوں

خطوط میں سے صرف چار یا پانچ میں غالب نے اپنی بات مکالمے کے انداز میں بہت

خوبصورت طریقے سے کہی ہے اگر یہی باتیں بیانیہ انداز میں کہی جاتیں تو شاید ان میں وہ

لطف نہ پیدا ہوتا۔ پیر جی سے غالب کی جو گفتگو ہوتی تھی اُسے کس خوبصورت پیر سے میں

بیان کرتے ہیں:

”پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں ”کیا کہنا ہے“

اور میں پوچھتا ہوں ”کس کا؟“ تو وہ فرماتے ہیں ”مرزا شمشاد علی بیگ کا“

ایں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں۔

میرا سنگھ موجود ہے۔

واہ صاحب! میں کیا خوشامدی ہوں، جو منہ دکھی کہوں میرا شیوہ

حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے۔

ہاں صاحب ! آپ ایسے ہی وضع دار ہیں۔ اس میں کیا ریب ہے۔

بنام نواب علاء الدین خاں علائی ۹ ستمبر ۱۸۶۲ء

ایک خط میں صرف تین مکالمے ہیں۔ باقی بات کہی گئی ہے۔ غائب کہتے ہیں کہ

محمد علی بیگ آئے تو میں نے اُن سے لوہارو کی سواریوں کے بارے میں پوچھا :

”بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟“

حضرت ! ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔“

بنام نواب علاء الدین خاں علائی یکم جون ۱۸۶۱ء

ان مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غائب کی تحریروں میں شعوری کوششوں کو دخل نہیں

ہے۔ خط لکھتے لکھتے مکالموں کا انداز سمجھ میں آیا اور جہت لکھ دیے۔ لیکن میر مہدی مجروح

کے نام ایک خط میں غائب نے طویل مکالمہ لکھا ہے۔ اس مکالمے کا آغاز ان الفاظ سے

ہوتا ہے ”اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم“ اس مکالمے میں چوں کہ شعوری کوشش کو

دخل ہے۔ اس لیے اس میں تصحیح آگیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ غائب نے اس طرح کے

مکالمے اور نہیں لکھے۔

## غائب کا ہے اندازِ بیاں اور

اسلوبِ زبان کے اس غیر روایتی اور غیر رسمی استعمال کا نام ہے جو زبان کے عام اور مخصوص

معیار سے مختلف ہو۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جاتے کہ ”اُن کا انتقال ہو گیا“ تو گویا یہ زبان کا

روایتی اور رسمی استعمال ہے۔ اس میں کسی کی وفات کی اطلاع دینے کے لیے مخصوص معیاری

الفاظ سے فقرے کی ساخت ہوتی ہے۔ یہی بات جب غالب ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

”ہائے ہائے وہ نہ بچی“

تو اس میں غالب کا اپنا اسلوب بھی شامل ہو گیا۔ اب یہ محض اطلاع نہیں رہی بلکہ اس میں غالب کی نفسیاتی، سماجی اور ادبی شخصیت بھی شامل ہے۔ مرنے والی سے غالب کا ذہنی رشتہ، منشی نبی بخش حقیر (جن کے نام خط میں یہ فقرہ لکھا گیا) سے غالب کے تعلقات، غالب کا احساس اور جذبہ، اس موقع پر استعمال ہونے والی مخصوص معیاری زبان سے انحراف، لفظ ”ہائے“ کا استعمال، اور پھر ”ہائے“ کی تکرار، اس کا انتقال ہو گیا“ کے بجائے ”وہ نہ بچی“ لکھنا۔ غرض ان سب چیزوں نے مل کر اس چھوٹے سے فقرے کو ایک اسلوب دیا ہے۔

یہاں زبان کے اُن تمام اجزاء کا جائزہ لینا ممکن نہیں، جن سے اسلوب بنتا ہے مختصراً یہ کہ زبان کی مخصوص صرفی و نحوی ترتیب مفہوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال بعض ایسے الفاظ کا استعمال جو متروک ہو گئے ہوں، یا زبان میں کم استعمال ہوتے ہوں یا ”نہیں“، صرف گفتگو میں مستعمل ہوں۔ کسی دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال، الفاظ کی تکرار، بعض کلیدی الفاظ کا بہ کثرت استعمال اور صنائع و بدائع سے مل کر کسی شاعر یا ادیب کا اسلوب بنتا ہے۔

اسلوب تحریر میں بھی ہوتا ہے اور تقریر میں بھی۔ اور دونوں کی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ گفتگو میں قواعد زبان اور صرف و نحو کی پابندی اس طرح نہیں کی جاتی جس طرح تحریر میں کی جاتی ہے۔ گفتگو میں عام طور سے فقروں کی صرفی و نحوی ساخت بہت زیادہ بدل جاتی ہے، کیوں کہ بولنے والا آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں اور چہرے کے آثار چڑھاؤ سے بھی اپنے مقصد کے اظہار میں مدد لیتا ہے۔ گفتگو یا تقریر میں بولنے والا کسی ایک فرد یا ایک گروہ سے مخاطب ہوتا ہے، اس لیے وہ اس فرد یا گروہ کی ذہنی



صلاحیتوں اور فہم و ادراک کی قوتوں کے پیش نظر الفاظ کا استعمال کرتا ہے گفتگو میں جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان میں صیغہ امر، استفہامیہ اور فجائیہ جملوں اور ندائیہ الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تحریری اسلوب میں عام طور سے طویل، توضیحی اور مرکب جملے ہوتے ہیں۔

تحریر میں سوچنے، دماغ پر زور ڈالنے، الفاظ کا انتخاب کرنے، ایک فقرے یا لفظ کو قلم زد کر کے اس کا متبادل نکھنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ جب کہ تقریر یا گفتگو میں فقرہ کی ساخت الفاظ کا انتخاب، تشبیہات و استعارات وغیرہ کا استعمال جربستہ فی البدیہہ اور کچھ حد تک غیر شعوری ہوتا ہے۔ تحریر میں ذہنی مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ تقریر میں محنت کی ضرورت نہیں۔ بے تکلف مکتوب نگاری تحریر اور تقریر کے درمیان کی چیز ہے۔ درمیان کی چیز اس لیے کہ ایک تو خط لکھتے وقت مکتوب نگار کو اتنی ذہنی مشقت اور محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ عام شہر لکھنے میں کرنی پڑتی ہے اور دوسرے اس میں عام گفتگو کے مقابلے میں سطح کچھ بلند ہوتی ہے گفتگو میں سوچ سوچ کر بولنے کا موقع نہیں ہوتا جب کہ خط لکھتے ہوئے مکتوب نگار ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر لکھ سکتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری کے دور میں غالب اوسطاً ایک دو صفحے روز خطوط کی شکل میں لکھتے تھے، لیکن اردو نثر میں دیباچے اور تقریظیں لکھتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔ کیوں کہ یہ قول اُن کے اُن میں "ذہنی مشقت" کی استعداد نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ابتدا میں غالب پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کے اردو خطوط شائع کیے جائیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ کوشش کر رہے تھے کہ اُن کے خطوں کا مجموعہ جلد چھپ جائے۔ ان حالات میں بھی جب خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے خطوط غالب پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی تو غالب نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے مال دیا۔ کچھ دن بعد بے خبر نے پھر تقاضا کیا تو غالب جواب دیتے ہیں،

"اگر ایک بندہ قدیم، کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم

بجائے لاوے، تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعہ نشر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے  
دیباچے پر موقوف ہے، تو اُس مجموعے کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ  
چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔“

غالب خطوط لکھنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن اردو اور فارسی شکر لکھنے سے  
اتنا کتراتے تھے کہ کبھی کبھی اپنے عزیز شاگردوں کو سخت سٹ بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ مرزا ہر گوپال  
تفتہ نے جب اپنے دوسرے دیوان کی تقریظ کی فرمائش کی تو غالب اپنے مخصوص انداز میں  
لکھتے ہیں:

”دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔  
کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو..... اب یہ دیوان چھپوا کر  
اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے،  
میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا۔“

مکتوب نگاری غالب کو اتنی پسند تھی کہ بہ قول اُن کے بیشتر وقت خط لکھنے اور پڑھنے  
میں صرف ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط کے ذریعے بہت سے لوگوں سے رابطہ بنا رہتا  
اور ذہنی مشقت بھی نہ کرنی پڑتی۔ ان خطوط میں غالب کی تخلیقی قوتوں کو بہت وسیع میدان  
مل گیا تھا۔ ایسا میدان جس میں غالب اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار کر کے نشر میں جادو جگا  
سکتے تھے۔ روزمرہ کے مسائل پر گفتگو کر سکتے تھے۔ سیاسی اور سماجی حالات پر تبصرہ کر سکتے  
تھے، اور مرقع کشی و کردار نگاری کے فن کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نشر سادہ اور سلیس ہونی شروع ہو گئی تھی لیکن نشر کی  
سادگی کا حسن غالب ہی کے ہاتھوں نکھرا۔ غالب چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سے بڑی  
بات کہنے پر قادر ہیں۔ ان جملوں کی ساخت سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ غالب جو  
بات کہنا چاہتے ہیں وہ مخاطب کے دلنشین ہو جاتی ہے۔ مرزا غلام الدین خاں علانی کے نام

ایک خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔ اس خط میں غالب نے کیسی خوبصورت مرقع کشی کے سہارے اپنی مصیبت بیان کی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں، جہاں حروفِ عطف کے سہارے دو جملوں کو ملایا ہے وہاں بھی عبارت میں پیچیدگی پیدا ہونے نہیں دی:

”میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلِ سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں، ہاے دہلی! ہاے مری، دیوان خانے کا حال محلِ سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے، ابر دو گھنٹے برے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو، اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک، بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کونٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور مہیم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آریں گے۔“ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

غالب کے چھوٹے جملے عام طور سے چار لفظوں سے لے کر سات لفظوں تک ہوتے ہیں۔ وہ جملہ طویل ہوتا ہے، جس میں وضاحت کے طور پر فقرے شامل ہوتے ہیں۔ اس اقتباس میں جس جملے کی ابتدا ”اگر تم سے ہو سکے“ سے ہوتی ہے، طویل ہے۔ اس میں حویلی اور بالاخانے کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سے کم لفظوں میں یہ وضاحت ممکن نہیں تھی اور پھر بات اس طرح کہی گئی ہے کہ مخاطب کے ذہن میں کسی طرح کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔

غالب کے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیز ہیں۔ ندائیہ الفاظ، بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے غالب اپنے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے اتنا قریب کر دیتے ہیں کہ مجلسی اور اجتماعی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالب مکتوب الیہ



ہی کو نہیں بلکہ بہت سے افراد کو مخاطب کر رہے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بھی خاصی ہے جنہیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ غالب انیسویں صدی کے مجروح، علانی یا لفظی وغیرہ سے نہیں بلکہ براہ راست ہم سے مخاطب ہیں۔ ان خطوط میں غالب روزمرہ، محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، فارسی ترکیبوں اور اردو و فارسی شعروں کا استعمال اس لیے نہیں کرتے کہ انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور مؤثر طریقے سے مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسی کوشش نے خطوط غالب کے ادبی حسن کو چمکایا ہے اور ان کی آواز میں وہ انفرادیت پیدا کی ہے کہ آج بھی ہزاروں آوازوں میں ان کی آواز اپنی شناخت قائم کی ہوئی ہے۔

اب نواب علاء الدین خاں علانی کے نام غالب کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے، جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے، جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کمپ ہے، مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود، معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اثاث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امراے اسلام میں سے اموات گنوا، حسن علی خاں۔ بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیہ روز کا پنشن دار، سو روپیہ مہینے کا روزینہ دار بن کر نامزدانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ بنانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ منعلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی

بخشی ہو چکا تھا، بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے مجھیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اُس کے پاس ایک پیسا نہیں، ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑھے صاحب، ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بیک بینی و دو گوش سہرت پر چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایے کی املاک و اگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ، خراب لاہور گیا؛ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے، کیا ہوتا ہے؟ قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تیس لاکھ روپیے کی ریاستیں سٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہر مند آدمی یہاں کیوں پایا جاوے؟ بنام نواب علاء الدین خاں علاقائی ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء

اس خط میں ”اے میری جان“ کے خطاب یہ الفاظ اور پھر ”وہ دلی نہیں ہے“ کی پانچ بار تکرار سے گفتگو اور تقریر اور براہ راست مخاطب کرنے کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں، جن کے لیے سینکڑوں صفحے درکار ہیں۔ جن علی خاں میر نصیر الدین، آغا سلطان کی وفات کی خبر مختصر لفظوں میں دی ہے۔ اس اختصار میں مرنے والے کا تعارف، اس کی سماجی حیثیت اور موت کی وجہ غرض صوبہ ہی کچھ شامل ہے۔ مثال کے طور پر اس اقتباس کا یہ جملہ لیجئے۔ ”میر نصیر الدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ اس فقرے میں غالب نے میر نصیر الدین کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ صاحبِ طریقت بھی تھا اور دولت مند بھی۔ ”مظلوم مارا گیا“ ان تین فقروں میں غالب نے بتایا ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں میر نصیر الدین بے قصور تھا۔ پھر بھی خاکیوں کی گولی کا نشانہ بنا۔ ”مظلوم“ کے لفظ کے استعمال سے اپنے جذبات اور احساسات اور میر نصیر الدین سے اپنی ہمدردی کا بالواسطہ طور پر کیسے مؤثر انداز میں اظہار کیا ہے۔

اس اقتباس کا ایک فقرہ اور لیجئے: ”(بادشاہ کے) امانت میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹیاں اور جوانیں کسبیاں: فروری ۱۸۶۳ء کی اجڑی ہوتی دلی، خاندان تیموریہ کی معاشی بد حالی، برطانوی سامراج کے ظلم و ستم کی داستان کو اس سے زیادہ مختصر، درد انگیز اور موثر انداز میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے پورے خط میں ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف براہ راست ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن واقعات کے بیان کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ غالب کے ذہنی اور روحانی کرب کو مکمل طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ تمام خصوصیات ہیں جنہوں نے غالب کے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔

### مقفی عبارتیں

جب کوئی نثر نگار خوبصورت لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں سے نثر کو رنگین اور دلکش بنانے کی کوشش کرتا ہے یا اسے مقفی اور مسجع کر کے اس میں شہرت کا جادو جگانا چاہتا ہے تو عام طور سے عبارت کا مفہوم الفاظ کے اس انبار میں گم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مقفی یا پُر تکلف عبارت لکھتے وقت الفاظ، لکھنے والے کے بس میں اتنے نہیں ہوتے جتنا خود لکھنے والا الفاظ کے بس میں ہوتا ہے۔ خوبصورت اور دلکش الفاظ کبھی کبھی لکھنے والے کے ذہن اور اس کے قلم کو بہکا کر کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔

اس معاملے میں غالب بہت محتاط ہیں، انہیں چوں کہ نظم و نثر دونوں میں اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے، اس لیے وہ اپنے ذہن کی باگ ڈور کبھی الفاظ کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ غالب کے ایسے اردو خطوط کی تعداد بہت کم ہے جو پورے کے پورے مقفی ہوں، عام طور سے خط میں دو تین فقرے ہی مقفی ہوتے ہیں اور یہ مقفی فقرے ایسی جہتگی اور بے ساختگی کے ساتھ آتے ہیں کہ اُن سے نثر کے حسن میں اضافہ اور اظہار



میں زور ہی پیدا ہوتا ہے۔ غالب نے صرف وہی خطوط مکمل طور پر مقفی عبارت میں لکھے ہیں جن میں اُن کے پاس کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے اور خط لکھنا ضروری ہے۔ ان خطوط میں بھی غالب یہ خیال رکھتے ہیں کہ ایسے الفاظ اور فقروں کی تعداد کم سے کم ہو، جو عبارت کو مقفی کرنے کی وجہ سے مجبوراً لکھنے پڑتے ہیں۔

چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب نے ایک مقفی خط لکھا ہے۔ اس کا پہلا پیرا گراف

ملاحظہ ہو :

”بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامے پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن بہ عارضۂ تپ و لرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ، ضعف کی یہ شدت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارا خط تمہارے دستخط آئے سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہوا، خط پڑھ کر دُنی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دل سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصدِ ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔“

اس عبارت کو پڑھنے سے محسوس نہیں ہوتا، کہ عبارت کو مقفی کرنے کی وجہ سے کچھ الفاظ یا فقرے زائد آگئے ہیں۔ بہت کھینچ تان کے خط کشیدہ الفاظ اور فقروں کو زائد کہا جاسکتا ہے۔ قافیوں نے عبارت میں روانی اور خاص قسم کی موسیقیت پیدا کر دی ہے۔

غالب مقفی عبارت لکھتے ہوئے بھی پورا خیال رکھتے ہیں کہ اصل مقصد فوت نہ ہو جائے، اس لیے اُن کی اکثر مقفی عبارتیں ایسی ہیں کہ کچھ فقرے مقفی ہیں اور کچھ غیر مقفی۔ اس طرح عبارت بھی خوبصورت ہوگئی اور مفہوم الفاظ کی نذر بھی نہیں ہوا۔ ایک خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو :

”پیر و مرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دعا۔ خداوند مجھے مارہرہ بلائے

ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ اُن دنوں میں کہ دل بھی سکھتا اور

طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بہ طریقِ تنہا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ہر سات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں، طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہ ہارمنہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعائین۔ ہاں، آخر روز بعد مضمم معدے، آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ اچھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔“

بنام چودھری عبدالغفور مسرور

اس عبارت میں بہت کم فقرہوں کو مقفلی کیا گیا ہے اور ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو قافیہ پیمائی کی وجہ سے لکھا گیا ہو۔ جن فقرہوں کو مقفلی کیا گیا ہے، اُن سے عبارت میں دلکشی اور روانی پیدا ہوئی ہے۔

غالب جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں، اُسے کبھی کبھی مقفلی کر کے مکتوب الیہ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ غالب ”دستنبو“ کی طباعت کے لیے بہت پریشان تھے۔ خاص طور سے ان چھ سات جلدوں کی تیاری میں انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر رکھا تھا جو وہ ملکہ معظمہ اور حکام اعلیٰ کو مطلب برآری کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ بار بار ان جلدوں کے بارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ اور مرزا حاتم علی مہر کو لکھ رہے تھے۔ غالب کو خیال آیا کہ یہ تکرار ان حضرات کو ناگوار گزر رہی ہوگی۔ لیکن ان جلدوں کے بارے میں وہ پھر بھی بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ انسانی نفسیات سے بہ خوبی واقف تھے۔ چنانچہ نہایت ہی خوبصورت اور دل نشیں انداز میں مزاح اور قافیہ آرائی کا سہارا لے کر بات

اس طرح کہی کہ تفتہ کو تکرار بُری بھی نہ لگے اور وہ اپنی بات بھی کہ دیں :  
 ”رات سے ایک بات اور خیال میں آتی ہے مگر چوں کہ تحکم و کارفرمائی ہے  
 کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں  
 طلائع لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے  
 حکام کے واسطے درکار ہوں گی.....“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

دو جانے میں کسی کی شادی تھی۔ نواب علاء الدین خاں علائی نے غائب کو لکھا کہ  
 دو جانے میں شادی کے موقع پر آپ کا انتظار تھا۔ غائب کی صحت جواب دے چکی تھی۔  
 اس لیے سفر کی زحمت نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اوریوں بھی کچھ خاندانی معاملات ہوں گے،  
 ناراض ہو گئے اور جھٹاکر ایسے دکھن انداز میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ اُس میں حقیقت  
 حال بھی ہے، مزاح بھی، غصہ بھی اور عبارت آرائی بھی۔ ملاحظہ ہو :

”دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار۔ یہ بھی شعبہ  
 ہے انھیں طنز کا جس سے تمہارے چچا (نواب ضیاء الدین خاں نیر خاں)  
 کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا  
 میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دو جانے جا کر شادی کماؤں او  
 پھر اُس فصل میں کہ دنیا کرۂ ندر ہو۔ لوہار و بھائی (نواب امین الدین خاں)  
 کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔“

بنام علاء الدین خاں علائی

مقفی عبارت کا ایک اور خط ملاحظہ ہو۔ پورے خط میں کام کی بات کی گئی ہے۔  
 عبارت مقفی ہے لیکن فقرہ تو کیا کوئی لفظ تک زائد نہیں ہے۔ قافیوں نے عبارت میں  
 غیر معمولی اثر پیدا کر دیا ہے :



”جے پور کا امر محض اتفاقی ہے، بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسناکانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں، بڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں، سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا تھا مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو دواں داخل کر دوں، دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

”تا نہال دوستی کے بردہ

حالیہ فتنیم و تنخے کاشتیم

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء

غالب عام طور سے سادہ نشر لکھتے لکھتے دو فقروں کو مستفقی کر دیتے ہیں۔ یہ فقرے شعوری کوشش سے نہیں بلکہ بے ساختہ اور برجستہ قلم سے نکل جاتے ہیں، اسی لیے ان فقروں سے عبارت زیادہ بامعنی اور زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ ایسے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

”میرا حال بہ دستور ہے۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۵ مارچ ۱۸۵۶ء

”بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغ کہنہ حسرت کو چمکایا“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

”تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نشر میں خود نمایاں کرنے لگے“

بنام میر محمدی مجروح ۲۳ دسمبر ۱۸۵۸ء

”یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

”شاہنہ آرایش ہے، آفتاب کی سی نمایش ہے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

”جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

”اومیاں سید زادۃ آزادہ، دلی کے عاشقِ دل دادہ“

بنام میر مہدی مجروح ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء

چند اور متغنی فقرے ملاحظہ ہوں :

”نعلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے“

جو تمھارا ڈھنگ ہے، وہی میرا رنگ ہے“

کافر نعمت ہو جاؤں، اگر یہ آداب نہ بجا لاؤں“

## بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے اور شاعری میں زبان کے استعمال پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس لیے لفظ اُن کے ہاں گنجینہ معنی کا طلسم ہے۔ غالب کی فکر، احساں اور جذباتی کیفیتیں اُن کے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ گہری اور پیچیدہ ہیں، غالب کے عہد کی مروجہ تخلیقی زبان اُن کا ساتھ نہیں دے پاتی، اسی لیے اُن کے ڈکشن پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ اپنی بات کو مؤثر طریقے سے کہنے کے لیے شاعری میں غالب تمشیلوں، علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں غیر معمولی جدت سے کام لیتے ہیں۔ اُن کی اسی شاعرانہ ادا نے اُن کے اُردو خطوط کی نشر کو بھی پُر لطف بنا دیا ہے۔ اردو میں خط لکھتے ہوئے اگرچہ غالب عام بول چال اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی بات کہنے کے لیے وہ ایسی تشبیہوں اور استعاروں کو بھی کام میں لاتے ہیں، جن کے استعمال سے اُن کا اظہار زیادہ مؤثر، معنی خیز، تہہ دار اور سنگفتہ ہو جاتا ہے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے روایتی بھی ہوتے ہیں اور غیر روایتی بھی۔ غیر روایتی تشبیہوں اور استعاروں میں سے اکثر خود غالب کی جدت پسند طبیعت کی اتباع کا نتیجہ ہوتے ہیں۔



غالب ایک خط میں تفتہ کو لکھنا چاہتے ہیں کہ اُن کی صحت اتنا جواب دے چکی ہے کہ اصلاحِ شعر کا کام اب اُن کے بس کا نہیں رہا۔ اس خط میں غالب نے ایک ترکیب ”سک لمبر“ استعمال کی ہے۔ یہ دراصل (SICK NUMBER) ہے۔ ”سک لمبر“ اس فوجی کو کہتے ہیں جو اتنا بیمار ہو جائے کہ اُسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑے یا اُسے اُس کے گھر بھیج دیا جائے۔ تنخواہ اُسے پوری ملتی ہے۔ اب غالب کے خط میں اسی ترکیب کا بطور استعارہ استعمال ملاحظہ ہو :

”رہیں رام پور سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ اُن کو کھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجئے، تو میں ”سک لمبر“ ہی ورنہ خیرات خواہی“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۳ء

اس خط میں ”سک لمبر“ کے استعارے کے استعمال سے غالب نے اپنی سابقہ خدمات، نواب رام پور سے اپنے تعلقات اور صحت کی خرابی، غرض سب ہی کچھ بیان کر دیا ہے۔ اپنی پیرائہ سالی اور خرابی صحت کو دیکھتے ہوئے غالب کو یقین تھا کہ موت اُن سے بہت قریب آگئی ہے۔ تفتہ کے نام اسی خط کے آخر میں غالب نے ”چراغ“ اور ”آفتاب“ کے استعاروں کے ذریعے اپنی حالت کا کیسا مؤثر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”میں تو چراغِ دم صبح و آفتابِ سرکوه ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۳ء

غالب کی اردو نشریں استعاروں کا بڑا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ غالب استعارے کی مدد سے پورا واقعہ اور اس سے متعلق اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت بھی بیان کر دیتے ہیں۔ ان استعاروں سے اُن کی نشریں اختصار بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اس تفصیل کی جانب بھی

پڑھنے والے کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے جو غالب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں :

” نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ۔  
دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔“  
۲۳ اکتوبر ۱۸۶۱ء

زندگی کے لیے ’دریا‘ کا استعارہ کیا خوب ہے اس سے اُن کی بات میں جدت بھی پیدا ہو گئی اور ایجاز بھی۔ آخری عمر میں غالب بیماری اور ضعف سے تنگ آ گئے تھے خطوں میں بارہا انھوں نے موت کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ اس عبارت میں اپنی اس دلی تمنا کا اظہار ”دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے“ کہ کر، کیسے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

غالب جس مکان میں رہتے تھے، اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ ایک بار ایسی بارش ہوئی کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اس بارش کی وجہ سے غالب کو جو پریشانیاں اٹھانی پڑیں، وہ اُن کی زبانی ملاحظہ ہوں :

” جولائی سے مینہ شروع ہوا، شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت :  
دن راتیں، چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالا  
خانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل  
ہے اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی کہیں لگن، کہیں چلیپی، کہیں اگال دان  
رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشہ خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ ممالک  
مرمت کی طرف متوجہ نہیں کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء

برسات کے دنوں میں پرانے گھروں کا جو حال ہوتا ہے، اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ یا تو  
نظم میں میر کی ثنوی، درہجو خانہ خود سے لگایا جاسکتا ہے یا پھر شرین غالب کے اس خط سے۔

ذرا "کشتیِ نوح" میں رہنے والے اس شخص کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا اندازہ کیجیے جو خود نوح نہیں ہے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کی "سنبلستان" چھپ کر آئی۔ غالب کو اس کی طباعت بہت بری لگی۔ دیکھیے کیسے سادہ اور پرکار انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں :

"اجی مرزا تفتہ ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہاے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائیسچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوقِ خو برو ہے، بد لباس ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء

"سنبلستان" کے پسندیدہ اشعار کو بیگمات قلعہ اور اس کی ساقط المعیار طباعت کو "بد لباس معشوقِ خو برو" سے تعبیر کرنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

نواب کلب علی خاں نے غالب کو دو سو روپے بھیجے۔ غالب نے اس رقم سے قرض کا بوجھ اُتار دیا اور اس واقعے کو یوں قلم بند کیا:

"ان دنوں میں متفرقات کے قرض دار سرگرم تقاضا، بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپیہ کی ہنڈوی صراحیِ آبِ حیات ہو گئی۔ دامِ مرگ سے نجات ہو گئی۔"

بنام نواب کلب علی خاں ۲۳ اگست ۱۸۶۵ء

آخر کے دو متفقہ جملوں میں ہنڈوی کے لیے "صراحیِ آبِ حیات" کا استعارہ اور "دامِ مرگ" سے پیدا ہونے والا ایجاز یہ سب کیا کسی اچھے شعر سے کم ہیں۔

غالب سماعت بہت پہلے ہی کھو چکے تھے، رفتہ رفتہ بصارت میں بھی فرق آنے لگا۔



مسلل بیماریوں نے اتنا نحیف و نزار کر دیا کہ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ رام پور جانا چاہتے ہیں، مگر جاتیں کیسے، بالا خانے سے نیچے اترنا، کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس نقاہت کا حال اپنے مخصوص استعماراتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

”بالا خانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پاکی میں بٹھا دیا۔ کہا رچلے۔ راہ میں نہ مرا اور رام پور پہنچ گیا۔ کہاڑوں نے جا کر ”بے نظیر“ میں میری پاکی رکھ دی۔ پاکی قفس اور میں طا تر اسیر، وہ بھی بے پردہ بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔“

بنام نواب کلب علی خاں ۱۲ اپریل ۱۸۶۷ء

غالب اپنی مصیبت کا بیان بھی کبھی کبھی مزے لے لے کر کرتے تھے۔ ایک بار اُن کے بدن پر اتنے پھوڑے ہوتے کہ چلنا پھرنا دودھ بھر ہو گیا۔ ان پھوڑوں نے انھیں اتنا نحیف و نزار کر دیا کہ مرنے دم تک اُن کے جسم میں طاقت نہ آ سکی۔ میاں داد خاں سیاح کو اس بیماری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اٹھایا۔ کیا کروں، ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرور چراغاں ہو گیا ہے۔“

بنام میاں داد خاں سیاح ۱۷ اگست ۱۸۶۳ء

”عوارضِ فسادِ خون“ اور پھوڑوں کی کثرت کے ذکر کے بعد اچانک ”سرور چراغاں“ جیسی ترکیب غالب کی شگفتہ مزاحی اور زندہ دلی کا ثبوت ہے۔

غالب اپنی اردو شعر میں استعارے کا جس قدر استعمال کرتے ہیں، اُس سے کہیں زیادہ تشبیہ کا استعمال اُن کے ہاں ملتا ہے۔ اُن کے خطوط سے تشبیہات کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

”ایک مدت سے میرا پاؤں پھل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانے اُترنے لگے۔“

کے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر ہو جائے، ایک دانہ ان دانوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہو گیا۔

بنام منشی نبی بخش حقیر اگست تا اکتوبر ۱۸۵۷ء

”بے درد (مالک مکان) نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا، جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول، اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کنگھر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

”اب اگرچہ تندرست ہوں، لیکن ناتواں اور سُست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قدر آدم دیوار اٹھے۔“

بنام نواب سعد الدین خاں بہادر شفیق ۵ فروری ۱۸۶۴ء

”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ، کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریقِ قہر درویشِ جانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جو رو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنے اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

”آپ کی محبت دل و جاں میں اس قدر سما گئی ہے، جیسا اہلِ اسلام میں ملکہ ایمان کا۔“

بنام میر غلام بابا خاں ۶ اپریل ۱۸۶۸ء

”ایک امیر کے ہاں پتا لگا۔ دوڑا ہوا گیا۔ کھپچی موجود پائی لیکن کیا کھپچی، جیسے  
نحیف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمھاری ہڈی“

بنام نواب علاء الدین خاں علّائی ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء

”اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے ہم تم اپنے  
اپنے مسائلِ دینی سے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

”لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہہ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا  
حال کوفے میں تھا“

بنام علاء الدین خاں علّائی ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

”اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابرکشتِ خشک سے کرے“

بنام میر مہدی مجروح

”تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوسے پیرن نے یعقوب کے  
ساتھ کیا تھا“

بنام میر سرفراز حسین

”میں شاعرِ سخنِ سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخنِ فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان  
کی طرح پیچہ بتانے کی گوں ہوں“



بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

”عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے، جو ایمان سے کفر کو“

بنام علامہ الدین خاں علانی ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

خطوطِ غالب میں استعمال ہونے والی کچھ تشبیہات اور نقل کی گئی ہیں۔ یہ تشبیہات اکہری بھی ہیں، طویل اور توضیحی بھی۔ غالب عام طور سے کسی واقعے سے متعلق اپنے جذباتی ردِ عمل اور ذہنی کیفیت کے اظہار کے لیے تشبیہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی تشبیہات کی تعداد خاصی ہے، جو غالب نے اپنے گرد و پیش کی سماجی اور سیاسی زندگی سے اخذ کی ہیں۔ انھوں نے تشبیہات کا استعمال محض آرائشِ بشر کے لیے نہیں کیا بلکہ وہ تشبیہات کی مدد سے اظہار میں زیادہ معنویت اور اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کی ذہنی تربیت شعری اسلوب میں ہوئی تھی۔ اس لیے جب وہ شعر لکھتے ہیں تو اس میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھرپور لیکن متوازن انداز سے کام میں لاتے ہیں۔ شعر میں بات کم سے کم الفاظ میں ایجاز و اختصار کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ شعر کی نحوی ساخت بھی عام طور سے شعر سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً کبھی کبھی ایک ہی فعل کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک ساتھ دو مختلف فقرہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ غالب اردو شعر میں بھی افعال کا استعمال اس طرح کر کے اپنی شعر کو پر لطف اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

”اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار“

بنام میر مہدی نجف پور ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء

”تو نگر غرور سے، بھلس سردی سے اکڑ رہا ہے“

”ناچارسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی“

بنام حاتم علی تہر مارچ اپریل ۱۸۵۹ء

ایک فقرے میں فعل کی تکرار سے کیسا لطف پیدا کیا ہے  
”دیکھیے یہ جبراً ٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں“

بنام نواب حسین مرزا ۹ نومبر ۱۸۵۹ء

ایک اور فقرے میں ایک فعل کی دو مختلف صورتیں ملاحظہ ہوں :  
”دوسری کتاب دیکھیے، مجھ کو کیا دکھائے“

بنام منشی غلام غوث خاں بے خبر اواخر دسمبر ۱۸۵۸ء

کبھی کبھی غالب دو فقروں میں دو مختلف باتیں کہتے ہیں اور حرف عطف ”اور“ کے ذریعے  
دونوں فقروں کو ملا کر ایک فقرہ بنا دیتے ہیں جس سے بیان میں سگفتگی اور اس کے ساتھ ساتھ  
طنز و مزاح بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے فقروں کو اگر ’اور‘ سے نہ جوڑا جائے تو شاید  
لطف نہ پیدا ہو۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کی فارسی غزل کی داد دیتے ہوئے غالب -  
لکھتے ہیں :

”جو ڈھنگ تازہ نوا یان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار  
لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکنی جامع ”برہان قاطع“ کے جھگڑے  
میں بہ خلافت اور فارسی دانوں کے توفیق، انصاف عطا کرے“

بنام خواجہ غلام غوث بے خبر ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء

غالب کی اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ کسی نے غالب کو اطلاع دی تھی کہ بے خبر غالب  
کی ”قاطع برہان“ کی تردید میں ایک رسالہ لکھ رہے ہیں اور غالب کو یہ بات ناگوار گزری تھی۔  
مرزا ہرگوپال تفتہ کو اپنا کلام چھپوانے کی بہت فکر رہتی تھی۔ غالب کو یہ بات شاید  
اس لیے پسند نہیں تھی کہ اگر شاعر اپنا سارا کلام چھپواتا رہے تو رطب و یابس بھی چھپ جاتا

ہے، جس سے شاعر کے ادبی وقار کو نقصان پہنچتا ہے۔ غالب نے کئی خطوط میں تفتہ کو لکھا ہے کہ کلام چھپوانے کی جلدی نہ کرو لیکن تفتہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ جب تفتہ نے ”سنبلستان“ کی طباعت کی اطلاع دی تو غالب جواب میں لکھتے ہیں :

”سنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

غالب کے خطوط میں محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ کیوں کہ اس معاملے میں غالب نے ڈپٹی نذیر احمد کی طرح زبردستی ٹھونس ٹھانس نہیں کی ہے۔ انھوں نے اپنی اردو نثر میں محاورے یا کہاوت کا استعمال ہمیشہ بے ساختہ اور جرئتہ طور پر کیا ہے جس سے اُن کے نثری اسلوب میں نہ صرف سگفتگی، سلاست اور بے تکلفی پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کی معنویت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

کوئی صاحب تھے، جن سے مرزا ہرگوپال تفتہ اور غالب دونوں کو غالباً کسی ادبی معاملے میں اختلاف تھا۔ غالب نے اس سلسلے میں اُن صاحب کو خط لکھا اور پھر تفتہ کے نام اپنے ایک خط میں اس خط کا ذکر کرتے ہوئے اردو کا ایک محاورہ کیا بے تکلف انداز میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

”بہ ہر حال، وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اُس کو بھیجا، اس کی ماں مرے اگر میرے اُس خط کا جواب لکھا ہو“

”اس کی ماں مرے“ لکھ کر غالب نے اپنی فتح اور اُن ”صاحب“ کی شکست دونوں کا اعلان بڑی خوبصورتی کے ساتھ کر دیا ہے۔

کچھ اور محاوروں کا استعمال ملاحظہ ہو :

”دیکھا، اس نپن قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں؛ لیکن



جب تک جواب نہ پاؤں کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھیے کب آئے۔ آئے، تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے۔ خلعت ملے یا نہ ملے۔ اس سچ میں ایک اور سچ آپڑا ہے۔“

بنام میر مہدی مجروح

”لیکن ان ملاؤں اور عزائم خانوں نے تہہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور ہاتھیں بکھانتے ہیں۔“

بنام علامہ الدین خاں علائی

”یہ تمہارا دُعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔“

بنام مرزا ہر گopal تفتہ ۹ جون ۱۸۵۳ء

”مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنشن کی فکر ہے۔“

بنام میر مہدی مجروح ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

”خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں بھٹوئیں۔“

بنام میر مہدی مجروح

”حضرت کی تحریر کا ایک لفظ، سوائے ”سعادت توام شاہ عالم“ کے اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے بھٹوئیں، ایمان نصیب نہ ہو۔“

بنام چودھری عبدالغفور مسرور

”اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے، تو چھانی پر سانپ سا پھر جاتا

ہے۔“

بنام مرزا حاتم علی بیگ تہر

## شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نثر میں کبھی کبھی اشعار کا استعمال مفہوم کو زیادہ واضح اور اظہار کو زیادہ مؤثر بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اوقات شعر کے استعمال سے بیان کے حسن میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط کی عبارتوں میں خود اپنے اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور دوسرے شاعروں کے بھی۔ بعض اشعار ایسے بھی ہیں، جنہیں غالب نے کئی بار استعمال کیا ہے کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی شعر یا مصرع موزوں کر دیا ہے۔ بعض مصرعے اس روانی کے ساتھ آتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ غالب کے قلم سے جڑتہ نکل گئے ہیں، جس کا احساس شاید خود غالب کو بھی لکھنے کے بعد ہوا ہو۔ مفہوم کی ادائیگی کے لیے کہے گئے یہ فی البدیہہ شعر عام طور سے جذبے کی آغ، شعریت اور تاثیر سے محروم ہیں۔

یہاں غالب اور دوسرے شاعروں کے اُن تمام اردو فارسی اشعار یا مصرعوں کا ذکر تو ممکن نہیں جو غالب کے اردو خطوط کی عبارتوں میں جا بہ جا آتے ہیں۔ اس لیے محض چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے فارسی اشعار کو لیجیے۔ انورسی کا ایک شعر ہے:

اے درینا نیست ممدوحے سزاوارِ مدح

اے درینا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غالب نے یہ شعر تین جگہ نقل کیا ہے اور تینوں جگہ مختلف مفہوم کی وضاحت کے لیے۔ چودھری عبدالغفور سریر کے نام خط میں غالب نے ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت میں دہلی کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”رفعِ فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلم، یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔  
اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ دافع اُن کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا،  
میں اموات میں ہوں مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا، معشوق کس  
کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، مہرِ دوح کون ہے؟  
ہاے انوری، گویا میری زبان سے کہتا ہے :

اے دریغا! نیست مہر دوحے سزاوارِ مدح

اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غلامِ حسنینِ قدرِ بلگرامی کے نام ایک خط میں غالب نے زمانے کی قدرنا شناسی کا شکوہ کیا ہے۔  
شعر گوئی ترک کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے انوری کے اس شعر کا استعمال اس طرح  
کیا ہے :

”فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر  
سننا تو ممکن ہی نہیں۔ بہرا ہوں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی  
عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا، نہ  
غزل کی داد۔ بہ قول انوری :

اے دریغا! نیست مہر دوحے سزاوارِ مدح

اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا سے اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرہ شعرا میں شمار

نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو“

مرزا ہرگوپال تفتہ نے کسی ایسے شخص کی مدح میں قصیدہ لکھ کر غالب کو بھیجا جو شعر کے فن  
سے بیگانہ تھا اور بہ قول غالب ”یہ لوگ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے، چہ جائے اُن کہ  
مدح کیجے“۔ غالب نے تفتہ کو لکھا :



”میاں سنو! اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے  
ہم تم اپنے اپنے مسائلِ دینی سے، بلکہ ہم تم باوجود عدم واقفیت امورِ دین سے  
نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ اتالیق  
کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے۔ دلی میں اپنے گھر بیٹھے ہوتے ہیں جب سے  
آئے ہیں، ایک بار میرے پاس نہیں آئے نہ میں اُن کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس  
لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے۔ چہ جائے اُن کہ مدح کیجے۔ اے انوری :

اے دریغا! نیست ممدوحے سزا وارِ مدح

اے دریغا! نیست معشوقے سزا وارِ غزل“

شیخ لطیف احمد بلگرامی نے اصلاح کے لیے ایک قصیدہ بھیجا۔ غالب قصیدے پر تبصرہ  
کرتے ہوئے انھیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ شاہِ کونین اور دنیاوی لوگوں کی مدح ایک ہی  
انداز میں نہیں کرنی چاہیے۔ دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی  
نشر میں نہیں لکھا۔ صرف ایک شعر لکھ کر اپنی پوری بات سمجھا دی۔ لکھتے ہیں :

”تمہارا مسودہ آیا۔ کم تر جگہ اصلاح کی پائی۔ روشِ تحریر بھی مجھے پسند آئی،  
دل خوش ہوا، لیکن :

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن

نعتِ شاہِ کونین و مدح کے و جم را“

غالب کا ایک شعر ہے :

در کشاکشِ ضعفِ نگلد رواں از تن

ایں کہ من نمی میرم، ہم نہ تا تو اینہا ست

غالب نے یہ شعر اپنے ضعف اور ناتوانی کا ذکر کرتے ہوئے کم سے کم تین بار نقل کیا ہے۔ نواب  
انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آپ کی پرستش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا۔ میری  
خبر نہ لی۔ میرے مرگ کے منبر کی تقریر اور مثلہ میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھی  
جھوٹ۔ در صورت مرگ، نیم مردہ اور در حالت حیات نیم زندہ ہوں،  
درکشاکش ضعفم نگسلہ رواں از تن  
ایں کہ من نمی میرم، ہم ز ناتوا اینہاست“

۱۵ فروری ۱۸۶۴ء

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:  
”درکشاکش ضعفم نگسلہ رواں از تن  
ایں کہ من نمی میرم، ہم ز ناتوا اینہاست  
حضرت نے میری گرفتاری کا نیا نیاں نکالا۔“ بوستان خیال کے دیکھنے کا  
دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر چنیں جاؤں، دام پر گر کے  
دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔ حضرت سچ تو یوں ہے کہ غم ہمارے روزگار نے  
مجھ کو گھیر لیا ہے“

ابرگھرا ہوا ہے، ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور غالب کا یہ حال ہے کہ بہ قول سودا ”بہار  
بے سیر جام دیار گزرے ہے“ یعنی غالب کے پاس پینے کو شراب نہیں ہے۔ اس کیفیت کا  
مؤثر اظہار اپنے ایک فارسی شعر کی مدد سے یوں کرتے ہیں:

”پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابرگھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے،  
پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھاتی ہے:

افق لم پُر از ابر بہمن مہن

سفالینہ جام من از مے تہی“

بنام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر

میر مہدی مجروح نے غالب کو اطلاع دی کہ میرن صاحب دلی آ رہے ہیں۔ غالب جو دوستوں کی ملاقات کو ترسے ہوئے تھے، خط کے جواب کی ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں:

”کیوں یاد کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں ہمارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک

آتش شوق تیز تر گردد“

غالب کا کوئی سٹاگروڈ ان سے اپنے اشعار پر اصلاح کی درخواست کرتا یا کوئی دوست تازہ کلام کی فرمائش کرتا اور غالب کی صحت ٹھیک نہ ہوتی تو کبھی کبھی اپنی ذہنی اور جسمانی کمزوری کا عذر پیش کر کے معذرت چاہ لیتے۔ اس طرح کے کم سے کم چار موقعوں پر غالب نے اپنا یہ فارسی شعر استعمال کیا ہے:

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی

بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

غالب کو بیماریوں نے گھیر رکھا ہے۔ نقابت اور کمزوری انتہا پر ہے۔ مالی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ”قحط سالی“ کے عالم میں ”عشق“ کو فراموش کیے اور شعر و شاعری کو ترک کیے عرصہ ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں جب حکیم محب علی تازہ کلام یا شعر کی فرمائش کرتے ہیں تو غالب اپنی بے بسی اور لاچارگی پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

”گمان زیست بود بر منت ز بیدردی

بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

ہے ہے! تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالب شعر کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے؟ ایک پاؤں رکاب میں، ایک ہاتھ باگ پر۔ اس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا؟ اخ کرم و معظم نواب مصطفیٰ خاں گواہ ہیں کہ اب شعر نہیں کہتا“



غالب ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

”گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی  
بدستِ مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست  
مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثر فارسی کی سرایش کرتے ہو؟ غنیمت نہیں  
جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیجتا ہے“

بنام منشی شیونرائن آرام ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

”سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر  
ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو؟“

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی  
بدستِ مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

غالب کی ”قاطع برہان“ کے جواب میں مرزا رحیم بیگ لے ”ساطع برہان“ نام سے ایک  
کتاب لکھی۔ غالب نے ایک طویل خط کی شکل میں ”ساطع برہان“ کا جواب دیا جو بہت موثر  
طریقے سے ایک فارسی شعر پر اس طرح اختتام پذیر ہوا ہے :

”میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیہر کی  
تحقیر کو مستلم رکھتے ہو۔ تم جانو اور سید ابرار، خاقانی پر بہتان کرتے ہو، تم  
جانو اور وہ میدانِ معنی کا شہ سوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور  
لکھ رہا ہے، اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن  
واللہ مجھ کو عرصہ محشر میں اُس کی باز خواست نہیں :

زمینِ عشق، بہ کونینِ صلح کل کر دیم  
تو خصمِ باش، دوزما دوستی تماشا کن

اگست ۱۸۶۵ء

صاحبِ عالم سے کسی ادبی معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ غالباً انہوں نے غالب کا کسی ہندوستانی فارسی شاعر سے موازنہ کر دیا یا کسی معاملے میں اُسے غالب پر ترجیح دے دی۔ غالب کو یہ بات ناگوار گزری۔ چوں کہ صاحبِ عالم کا احترام کرتے تھے، اس لیے بہت دلچسپ انداز میں صاحبِ عالم سے اُن کے اس رویے کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”پہلے اپنا ایک شعر کمالِ گستاخی کو کارفرما کر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے :

مرا بہ نغیر ز یک جنس در شمار آورد  
فغاں اکہ نیست ز پروانہ فرق تاگش

بنام چودھری عبدالغفور مسرور

کچھ کتابیں اور کچھ شراب کی بوتلیں غالب کے ہاتھ آگئی ہیں۔ چنانچہ جمشید اور سکندر بنے ہوئے عیش کر رہے ہیں۔ اپنی اس کیفیت کا بیان میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں :

”مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب ”امیر حمزہ کی داستان“ کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد ”بوستانِ خیال“ کی آگئی ہے؛ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی تو شک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں :

کے کیں مرادش میسر بود

اگر حجم نہ باشد، سکندر بود“

۱۸۶۱ء

اردو اور فارسی کے کچھ شعر ایسے ہیں، جنہیں غالب نے بار بار نقل کیا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جن کی مدد سے غالب اپنے ضعف، نفاہت، بے بسی اور موت کی تمنا کے اظہار کو زیادہ مؤثر طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ فارسی کے ایسے دو شعروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اردو میں

خود غالب ہی کا ایک شعر ہے :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ  
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

یہ شعر غالب نے کم سے کم چار دفعہ خود اپنی موت کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ چودھری  
عبدالغفور مسرور کو ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

”میں تو اب روز و شب اسی فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزری، اب دیکھیے  
موت کیسی ہو :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ  
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسبِ حال ہے“

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفیق کو لکھتے ہیں :

”نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ !  
دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار  
ہے :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ  
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء

غلام حسنین قدّر بلگرامی نے خط لکھ کر غالب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کی درخواست

کی غالب نے قدّر بلگرامی کی یہ درخواست بہ خوشی قبول کی لیکن خط میں یہ بھی لکھا :

”باستھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔

اب جسم و جاں میں تاب و توان نہیں۔ شرفارسی لکھنی یک قلم موقوف، اردو،



سو اُس میں عبارت آرائی متروک، جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔  
 پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر، کیا نکھوں اور کیا کروں؟ یہ شعر اپنا  
 پڑھا کرتا ہوں :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ  
 مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

موت سے کچھ عرصے پہلے غالب نے صوفی منیری کو جو خط لکھا تھا، اس میں اپنی ضعیفی  
 اور صحت کی خرابی کا ذکر قدرے تفصیل سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اکہتر برس کی عمر، پاؤں سے اپا، ہج، کانوں سے بہرا، دن رات پڑا رہتا  
 ہوں۔ دو سطرین لکھیں، بدن تھرا آیا، حرف سو جھننے سے رہا، قوتیں ساقط،  
 حواس مختل، غذا قلیل بلکہ اقل :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ  
 مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا“

غالب نے اپنی ضعیفی، کمزوری اور بیماریوں کا ذکر اکثر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ اس  
 موقع پر بہت خوبصورت اور برجستہ استعارے اور تشبیہیں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے  
 ایک شاگرد منشی میاں داد خاں سیاح کے نام خط میں اپنی صحت کی خرابی کا ذکر بڑے  
 خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اور آخر میں ذوق کا شعر نقل کر کے اپنی بات اور ذوق کے  
 شعر دونوں کو مؤثر بنا دیا ہے :

”نا توانی زور پر ہے، بڑھا پے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سُستی، کاہلی،  
 گراں جانی، گرائی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر  
 دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر  
 نا پر سیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوتی تو سفر مقرر ہے اور ہادیہ زاد یہ ہے۔

دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہمارے کسی کا کیا اچھا شعر ہے !  
 اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے  
 مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے ۔

۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء

ایک خط میں طولِ عمر سے پیدا ہونے والی اپنی بیماریوں کا ذکر کر کے، میر تقی میر کا شعر بڑے  
 برجستہ طور پر استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”خرف ہوں، پوچھ ہوں، پیچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاء  
 ہوں، یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسبِ حال ہے :

مشہور ہیں عالم میں، مگر ہوں بھی کہیں ہم  
 القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم  
 بنام منشی حبیب اللہ خاں ڈکا

جون ۱۸۵۸ء میں حکومت نے طے کیا کہ پنشن داروں کو پنشن ماہ بہ ماہ ملنے کے بجائے سال  
 میں دوبار ملا کرے گی۔ اخراجات کے مقابلے میں غائب کی آمدنی یوں بھی محدود تھی۔ اس  
 حکم نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ غائب حکومت کے اس فیصلے کی اطلاعِ تفتہ کو بڑے  
 دلچسپ انداز میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن دارانِ  
 قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں، سال میں دوبارہ طریقِ شش ماہہ فیصلہ پایا کریں۔  
 ناچار سا ہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں میل کر  
 صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا۔ ایک معقول  
 رقم کھاٹے میں جائے گی :

رسم ہے مردے کی چھماہی ایک  
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار  
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قید حیات  
اور چھماہی ہو سال میں دوبار “

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲ جولائی ۱۸۶۶ء

غالب نے زندگی کے تمام نشیب و فراز دیکھے۔ ہر ممکن مصائب و آلام کا سامنا کیا لیکن انتہائی ناکامی اور مایوسی میں بھی انہوں نے حالات سے شکست نہیں کھائی۔ مرزا ہرگوپال تفتہ مالی دشواریوں سے تنگ آکر گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے غالب کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو ہر حال میں زندہ رہنے کا سلیقہ رکھنے والے غالب جواب دیتے ہیں :

”کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے۔ ترک لباس سے قید بہتی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سستی، رنج و آلام کو ہموار کر دو جس طرح ہوا اسی صورت سے، بہ ہر صورت گزرنے دو :

تاب لاتے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز “

جنوری ۱۸۶۶ء

چودھری عبدالغفور ستردر کے نام ایک خط میں صاحب عالم سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”حضرت ! بیچ تو یوں ہے کہ غم ہاے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے، سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں



آئی، پر دل نے کسی طرح نسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رویا کروں گا، دوسری یہ، آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشیں ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے۔  
ہیہات !

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید

نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

ایک جگہ غالب کہنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ لاکھ بڑے سہی، پھر بھی اس زمانے میں غنیمت ہیں۔ مصحفی کے شاگرد منتظر کا ایک شعر نقل کر کے بڑے دلکش انداز میں یہ بات کہی ہے۔  
لکھتے ہیں :

”میاں ! یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے

بیش قیمت ہیں، یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے :

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

بنام میر سرفراز حسین

تصور کیجیے ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اپنی خوں آشامیوں کے ساتھ غالب کی بنگا ہوں کے سامنے سے گزر کر چکا ہے۔ بے شمار عزیز، دوست اور آشنا موت کی نذر ہو چکے ہیں۔ حالاً ابھی تک معمول پر نہیں آتے ہیں۔ ہر چیز غیر یقینی دکھائی دیتی ہے مستقبل کا کوئی نقشہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ غالب نے خود اپنے ایک شعر سے اس کیفیت کا کیسا مؤثر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”تمہاری والدہ کا مرنا سن کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے اور اُس

عفیفہ کو بخشے۔ میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔ کیسا پنہن اور

کہاں اُس کا ملنا۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں :  
 ہے موج زن اک قلمِ نوح، کاش یہی ہو  
 آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے"

## مرقع نگاری

اگرچہ خطوطِ غالب میں مرقع نگاری کے نمونے بہت کم ہیں، لیکن جو دو چار نمونے ملتے ہیں، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی خطوطِ غالب ہی میں ملتے ہیں۔ غالب مختصر الفاظ سے ایسا مرقع پیش کرتے ہیں کہ پوری تصویر اور صاحبِ تصویر کا کردار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

غالب جب رام پور میں تھے تو نواب کلب علی خاں کی شخصیت نے انہیں بہت متاثر کیا۔ علّائی کو اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"ہمیں کی تصویر کھینچتا ہوں : قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہ بہائی  
 ضیاء الدین خاں عمر کا فرق، اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفادیت۔ حلیم و خلیق،  
 باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم، سینکڑوں شعریاد۔ نظم کی  
 طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالاے طباطبائی کی طرز  
 برتتے ہیں بسکفۃ جہیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کو سوں بھاگ جائے۔  
 فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔  
 اَللّٰهُمَّ دَامْ اِقْبَالُہٗ وَ زَادْ اَجْلًا لّٰہٗ"

بنام علماء الدین خاں علّائی ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

اس مختصر سی تحریر میں غالب نے نواب کلب علی خاں کی پوری شخصیت : چہرہ مہرہ و اخلاق،  
 شعر فہمی، نثر نگاری اور تقریر غرض ہر چیز اس طرح بیان کی ہے کہ نواب صاحب کی

پوری شخصیت اور ان کا کردار ہمارے سامنے آ گیا ہے۔

میر مہدی مجروح کے ایک دوست حکیم میر اشرف علی پہلی بار غالب سے ملاقات کو آئے۔ غالب کو حکیم صاحب بہت پسند آئے۔ اُن سے اپنی ملاقات کا حال جس دلکش انداز میں بیان کیا ہے اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

”کل دوپہر ڈھلے، ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے تمہارا خط دیا، صرف اُن کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے، اُن سے اسم تشریف پوچھا گیا، فرمایا، اشرف علی قومیت کا استفسار ہوا، معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا، حکیم نکلے۔ یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں اُن سے بل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔“

بنام میر مہدی مجروح

غالب کی ایک ملازمہ تھیں بی وفادار۔ بہت دلچسپ شخصیت کی مالک۔ علاقے کے نام ایک خط میں غالب نے اُن کی شخصیت کا بہت دلکش خاکہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں :

”بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں، اب تمہاری پھوپھی نے انہیں ”وفادار بیگ“ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تاج چچا کے بیٹے کی کافی کی اینٹ۔ شرح تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔“

بنام نواب علاء الدین خاں علاقائی ۶ اگست ۱۸۶۳ء



## اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

غالب کے مصائب و آلام کی داستان اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی نوجوان تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اُن کی مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پنشن کے مقدمے میں اُن کی شکست، دو دفعہ کا حادثہ اسیری، ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اور اُس میں بے شمار دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کا قتل، جو باقی بچے تھے، اُن کی مفارقت زندگی بھر کی تنگدستی اور بڑھاپے کی مسلسل بیماریاں غالب جیسے حساس انسان کو پاگل کر دینے یا کم سے کم انھیں دنیا سے متنفر کر دینے اور قنوطی بنانے کے لیے کافی تھیں لیکن زندگی کے آخری دنوں تک غالب کے ہوش و حواس اس لیے قائم رہے کہ ان میں غیر معمولی قوت ارادی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے زندگی کے ساتھ مکمل طور پر مفاہمت کر لی تھی۔ یہ صرف اُن کا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ زندگی کا پورا حقیقی معنوں میں غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں ہی پروان چڑھتا ہے اور ان میں بھی دھوپ یعنی غم کو ہی خوشی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے :

رنج سے خوگر ہوا انسان تو بٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اس شعر میں محض شاعرانہ مضمون نہیں باندھا گیا بلکہ یہ غالب کی زندگی کی تفسیر ہے۔ غالب زندگی اور اُس کے مسائل کو ایک باشعور اور دانشور انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسی لیے مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں سے تنگ آکر انھوں نے زندگی سے فرار حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے مصائب و آلام نے اُن کی فکر میں بالیدگی پیدا کی اور اُن میں زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ جگایا اور وہ صبر و تحمل اور استقلال پیدا کیا جو ہر کڑی سے کڑی مصیبت کو ہنس کر جھیلنا سکھاتا ہے۔ ایسا ہی آدمی یہ شعر کہ بھی سکتا تھا :

تاب لائے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب نے "جان عزیز" کے لیے آرزو اور شکست آرزو، خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو "ہم ستم ہاے روزگار" نہیں بلکہ "ہم ستم ہاے روزگار" کہتے ہیں۔ اس "ستم ہاے روزگار" سے اُن کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور ان کی حس مزاح مانند نہیں پڑی بلکہ اوتسکھی ہوتی چلتی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی اُن تمام ناہمواریوں اور کھردرے پن پر سے ہنستے ہوئے برہنہ پا گزر جاتے ہیں، جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہو لہان ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تضادات کا احساس اور عرفان ہی ان تضادات کی نشتریت بھی ہے اور اس نشتریت کا اندازہ غالب نے ہمیں اپنی تحریروں میں خوب خوب کرایا ہے۔ غالب کے مزاح میں پھکڑ پن نہیں بلکہ زندگی کی بصیرتوں کا اور اس کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کا، تلخ زیادہ اور شیریں کم، حوصلہ مندانہ اور برملا اظہار ہے۔ غالب کے طنز اور اُن کی شوخی طبع دونوں کا سرچشمہ زندگی کی محرومیاں اور غم و آلام ہیں۔ اسی لیے اُن کا مزاح توانا اور جاندار ہے۔

غالب خط لکھتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی مصیبتوں کے بیان سے دوسروں کو بے چہر پریشان نہ کریں۔ وہ اپنے دکھڑے بڑے چکے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کے نام خط میں اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں، ان دوستوں کا ذکر کرتے ہیں، جنہیں انقلاب زمانہ نے اُن سے جدا کر دیا۔ پھر ایک دم بات کا رخ بدلتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اللہ اللہ اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مردوں کا تو مجھ کو کون روئے گا۔"

سنو غالب ! رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔

غالب کی ساری زندگی اپنی اُما کی نگہداری میں گزری۔ لیکن عملی زندگی میں جب غالب کی اُما بابر حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہے تو غالب اپنا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں :

”یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ  
تماشا بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا  
غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو، غالب کے ایک اور جوتی  
لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک

میرا جواب نہیں۔ لے، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ بیج تو یوں ہے کہ  
غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم، جیسا بادشاہوں  
کو بعد اُن کے ”جنت آرام گاہ“ و ”عرش نشین“ خطاب دیتے ہیں، چوں کہ  
یہ اپنے کو ”شاہ قلم و سخن“ جانتا تھا، ”سفر مقرر“ اور ”ہادیہ زاویہ“ خطاب  
تجویز کر رکھا ہے۔

آئیے، نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار  
بھوک سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی، حضرت نواب صاحب  
کیسے، اونغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی  
ہے، کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے نصیحت، کوٹھی سے شراب،  
گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام  
قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچنا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔“

ن خط میں غالب کی اُما کے شیش محل کے چکنا چور ہونے کی جھنکار صاف سنائی دے رہی  
ہے۔ یہ ظاہر غالب نے اپنی کمزوریوں، معاشی بد حالیوں اور محرومیوں کا مضحکہ اڑایا ہے،  
لیکن اس بذلہ سنجی اور شوخی بیان کی تہہ میں ناقابل بیان ذہنی کرب اور محرومی کا شدید احساس  
ہے۔ یہ صرف غالب کی داستان نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کے اس پورے  
طبقت کی داستان ہے، جو کبھی مسند اعتبار پر جلوہ افروز تھا، جسے سلجوقی اور افراسیابی ہونے



پرناز تھا، جسے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر گھمنڈ تھا اور جواب قرض پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ کامیاب ترین طنز وہی ہے جس کا شکار طنز نگار کی اپنی ذات ہو۔ کوئی دوسرا شخص ایسی بے رحمی سے غالب کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا جیسا کہ اس خط میں خود غالب نے اپنا مذاق اڑایا ہے۔

غالب نے نواب علاء الدین خاں علّائی کے نام ایک خط میں اپنی غربت اور معاشی بد حالی کا اس طرح مضحکہ اڑایا ہے :

”بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر مستھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں، کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بہ جان درویش، صبح کی تبرید؟ متروک چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس باتیں روپیہ مہینا بچا۔ روز مرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ

رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا، قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر ہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔

۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑا کلیجا چاہیے لیکن اپنی بات میں تاثیر محض کلیجے کے زخم بیان کر دینے سے نہیں پیدا ہو جاتی اس کے لیے کلیجا چیر کر دکھانا پڑتا ہے اور غالب ہم کو اپنا طرف دار بنانے کے لیے یہی تو کرتے ہیں۔

غالب کی صرف بڑھاپے کی تصویریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ جوانی میں وہ بہت وجیہ اور خوبصورت آدمی رہے ہوں گے۔ غالب کی جوانی کا حلیہ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :

”میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔۔۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔“

بنام مرزا حاتم علی مہر مارچ اپریل ۱۸۵۹ء

بڑھاپے کا آغاز ہوا، نو جوانی کے ساتھ ساتھ چہرے اور جسم کا حسن بھی رخصت ہونے لگا، ڈاڑھی اور مونچھ میں بھی سفید بال آنے لگے، دانت ٹوٹنے شروع ہو گئے، غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام خط میں بدلتے ہوئے حلیے کا نہ صرف مضحکہ اڑایا ہے بلکہ اپنی شخصیت کی انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں :

”جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی، مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا،

بھٹیاریہ، جولاہا، کنجڑا، منہہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی  
اُسی دن سر منڈوایا۔“

بنام مرزا حاتم علی مہر مارچ اپریل ۱۸۵۹ء

غالب کی ذاتی زندگی تورنج و الم کی ایک داستان تھی ہی، اُن کا پورا معاشرہ بھی غم اور  
افسردگی کا شکار تھا قتل، غارت گری، لوٹ مار اور ان سب کا نتیجہ بربادی، ویرانی اور  
بے رونقی۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالب موت کا شکار ہونے سے بچ گئے، لیکن  
انہیں موت سے بڑی سزا ملی، یعنی اُن جیسے حساس انسان کو اُن تمام خونیں واقعات کا پہلے  
خاموش تماشائی اور پھر اجڑی ہوئی دلی کا ماتم دار بننا پڑا۔ اپنے ماحول اور معاشرے  
کی بربادی اور تباہی پر غالب خون کے آنسو روتے ہیں لیکن انہوں نے صبر و ضبط سے  
بھی کام لیا ہے۔ حادثات کی ان تند و تیز آندھیوں میں بھی انہوں نے اپنی شوخی و ظرافت  
اور حس مزاح کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا۔ غالب اگر خون کے آنسو بہاتے ہیں تو اپنے  
نہیقہوں سے دوسروں میں زندہ رہنے کا حوصلہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ مرزا حاتم علی مہر  
نے غالب کے نام کئی خطوں میں حُزن و ملال کا اظہار کیا۔ دیکھیے غالب کیسے دلچسپ انداز  
میں انہیں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں :

”بندہ پرور! آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتنا شتاب  
لکھتا ہوں۔ مطالبہ مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ  
پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔  
پس، اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے، تو شکایت کی کیا گنجائش ہے، بلکہ یہ غم  
تو نصیبِ دوستان درخورِ افزائش ہے۔ بہ قول غالب علیہ الرحمۃ :

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو  
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں نہاں کیوں ہو



بنام مرزا حاتم علی مہر نومبر ۱۸۵۸ء

اس خط کے پہلے ہی فقرے سے غالب نے شوخی و ظرافت کی فضا بنا کر مہر کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر غم جاناں کے بارے میں ایک فلسفہ بیان کر کے ضبط اور حوصلے کی تلقین کی ہے۔ ان کی بات میں کہیں سے سنجیدگی کا شائبہ بھی نہ پیدا ہوا اس کے لیے خط کی عبارت کو بھی متغیٰ کر دیا۔

غالب فطرتاً ظریف الطبع ہیں۔ وہ معمولی معمولی چیزوں میں ہلنے اور ہنسانے کا موقع نکال لیتے ہیں۔ یوسف مرزا کے نام ایک خط میں غالب نے حافظ ممو کے مقدمے کے واقعات اس طرح لکھے ہیں :

”ایک لطیفہ پرسوں کا سنو! حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں، مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ ”میں“۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ ”میں“۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو، ممو مشہور ہوں“ فرمایا، یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، سارا جہاں بھی تم، جو کچھ دنیا میں ہے، وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں مسل داخل دفتر ہوئی میاں ممو اپنے گھر چلے آئے“

بنام یوسف مرزا جون جولائی ۱۸۵۹ء

ظرافت اور مکالمہ آرائی سے غالب نے پورے واقع کی بڑی دلچسپ تصویر کھینچ دی ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ظلم و ستم صرف ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب تک محدود نہیں رہے بلکہ بعد میں بھی وہ بہانے بنا کر ہندوستانیوں پر ظلم کرتے رہے۔ مسل داخل دفتر ہوئی، میاں ممو اپنے گھر چلے آئے“ ان دو چھوٹے چھوٹے فقروں میں

ہندوستانیوں کی بے بسی اور لاچارگی کا کیا خوبصورت اظہار کیا گیا ہے۔ نانا نصافیوں کی اس داستان کو لطیفہ بنا کر پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس خط کے آغاز میں غالب نے مرزا یوسف کے لڑکے کی وفات پر تعزیتی کلمات لکھے تھے۔ پھر غالب نے یوسف مرزا کے ماموں سید یوسف الدین حیدر کے حکم و دام جس کا ذکر کیا تھا۔ غالب پر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے دوران بہادر شاہ ظفر کا سکھ کہنے کا الزام تھا، غالب نے خط میں اس الزام کا بھی ذکر کیا تھا۔ ان تینوں واقعات کے بیان سے یہ خط بہت غم انگیز ہو گیا تھا۔ ان واقعات کا اثر کم کرنے کے لیے غالب نے حافظ مہموکا واقعہ بیان کرنے میں شوخی اور ظرافت سے کام لیا۔ اس لطیفے کے بعد اس خط میں غالب ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آدمی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ خواجہ بخش درزی بہت موٹے آدمی تھے۔ ان کے لیے ہاتھی کا استعارہ کیسا برجستہ ہے۔ لکھتے ہیں :

”ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا۔ میں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا“

بنام یوسف مرزا جون، جولائی ۱۸۵۹ء

غالب کے خطوط میں کہیں کہیں معمولی اور سطحی قسم کی ظرافت بھی ملتی ہے جس کا مقصد محض ہنسا ہنسانا ہے۔ مثال کے طور پر غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

”روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتے رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلاتا اور بات ہے“

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۲ جون ۱۸۵۶ء

علاء الدین خاں علّائی کے نام ایک خط میں مہینوں کے نام سے فائدہ اٹھا کر مزاح پیدا کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ اُن کی تعزیت آپ نے نہ کی۔

شعبان بیگ پیدا ہو گئے، کل اُن کی چھٹی ہو گئی۔ آپ شریک نہ ہوتے“

بنام علاء الدین خاں علّائی ۶ جنوری ۱۸۶۵ء

مرزا ہرگوپال تفتہ نے بہت دن سے خط نہیں لکھا۔ غالب اُن سے ظریفانہ انداز میں خط نہ لکھنے کی شکایت اس طرح کرتے ہیں :

”کیوں صاحب ! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے

دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں بھلا، اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تواستہار

ہو جاتا کہ زہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء

تفتہ کو خط لکھا تو غالب کو شاید خیال ہوا کہ خط کا وزن زیادہ ہو گیا ہے، کہیں بیزنگ

نہ ہو جائے۔ لفافے پر دو گنے ٹمکٹ لگا دیے اور خط میں اس کا اظہار اس طرح کیا :

”کیوں صاحب ! یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد

کو۔ آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳۱ اگست ۱۸۵۳ء

غالب اور مجروح کے ایک دوست حکیم میرا شرف علی نے سرمندوا ڈالا۔ غالب کو اُن کی

شکل دیکھ کر ہنسی آگئی۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

”کل حکیم میرا شرف علی آئے تھے۔ سرمندوا ڈالا ہے۔“ مُخْلِیقِیْنَ رُؤْسُکُمْ

پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سرمندوا یا ہے تو ڈاڑھی رکھو۔ کہنے لگے۔ دامن

از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ والٹر اُن کی صورت قابل دیکھنے کے ہے“



بنام میر مہدی مجروح (۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء)

غالب کو شاید بیکانیر کی مصری بہت پسند تھی۔ علّائی سے مصری کی فرمائش کرتے ہیں۔  
فرمائش کا انداز تو دیکھیے :

”خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم  
کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اُس کا کچھ خیال بھی آتا ہو، خدا کرے  
بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو، کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ  
میر جان صاحب اُس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں  
رشک سے اپنا کلیجہ چا بنے لگتا ہوں“

بنام نواب علاء الدین خاں علّائی ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء

میر احمد حسین میکش سے خرموں کی فرمائش کیسے دلچسپ اور پر لطف انداز میں کرتے ہیں :  
”بھائی میکش آفریں، ہزار آفریں ! تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے  
کس مزے کے ہوں گے، جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب :

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی، اُس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے، اُس کی تعریف کریں گے۔  
کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسنِ طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد  
غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرمے لے کر  
آوے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔ اگر بہ فرضِ محال تم یوں ہی عمل  
میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے، تو ہم بھی  
کہیں گے، تازہ شے بہتر بارہ سے بہتر۔“

غالب کی ظرافت زندگی سے مفاہمت کے جذبے کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ وہ  
اپنی تمناؤں اور امیدوں کی ناکامی پر قہقہے لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی

کمزوریوں اور صعوبتوں کا بے باکانہ اظہار کرتے ہیں بلکہ اُن کا مذاق اڑاتے ہیں، اُن پر ہنستے ہیں اور ہمیں ہنسنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ شاعری میں ”عرش سے پرے ایک مکان“ کا متمنی خطوں میں ایک عام انسان نظر آتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے پیر زمین پر مضبوطی سے جھے ہوئے ہیں اور جو مصائب و آلام کی تاریکیوں میں زندہ دلی اور شگفتگی کی پھلجھڑیاں چھوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالب کا سب کچھ لٹ گیا۔ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔ اس تباہی اور بربادی نے اُن کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اپنی زندہ دلی اور شوخی طبع کو ہتھیار بنا کر وہ ان حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مجروح کے نام ایک خط میں اپنی بربادی اور زبوں حالی کا ذکر کرتے کرتے اچانک رگِ ظرافت پھٹک اٹھتی ہے اور وہ ایسی بات لکھتے ہیں کہ جس سے مکتوب الیہ کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

”خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب پھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سنی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا“

بنام میر مہدی مجروح

”یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب، جب ایک چیز کھانے کو ہوتی، اگرچہ غم ہی ہو، تو پھر کیا غم ہے؟“

بنام میر مہدی مجروح

غالب اپنی کمزوریوں کا، اپنی بد حالی کا بے باکانہ اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ اس پر خود بھی ہنستے ہیں اور ہمیں بھی ہنساتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں، پیر جی۔ غالب اُن سے منہسی مذاق کرتے رہتے ہیں ایک دن اُن سے جو گفتگو ہوئی، اُسے غالب نے علائی کے نام ایک خط میں اس طرح لکھا ہے:

”پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں: کیا کہنا ہے! اور میں پوچھتا ہوں: کس کا؟ تو وہ فرماتے ہیں: مرزا شاد علی بیگ کا۔ ایں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں ہیرا سنگھ موجود ہے۔ واہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے، غالب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟ ہاں صاحب، آپ ایسے ہی وضع دار ہیں، اس میں کیا ریب ہے۔“

بنام علامہ الدین خاں علائی ۹ ستمبر ۱۸۶۲ء

غالب کبھی کبھی پُر لطف قصوں اور لطیفوں سے بھی اپنے خطوط کو دلچسپ بناتے ہیں۔ وہ عام طور پر فحش لطیفے اور قصے نہیں لکھتے۔ ہاں دو تین بار قاطع برہان اور قتیل کے سلسلے میں اُن کے قلم سے کچھ غیر مہذب الفاظ نکل گئے ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

غالب نے مجروح اور میرن صاحب کے تعلقات کے بارے میں ایسے مزاحیہ انداز میں گفتگو کی ہے کہ کہیں کہیں اس میں ذم کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن غالب کا اس قسم کے مذاق کا رشتہ اپنے شاگردوں میں صرف میر مہدی مجروح سے ہے۔ غالب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح بھی میرن صاحب کا ذکر مزے لے لے کر کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرن صاحب کے چہرے پر مہاسا نکل آیا۔ مجروح نے غالب کے نام خط میں اس مہاسے کے بارے میں انشا پر دازی کی ہوگی۔ غالب جواباً لکھتے ہیں:

”ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ نورانی پر مہاسا نکلا ہے، تم کو سرمایہ آرائش گفتار بہم پہنچا ہے۔“

بنام میر مہدی مجروح ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء



مجرع نے میرن صاحب کے بارے میں غالب کو کچھ لکھا۔ غالب کا موڈ ٹھیک نہیں تھا، ناراض ہو کر لکھتے ہیں :

”میرن صاحب کی تمھاری چوہا چاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں۔ تم جانو وہ جانیں“

بنام میر مہدی مجروح ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء

دہلی میں میرن صاحب کی سسرال تھی۔ ان کی بیوی دلی آئی ہوئی تھیں۔ غالب میرن صاحب کی بیوی کے بارے میں لکھتے ہیں :

”اجی وہ یوسف ہند نہ سہی، یوسف دہر سہی، یوسف عصر سہی، یوسف کشور سہی۔ اُن کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے“

بنام میر مہدی مجروح ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

ایک دفعہ غالب نے لکھا :

”میر مہدی نہیں کہ میرن پر مرتا ہوں“

بنام میر مہدی مجروح ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء

ایک دفعہ میرن صاحب کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ مجروح نے غالب کو اس کی اطلاع دی غالب کے ہاتھ دل لگی کا ایک موقع آ گیا۔ لکھتے ہیں :

”میاں کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمھارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار، چشم بیمار کو کیا جانو“

بنام میر مہدی مجروح اواخر مئی ۱۸۶۲ء

غالب نے ایک دفعہ میرن صاحب کو خط لکھا۔ انھوں نے جواب نہیں دیا۔ غالب نے

مجرّوح کے نام خط میں جواب کا تقاضا کیا۔ غالباً مجرّوح یہ بات میرن صاحب سے کہنا بھول گئے۔ غالب نے مجرّوح کے نام خط لکھا اور اس بھول جانے کی شکایت اس چھیڑ چھاڑ کے ساتھ کی۔

”حسن بھی کیا چیز ہے، نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم اُن سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو، میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔“

بنام میر مہدی مجرّوح

صرف ایک بار غالب نے اپنے خط میں مجرّوح کو میرن صاحب کے بارے میں ایک غیر شائستہ بات لکھی :

”بھائی ! تم نے بخار کو کیوں آنے دیا۔ تپ کو کیوں چڑھنے دیا ؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو تم مانع نہ آتے ؟ کیا تپ ابن بن کر آتی تھی جو اس کو روکتے ہوئے ٹہراتے ؟“

بنام میر مہدی مجرّوح

غالب انسانی رشتوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ اس طرح اگر کوئی ایسی بات کرتا جس سے غالب کو ذہنی تکلیف ہوتی تو وہ طنز و ظرافت کے پردے میں اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ غالب غصے میں کسی پر برس پڑے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ نے ”بروے استاد رنگ“ کی مثال میں کسی استاد کا مصرع لکھ دیا۔ غالب کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے اپنے طنز کے تیر کا نشانہ تفتہ کو اس طرح بنایا :

” سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں ” بروے استاد رنگ “  
کو کہاں سے سمجھتا “

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء

نواب انور الدولہ شفق کو کسی نے غالب کے وفات کی غلط خبر دے دی شفق نے بہت  
دن سے غالب کو خط نہیں لکھا تھا۔ جب یہ خبر غلط ثابت ہو گئی تو غالب کو خط لکھا  
اور اس میں اس افواہ کا بھی ذکر کر دیا۔ اس واقعے پر غالب کا حُسنِ اظہار ملاحظہ کیجیے:  
” آپ کی پرکشش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُننا،  
میری خبر نہ لی “

بنام نواب انور الدولہ شفق

علیگڑھ کے صدر امین شیخ مومن علی دہلی آئے ہوئے تھے اور غالب سے ملے بغیر واپس  
چلے گئے۔ غالب کی انا کو اس سے ٹھیس پہنچی۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:  
” اگر آپ سے (شیخ مومن علی کی) ملاقات ہو تو فرمائیے گا کہ اسد اللہ  
روسیاہ بعد سلام عرض کرتا ہے کہ وہ تبہ میرا تو کہاں کہ میں آپ سے  
شکوہ کروں کہ مجھ سے مل کر آپ نہ گئے، مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو  
خبر کیوں نہ ہوئی ورنہ تودیع کو پہنچتا “

بنام منشی نبی بخش حقیر

ما تم یک شہر آرزو

ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے جاگیرداری نظام میں ایسا بار بار ہوا ہے کہ  
حکومتیں بدلی ہیں کسی ایک فرد نے اپنی ذمات، شجاعت اور جوڑے توڑے سے اقتدار حاصل  
کرنا شروع کیا اور کچھ ہی عرصے میں حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آ گئی کچھ عرصے



تک حکومت اس کے خاندان میں رہی اور جب حکومت خاندان کے اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئی جنہوں نے اقتدار اپنے قوت بازو کے بل پر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ جنہیں یہ ورثے میں ملا تھا تو وہ دولت اور طاقت کے نشے کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور رفتہ رفتہ حکومت کسی اور خاندان میں منتقل ہو گئی۔ پھر کچھ عرصے بعد اُس خاندان کا بھی یہی حشر ہوا۔ غرض صدیوں تک یہ کہانی اسی طرح دہرائی جاتی رہی۔ اس کہانی کے کرداروں میں ہندوستانی نژاد بھی تھے اور وہ حملہ آور بھی جو بہت بڑی طاقت بن کر ہندوستان آئے تھے۔ حکومتوں کی اس تبدیلی کا اثر عام ہندوستانیوں پر بہت کم ہوتا تھا، صرف حملوں کے وقت ایک سیلاب خون آتا اور گزر جاتا اور پھر سب کچھ اسی طرح معمول پر آ جاتا۔ حکومتوں کی تبدیلیوں کا اثر ہندوستان کے تمدن اور معاشرت پر خاطر خواہ اس وقت پڑتا جب فاتح قوم مستقل طور پر ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لیتی۔ اس طرح کے حکمرانوں کے ساتھ جو علم اور جو فکر اور فلسفہ ہندوستان آیا ہے، وہ ہندوستانی فکر میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں تو ضرور کرتا رہا۔ لیکن وہ بنیادی خصوصیت جسے ہم ہندوستانیت کہہ سکتے ہیں، یہ ہر حال برقرار رہی — انگریز ابتدا میں ہندوستان میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خیال قدرے بعد میں آیا۔ انگریز اپنے ساتھ صنعتی نظام کی برکتیں لے کر آئے تھے، اس لیے انہوں نے غیر محسوس طریقے پر معاشرت، تہذیب، افکار و نظریات کی سطح پر ہندوستانی زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ جدید علوم بھی تھے جو نشاۃ ثانیہ میں مغرب نے حاصل کیے تھے انہیں علوم پر ترقی یافتہ صنعتی نظام کی بنیاد تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی فکر کے اثرات بھی ہندوستانی ذہن پر بڑھتے گئے۔

نائب نے جب ہوش سنبھالا تو مشرقی اور مغربی فکر یعنی نئی اور پرانی اقدار میں تشکیک اور تصادم شروع ہو چکا تھا۔ کلکتے میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے،

جہاں مغربی علوم کے ذریعے مشرقی نظام فکر کی بنیادیں ہلائی جا رہی تھیں اور جدید ایجادات کا مظاہرہ کر کے ہندوستانی ذہن کو حیرت اور احساس کمتری میں مبتلا کیا جا رہا تھا۔ سرسید کی مرتبہ "آئین اکبری" پر غالب کی تقریظ مغرب سے متاثر ہونے والے اس ذہن کی نشان دہی کرتی ہے۔

غالب کے دیکھتے ہی دیکھتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک زبردست اور طاقت ور برطانوی حکومت کی شکل اختیار کر لی۔ اس نئی حکومت کے سامنے ہندوستانی فکر نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستان کا آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر محض نام کا بادشاہ رہ گیا تھا جو دراصل انگریزوں کا پیشن خوار تھا۔ اہل علم طبقہ زندگی کے مثبت فلسفوں اور تصورات کی تازگی اور توانائی سے محروم ہو چکا تھا۔ سماج پر ایک مکمل تعطل اور جمود کا عالم تھا۔ برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے ہندوستان کے باشعور طبقے کو یقین دلادیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں جب برائے نام مغل حکومت کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ غالب اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجلیل جنون کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوان کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعہ طرچی کو کیا کیجے گا اور اُس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو"

(۱۸۵۴ء)

یہ گویا اس عہد کے ہر باشعور، حساس اور ذہین لیکن مجبور اور بے بس انسان کے دل کی آواز ہے، گویا صرف غالب کی نہیں بلکہ پورے سماج اور پورے عہد کی آواز ہے۔ غالب ایک طرف مغربی علوم، مغربی فکر اور سائنسی ایجادوں کا کھلے دل سے استقبال کرتے

ہیں اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے مخالف اور افسردہ بھی ہیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ پر قبضہ کیا تو غالب کو دلی صدمہ ہوا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

تباہی ریاست اودھ نے، با آنکہ بیگانہ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔

بنام قدر بلگرامی ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء

غالب کی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر تھی۔ انھوں نے اپنے عہد کے مردِ علم مثلاً مذہب، اخلاقیات، تصوف، منطق، ہدیت اور طب کا باقاعدہ نہ سہی لیکن تنقید بہت مطالعہ ضرور کیا تھا۔ اگر وہ تمام مشرقی علوم پر پوری قدرت حاصل کر لیتے، تب بھی نئے حالات کا صحیح اور مکمل تجزیہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتے، کیوں کہ نئے صنعتی نظام اور اس کے سہارے بڑھتے ہوئے برطانوی سامراج کے اقتدار اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے کے لیے یہ علوم کافی نہیں تھے۔ غالب مشرقی تہذیب کے مداح اور اس کے زوال کے ماتم گزار ہیں۔ چوں کہ تازہ ہوا کے لیے انھوں نے اپنے ذہنی دریچوں کو کھلا رکھا ہے، اس لیے وہ مشرقی اقدار پر تنقید بھی کرتے ہیں اور نئے نظام کا استقبال بھی۔ غالب اس راز سے واقف تھے کہ مغل شہنشاہیت کی تلواریں زنگ آلود اور اس کے درت بازو شل ہو چکے ہیں اور اب کوئی طاقت اس عظمت پارینہ کو واپس نہیں لا سکتی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ زوال کی آخری حدود کو چھونے والی مغل حکومت یا چھوٹی چھوٹی خود مختار صوبائی حکومتیں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روک نہیں سکتیں۔ غالب انحطاط پذیر طاقتوں سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے کبھی کبھی وہ اس نئے نظام سے اپنی امیدیں وابستہ کر لیتے اور اسی لیے اُن کی



وفاداری بھی منقسم تھی۔ وہ ایک طرف تو بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قصیدے لکھ لکھ کر انگریز افسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے قبل غالب نے کوشش کی تھی کہ ملکہ معظمہ سے براہ راست رابطہ قائم کریں۔ انھوں نے ۹ نومبر ۱۸۵۵ء کو ایک قصیدہ لارڈ الن برا کو بھیجا تھا تاکہ ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کیا جاسکے۔ قصیدے کے ساتھ غالب نے درخواست کی تھی کہ انھیں ملکہ کی طرف سے خطاب عطا ہو اور اُن کے موجودہ خلعت اور پنشن میں اضافہ کیا جائے۔ ابھی خط و کتابت جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہو گیا۔ جب تک ہندوستان کا پتہ بھاری رہا، غالب قلعے جاتے رہے اور جب ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی تو غالب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔

غالب نے ”دستنبو“ میں انقلابیوں کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنی جان اور آبرو بچانے کی فکر میں تھا۔ غالب نے بھی وہی کیا، لیکن انقلاب کے بعد غالب تقریباً بارہ برس اور زندہ رہے اور ان بارہ برسوں میں انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو بہت بڑی تعداد میں خطوط لکھے، لیکن کسی بھی خط میں مغل حکومت کے زوال پر اظہارِ افسوس نہیں کیا۔ مغل حکومت کے آخری تاجدار اور غالب کے مرقی اور محسن بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا تو غالب نے مجروح کو لکھا:

” ۷ نومبر ۱۲ جمادی الاول سال حال جمعے کے دن ابو ظفر سراج الدین

بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ “

بنام میر مہدی مجروح ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء

غالب کا یہ بیان کسی بھی جذبے اور احساس سے عاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو

مغل حکومت کے خاتمے اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا کچھ زیادہ غم نہیں تھا۔ انہیں بہ قول اُن کے غم یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں ”جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے“ غالب کو دراصل دلی، اہل دلی اور خود اپنی تباہی کا غم تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب قلعہ خوں سے کم نہیں تھا اور غالب اس کے شنوار رہے تھے۔ اب غالب کی زبانی اس قلعہ خوں کی داستان سُنئے :

”میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سوداقتی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، غم مرگ۔ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں : منظر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اُس کا بیٹا احمد مرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اُس کے دو بیٹے رضی خاں اور مرضی خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں اُن کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میرا احمد حسین میکیش، اللہ اللہ! اُن کو کہاں سے لاؤں، غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر جہدئ میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا اُن کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر اُن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اُن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ دتار ہے۔“

بنام یوسف مرزا ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء

عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے قتل نے غالب کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اگر وہ غیر معمولی قوتِ ارادی کے انسان نہ ہوتے تو پاگل ہو گئے ہوتے، انہیں اپنی بربادی کا غم تو تھا ہی لیکن دوستوں اور عزیزوں کے قتل اور تباہی نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

” یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے، اُس کا بیان تو معلوم مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اُس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اُس کو زلیت کیوں کہ نہ دشوار ہو، ہاے ! اتنے یار مرے کہ جو اب میں مردوں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ “

بنام ہرگوپال تفتہ جون۔ جولائی ۱۸۵۸ء

انگریز فاتح دلی کی عظیم الشان عمارتیں ڈھا رہے تھے۔ یہ کُداں پھاوڑ سے عمارتوں پر نہیں غالب کے دل و دماغ پر چل رہے تھے۔ ان عمارتوں کے ڈھائے جانے پر غالب تڑپ رہے تھے، لیکن محض تماشائی بنے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کی حالت غالب کی زبانی سنئے :

” پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے



تک بے مبالغہ ایک صحرائی ودق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہوکا مکاں ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کسی بانس نشیب تھا، اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی شترک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کاہلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جریل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرا سے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ، اللہ! دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔“

بنام میر مہدی مجروح ۱۸۶۱ء

ذرا جامع مسجد کا حال ملاحظہ ہو:

”جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ ”دار البقا“ فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑے ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔“

بنام میر مہدی مجروح ۸ نومبر ۱۸۵۹ء

اگرچہ اس خط میں غائب نے محض واقعات بیان کیے ہیں، لیکن ”رہے نام اللہ کا“ اور ”باقی خیر و عافیت ہے“ لکھ کر غائب نے اپنے ذہنی کرب کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

ایک اور خط میں غالب نے دلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی بربادی کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے کہ وہ خط نثری مرثیہ بن گیا ہے مختصر سے خط میں غالب نے اپنا کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

” او میاں سیدزادہ آزادہ، دلی کے عاشقِ دل دادہ۔ ڈھئے ہوئے  
اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں  
مہر و آرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین مسمون کہاں، ذوق کہاں،  
مومن خاں کہاں۔ ایک آزرده سو خاموش، دوسرا غالب، وہ بے خود و  
مدہوش نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تپا پانی ؟ ہاے دلی !  
وائے دلی ! بھاڑ میں جائے دلی !“

بنام میر مہدی مجتروح ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء

## عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

غالب کو نظم اور نثر دونوں میں اپنے اظہارِ پیروں تو پوری قدرت حاصل تھی لیکن اگر کبھی کسی کی وفات پر تعزیتی خط لکھنا ہوا تو انہیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب موت کے ذکر سے بہت گھبراتے تھے اور شاید اسی لیے تعزیت کے لیے انہیں مناسب الفاظ نہیں مل پاتے۔ اکثر غالب بہت مسروری انداز میں تعزیت کرتے ہیں۔ اگر کسی دوست یا شاگرد کو کسی کی موت کی خبر دیتے ہیں تو کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پس ماندگان کو تعزیتی خط لکھتے ہیں تو صبر و تحمل کی تلقین کر کے پیچھا چھڑا لیتے ہیں، اس طرح کے خطوں میں ایک آدھ بات ایسی ضرور لکھ دینے ہیں جس سے متعلقین کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ غالب کبھی کبھی ایسے خط میں بھی مزاح سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں جو انھوں نے یا تو تعزیت کے طور پر لکھا ہے یا جس میں کسی کی موت کی

کسی کو اطلاع دی ہے۔ ایسے تعزیتی خط چند ہی ہیں جو غالب نے دل جمعی کے ساتھ لکھے ہیں۔

غالب نے خاصی طویل عمر پائی تھی اس لیے اُن کے بیشتر دوست اور عزیز اُن کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں اُن کے بہت سے دوست آشنا اور رشتہ دار قتل ہوئے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ غالب موت کے ذکر سے گھبرانے لگے تھے۔ ہاں، اپنی موت کی خواہش کا اظہار بار بار کیا ہے، بلکہ مزے لے لے کر کیا ہے۔ ایک خط میں اس خواہش کا اظہار خاصے دلچسپ انداز میں اس طرح کرتے ہیں :

”زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف نہ مخبر کا خطر۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت، گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سرا سراسر نور :

یارب ! این آرزوے من چه خوش است

تو بدین آرزو مرا برساں “

بنام نواب حسین مرزا ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

انسانی نفسیات کچھ اس طرح کی ہے کہ فن کار خود اپنی موت کا ذکر تو بڑی انشا پر بازی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب دوسروں کو فی الحقیقت مرنے کا دیکھتا ہے تو خاصا خائف نظر آتا ہے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

”کثیر الاحباب شخص ہوں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا



ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ  
دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احیاء میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا  
معنی کہ جو میں مردوں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا  
میں ہو“

بنام حکیم غلام نجف خاں اپریل ۱۸۵۹ء

اسی لیے غالب تعزیت نامہ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے جذبات  
کی صحیح عکاسی نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط میں کی ہے۔ لکھتے ہیں :  
”چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ  
بہ زبان فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول  
نہ کیا۔ آرایشِ گرفتار، نظماً و نثرًا واسطے تہنیت کہے ہے کہ دل کثرتِ نشاط  
سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبعیت راہ دیتی ہے۔ الفاظ ڈھونڈے جاتے  
ہیں معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پڑ مردہ، خاطر افسردہ،  
جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف۔ جس  
بات کا تصور ناگوار ہو، اُس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بے قرار ہو“

بنام نواب کلب علی خاں ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء

حقیقت ہے کہ غالب کو دوسروں کی موت کا ذکر بہت ناگوار گزرتا تھا، اسی لیے وہ عام  
طور سے تعزیتی کلمات مختصر لکھتے ہیں۔ یہ مختصر کلمات کبھی کبھی محض رسمی الفاظ پر مشتمل ہوتے  
ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کے چچا کا انتقال ہوتا ہے تو غالب  
ان الفاظ میں تعزیت کرتے ہیں :

”میری جان! کن اولہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا  
کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت

وقوعی دے:

مرزا ہرگوپال تفتہ، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے لیکن جب تفتہ کی بیوی کا انتقال ہوا تو غالب نے سرسری انداز میں صرف اس طرح تعزیت کی:

”تمہارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی اُن چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھو میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں سہل میں ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں“

اسی طرح نجف خاں کی نواسی کے انتقال پر غالب لکھتے ہیں:

”حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھو کری قسمت والی اور حرمت والی تھی“

بنام حکیم غلام نجف خاں ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء

میاں داد خاں سیاح کے ہاں لڑکا پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ اس خبر سے بظاہر خود غالب کے زخم ہرے ہو گئے۔ غالب کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے، لیکن پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہ جیا۔ غالب لکھتے ہیں:

”تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو، حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم البہل دے۔“

بنام میاں داد خاں سیاح ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء

تاہم غالب کے ہاں اس قسم کے خطوں کی بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں غالب نے بہت مختصر لفظوں میں تعزیت کی ہے یا کسی کی موت کی اطلاع دی ہے لیکن اپنے مخصوص اسلوب سے اظہار کو غیر معمولی حد تک مؤثر بنا دیا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر کی بہو بیمار پڑیں تو

غالب کو خاصی تشویش ہوئی کئی خطوں میں اُن کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک دن خبر ملی کہ وہ الشکر کو پیاری ہو گئیں۔ یہ خاتون غالب کے عزیز ترین دوست منشی نبی بخش حقیر کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کی بیوی تھیں۔ حقیر کے رشتے سے غالب کو منشی عبداللطیف اور اُن کی بیوی دونوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان خاتون کی بیماری کے دوران غالب حقیر سے اُن کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جب ان کی وفات کی خبر سنی تو غالب کو دلی صدمہ ہوا۔ چنانچہ انتہائی مختصر مگر رقت آمیز انداز میں اس طرح تعزیت کرتے ہیں :

”ہاے ہاے، وہ نیک بخت نہ بچی۔ واقعی یہ کہ تم پر اور اس کی ساس پر کیا گزری ہوگی۔ لڑکی تو جانتی ہی نہ ہوگی کہ مجھ پر کیا گزری۔ لڑکا شاید یاد کرے گا اور پوچھے گا کہ اماں کہاں ہیں۔ یہ اس کا پوچھنا اور تم کو رلائے گا۔ بہر حال چارہ جز صبر نہیں ہے۔ غم کرو، ماتم رکھو۔ رو دو پیٹو، آخر خون جگر کھا کے چپ رہنا پڑے گا۔ حق تعالیٰ عبداللطیف کو اور تم کو اور یتیموں کی دادی اور پھپھیوں کو سلامت رکھے اور تمہارے دامنِ عطوفت و آغوشِ رافت میں اُن کو پالے“

بنام منشی نبی بخش حقیر ۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء

غالب کے ایک دوست میر افضل حسین خاں کا انتقال ہو گیا۔ غالب کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک خط میں ان کی وفات کا ذکر صرف ایک جملے اور ایک شعر کے ساتھ کیا ہے لیکن بے حد مؤثر انداز میں :

”ہاے ہاے میر افضل حسین خاں ہاے ہاے :  
رفتی و مرا خبر نہ کردی  
بر بیکی ام نظر نہ کردی“



بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۳ فروری ۱۸۵۴ء

مرزا ہرگوپال تفتہ کے جواں عمر اور لاڈلے بیٹے پتمبر سنگھ کی موت کی خبر غالب منشی  
نبی بخش حقیر کو اس طرح دیتے ہیں :

”یہ تو سب کچھ ہے، مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے۔ پتمبر سنگھ، اس کا لاڈلا بیٹا،  
مرگیا۔ ہاے، اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی :

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را  
چہ کند گوی کہ تن در نہد چو گاں را “

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء

تعزیت ناموں میں عام طور پر جن رسمی الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے، غالب نے ان  
الفاظ سے حتی الامکان گریز کر کے نیا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ نواب امین الدین  
احمد خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ نواب صاحب، غالب کے رشتے دار بھی تھے اور دوست  
بھی سرسری تعزیت نامے سے بات نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے غالب ایک انوکھا انداز  
اختیار کرتے ہیں اور انتہائی جدت سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

”بھائی صاحب ! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب  
میں تم کو کیا لکھوں، تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں : اظہارِ غم، تلقینِ صبر،  
دعاے مغفرت۔ سو بھائی، اظہارِ غم تکلفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے،  
ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانچہ عظیم  
ایسا ہے جس نے غمِ رحلتِ نوابِ مغفور کو تازہ کیا۔ پس، ایسے موقع پر صبر  
کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعاے مغفرت، میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر  
چوں کہ وہ میری مرتبہ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے :

بنام نواب امین الدین احمد خاں ۱۵ نومبر ۱۸۶۲ء

یوسف مرزا کے نام غالب کے کل بارہ خطوط ملتے ہیں۔ ان چند خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو یوسف مرزا سے بہت محبت تھی۔ پہلے ان کے بیٹے کی وفات ہوئی اور کچھ عرصے بعد والد کا انتقال ہو گیا۔ غالب کو دوسرے حادثے کا دلی صدمہ ہوا۔ انھوں نے اس موقع پر یوسف مرزا کو جو تعزیت نامہ لکھا ہے، اُس سے بہتر تعزیت نامہ ابھی تک اردو میں نہیں چھپا۔ اس تعزیت نامے میں اظہارِ ہمدردی بھی ہے اور صبر و تحمل کی تلقین بھی اور فکر و اسلوب کی جدت بھی۔ لکھتے ہیں :

”یوسف مرزا ! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہاے ! ایک کا کلیجہ کاٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو“

بنام یوسف مرزا ۱۹ مئی ۱۸۶۷ء

نواب یوسف علی خاں ناظم کی والدہ فتح النساء بیگم کا انتقال ہوا تو غالب کے لیے ضروری تھا کہ رسمی تعزیت نامہ لکھیں مگر یہ اُن کے بس کی بات کہاں تھی۔ دیکھیے کیسے مختصر لفظوں میں اپنا کام نکالتے ہیں :

”کل اُس (مرزا داغ) نے از روئے خطِ آمدِ رام پور، حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سُنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کر کر اور زیادہ منہموم ہوا، بیدار نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بہ طریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ

جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں :

از دست گدائے بے نوا ناپید هیچ  
جز اُن کہ بہ صدقِ دل دعائے بکند

بنام یوسف علی خاں ناظم ۲۷ رجب ۱۲۵۸ھ

اس خط میں غالب نے تعزیت نامے کے تمام رسمی الفاظ سے گریز کیا ہے۔ پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی توفیق عطا فرمانے کی دعا مانگی، نہ مرحومہ کے اوصافِ جمیلہ بیان کیے اور نہ اُن کے غریبی رحمت ہونے کا تذکرہ کیا۔ یہ غالب کا خاص انداز تھا کہ جب رسمی تعزیت نامہ قدر سے طویل ہوتا۔ تو اس میں باتیں ایسی ہوتیں، جو تعزیت نامے کا حصہ بن جانے کے باوجود براہِ راست تعزیت سے تعلق نہ رکھتیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام خط میں اُن کی والدہ کی وفات کے بارے میں چند الفاظ ہیں، باقی باتیں ادھر ادھر کی ہیں۔

شاید ہی دنیا میں ایسے خطوط لکھے گئے ہوں جو تعزیت نامے ہوں یا جن میں کسی کی موت کی اطلاع دی گئی ہو اور ان میں طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہو۔ غالب جب اس طرح کے خطوط لکھتے ہیں تو کبھی کبھی ان کی شوخی طبع اور بذلہ سنجی برقرار رہتی ہے۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ”غم آگیاں مضامین“ سے اُن کے خطوط زیادہ بوجھل نہ ہو جائیں۔ علی بخش خاں، غالب کے سسرالی رشتے دار اور عزیز دوست تھے ممکن نہیں کہ غالب کو اُن کی وفات کا صدمہ نہ ہوا ہو۔ علاقائی کے نام خط میں اُن کی وفات کا ذکر ایک فقرے میں کرتے ہیں اور پھر اس صدمے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے مرحوم کا ایک ایسا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں، جسے پڑھ کر مکتوب الیہ ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھتے ہیں :

”علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہتر وال برس شروع ہوا ہے۔“



اس نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ جنرل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہونکر سے جو محاربات ہوتے ہیں، اُس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے، جاہ جاتلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی، اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جنرل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہو گے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔ خدائش بیا مرزا و بدین دروغ ہاے بے نمک گیراد۔“

بنام نواب علامہ الدین خاں علّاتی ۵ جولائی ۱۸۶۴ء

مرزا حاتم علی تہر کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا۔ غالب نے تعزیت نامہ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا کہ اس میں غم و اندوہ کا اظہار بھی ہو گیا اور کچھ چھیڑ چھاڑ بھی۔ مقصد غالب کا یہ کہ تہر کا غم کچھ ہلکا ہو اور ان میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا ہو۔ غالب لکھتے ہیں :

”ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پنیسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی، ابتداءے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو، چنا جان، نہ سہی، متا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا

اور ایک حور ملی ؛ اقامت جاودانی ہے اور اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ  
زندگانی ہے ، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ ہے ہے !  
وہ حور اجیرن ہو جائے گی ، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی ۔ وہی زمر دین کلخ  
اور وہی طوبی کی ایک شاخ ، چشم بد دور ، وہی ایک حور بھائی ، ہوش میں  
آؤ ، کہیں اور دل لگاؤ ۔

بنام مرزا حاتم علی بیگ تہر جون سنہ ۱۸۶۱ء

غالب کے خطوط





# مزاہر کوپال تفتہ

(۱)

صاحب!

دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا۔ نہ اصلاح کو جگہ نہ تحریر بطور کا بیج و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورقہ زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہ ہر حال اب مجھے چھنے پڑے ہیں سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا، میرا قصور نہ جاننا۔

"بلا رباے" اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے۔  
"ربا" اُس کا مخفف ہے :

خاربا اور رابشا افشائیم کہ چوں خواہد شدن  
بہت خوب اور معقول۔ میں اُس وقت خدا جانے کس خیال میں تھا: "چوں خواہد شدن"  
و "کنوں خواہد شدن" ردیف و قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ ”بے پیر“ تورانی بچہ ہاے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعارِ اُردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعرِ فارسی میں کیوں کرا جازت دوں گا؟ مرزا جلال اتیسر علیا الرحمۃ مختار ہیں اور اُن کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ اُن کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ ایران ایسا لفظ لکھے۔

”شست بستن“ جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرے میں اُن کے پیر دیں۔ ”بے پیر“ ایک لفظ نکال باہر ہے ورنہ صاحبِ زباں ہونے میں اتیسر بھی ظہوری سے کم نہیں :

زادہ! این سخت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی  
حق غفورست، گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زادہ سے یہ سوال غلط کہ ”چہ شدی“ تراچہ شد، سوال ہو سکتا ہے۔ پھر ”گناہے شدہ ام“ یہ جواب مہمل۔ ”گناہے کردہ ام“ جواب ہو سکتا ہے۔ یہاں تم کہو گے کہ ”ہم تن گناہ“ یا ”سراپا گناہ“ یا ”سراسر گناہ شدہ ام“ یہ جواب اُس جواب سے سراسر بے ربط ہے۔ جب تک ”ہم تن گناہ“ نہ ہو، معنی نہیں بنتے ہرگز ہرگز۔ اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمہارا ہی رہا اور نکال کے موافق ہو گیا۔ عجب ہے تم سے کہ صرف ”شد ام“ اور ”تا چہ شود“ کے پیوند میں الجھ کر حقیقتِ معنی سے غافل رہے :

باز آرد دلِ خود از چنین کار

آزار چہ می کنی دلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے مگر ہاں، اُس نے ایک وجہ کھڑی ہے، یعنی ”آزردن“

مصدر اور آزار دہ ”مضارع“ اور آزار امر۔ امر بمعنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد

”کردن“ کے ساتھ پیوند پاتا ہے۔ خیر رہنے دو :



کند آں آہوے وحشی ز برم فردارم

یہ شعر موید میرے کلام کا ہے۔ برادرم و "زردارم" و "سردارم" و "فسردارم" یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں، الفِ ممدودہ کہیں نہیں۔ ہاں "بودارد" و "زودارد" و "فرودارد" تمھارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعراُستاد کا نہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاء الدین: مامقیمان کوے دلداریم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے۔ اُن کو فقر و فہا و سیر و سلوک میں سمجھنا چاہیے نہ اندازِ کلام میں: پر مور است شمشیرے کہ بر مورے میان دارد

بھائی "خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی ناز کی کی سند نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک مضمون ہے "کمر" مور، و "تلوار" پر مور۔ وجہ تشبیہ: علاقہ پر مور با مور، مانند علاقہ شمشیر با میان۔ نزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں۔ انصاف شرط ہے، تلوار کی خوبی "تیزی" ہے یا "ناز کی؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ باندھو۔ "خو" میں اور "تلوار" میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو شعر سے ہاتھ اٹھاؤ۔

میاں "خمیدن" بھی صحیح اور "چمیدن" بھی صحیح۔ اس میں کسی کو تردد ہے؟ مگر لغت اور محاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے باؤنی لوگوں کو "خم و خم" بولتے سنا ہے۔ آج تک کسی نظم و نثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا مجھ کو بھی پسند، مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں سے نہ سنا ہو اُس کو کیوں کر صحیح جانوں؟ "چمید" صغیر ماضی کا ہے "چمیدن" سے اور "چمیدن" ایک مصدر ہے صحیح اور مستم۔ "چمد" مضارع۔ "چم" امر۔ اس میں کیا گفتگو ہے؟ کلام "خم و خم" میں ہے۔

سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اُن کا جواب لکھ دیا، اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب ان اوراقِ طلسمی کو دیکھو

تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جلتے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا، میں بہت گھبراتا ہوں۔

”خمیدست“ و ”رسیدست“ میں ”نزنی درست“ یہ قافیہ درست ہے۔ مگر ”است“ کا الف سب جگہ اڑا دو اور یاد رہے کہ صرف سین تے کافی ہے، الف ضرور نہیں۔  
۱۸۴۷ء یا اس سے قبل  
غالب

(۲)

مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ یہ ہر حال مجھ کو، کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں اپنا ثبوت ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھالوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حبیب تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، بہ موجب فرمائید جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اُس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھنا تو اُس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر، تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر، اُس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیتے۔ اس سے زیادہ بھٹی میری روش نہیں۔ ظاہر اتم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیش تر اس نظم و نثر کو

مہل کہیں گے، کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ چلوگ کہ قنیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم و نشر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟ ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو ماء الجبن سے بھی نہ گیا؟ ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سودمند ہے مگر اثر اُس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اُس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اُس کو جوش کریں، اس قدر کہ چہام پانی جل جاوے۔ پھر اُس باقی پانی کو چھان کر، کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جاوے، اُس کو پییں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی دن رات، جب پیاس لگے، یہی پییں۔ تبرید کی حاجت پڑے، اسی پانی میں پییں۔ روز جوش کر ڈاکر، چھو کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اُس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے اُن کو اختیار ہے۔

مئی ۱۸۴۸ء

(۳)

بھائی !

یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے، فن تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان سادجی و ظہیر کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعے کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کرنی کس واسطے؟ واہ واہ! سبحان اللہ! اور یہ جو تم کو "فر" کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سوکھا سہا شعر ظہوری کا لکھا، بڑا تعجب ہے۔ یہ لفظ میرے ہاں "پنج آہنگ" میں دس ہزار جگہ آیا ہوگا۔ "فر" اور "فرہ" لفظ فارسی ہے۔ مرادف "جاہ" کے۔ پس "جاہ" کو اور اس کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھیے؟ "عالی جاہ" اور "سکندر جاہ" اور "منظر فر" اور



”فریدیوں فر“ یوں بھی درست اور صرف ”جاہ“ اور ”فر“ یوں بھی درست۔ اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو ”خطاب بہادری“ کہنا بہت بے جا ہے۔ سنو، خطاب کے مراتب میں پہلے تو ”خانی“ کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے۔ مثلاً ایک شخص کا نام ہے: ”میر محمد علی“ یا ”شیخ محمد علی“ یا ”محمد علی بیگ“ اور اُس کو خاندانی بھی ”خانی“ نہیں حاصل۔ پس جب اُس کو بادشاہ وقت ”محمد علی خاں“ کہہ دے تو گویا اُس کو ”خانی“ کا خطاب ملا اور جو شخص کہ اُس کا نام اصلی ”محمد علی خاں“ ہے یا تو وہ قوم افغان سے ہے یا ”خانی“ اُس کی خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو ”محمد علی خاں بہادر“ کہا۔ پس یہ خطاب ”بہادری“ کا ہے، اس کو ”بہادری“ کا خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب ”دولگی“ کا ہے۔ یعنی مثلاً ”محمد علی خاں بہادر“، اُس کو ”منیرالدولہ محمد علی خاں بہادر“ کہا۔ اب یہ خطاب ”دولگی“ کا ہوا، اس کو ”بہادری کا خطاب“ نہیں کہتے۔ اب اس خطاب پر افزائش ”جنگ“ کی ہوتی ہے۔ ”منیرالدولہ محمد علی خاں بہادر شوکت جنگ“ ابھی خطاب پورا نہیں۔ پورا جب ہو گا کہ جب ”ملک“ بھی ہو پس پورے خطاب کو ”خطاب بہادری“ لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمہارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔

اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر دیجئے، یعنی قطعوں میں لکھ دیجئے۔ جب تمہارا دیوان چھاپا جاوے گا، یہ قطعہ بھی چھپ جاوے گا مگر ہاں، منشی صاحب کے سامنے اس کو پڑھیے اور اُن سے استدعا کیجئے کہ اس کو آگرے بھیجے تاکہ چھاپا ہو جاوے ”اسعد الاخبار“ میں اور ”زبدۃ الاخبار“ میں یقین ہے کہ وہ تمہارے کہنے سے عمل میں لا دیں گے۔ مجھ کو کیا ضرور ہے کہ میں لکھوں میں نے یہاں ”صادق الاخبار“ میں چھپوا دیا ہے۔

کیوں مہاراج؟

کول میں آنا اور جناب منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیوں کر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے۔ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی، نہ لکھا کہ میں کیوں کر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تنک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بالو صاحب سے کہاں جا ملوں گا۔ خیر اب جو میں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا ہے، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔

تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں، بالو صاحب کی، میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں؟ ہر چند انھوں نے لکھا ہے کہ اکبر آباد، ہاشم علی خاں کو بھیج دو لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کروں گا یا تم جو لکھو گے، اس پر عمل کروں گا۔

بھائی ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ چارم جنوری ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔ آپ کا وہ خط جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا، پہنچا۔ بالو صاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنا جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا، سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رند کے، پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد درست ہو گئے اور اصلاح اور اشائے اور فوئد جیسا کہ میرا شیوہ ہے، عمل میں

آیا۔ جب تک کہ اُن کا یا تمہارا خط نہ آوے اور اقامت نگاہ معلوم نہ ہو، میں وہ کو اغذ ضروری کہاں بھیجوں اور کیوں کر بھیجوں اور کیوں بھیجوں؟ اب جو تمہارے لکھنے سے جانتا کہ اُنہیں ضروری تک اکبر آباد آؤ گے تو میں نے یہ خط تمہارے نام لکھ کر لفافہ کر رکھا ہے۔ آج اُنہیں دیا ہے، پرسوں اکیسویں کو لفافہ آگرے کو روانہ ہوگا۔ بالو صاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیے تھا، وہ خاتمہ اوراقِ اشعار پر لکھ دیا ہے۔ تم کو چاہیے کہ اُن کی خدمت میں میرا سلام پہنچاؤ اور سفر کے انجام اور حصولِ مرام کی مبارکباد دو اور اوراقِ اشعار گزراؤ اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خلتے پر مرقوم ہے اُس کو غور سے پڑھیے اور اپنا دستور العمل گردانیے؛ نہ یہ کہ سرسری دیکھیے اور بھول جائیے۔ بس تمام ہوا وہ پیا کہ جو بالو صاحب کی خدمت میں تھا۔

اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ وہ جو تم نے اُس شخص ”کوئی“ کا حال لکھا تھا، معلوم ہوا۔ ہر چند اعتراض اُن کا لغو اور پرسش اُن کی بے مزہ ہو، مگر ہمارا یہ منصب نہیں کہ مقرض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں۔ تمہارے شعر پر اعتراض، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے، گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول استوار ہے۔ جو زبان داں ہوگا، وہ سمجھ لے گا۔ غلط فہم و کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں۔ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے انبیاء کے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں بار بار سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمہارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اُس پر گرفت کر سکے مگر ہاں؛ حسود را چہ کم کو ز خود برنج درست

والسلام والکرام۔



(۶)

بندہ پرورش از پیش و کم از کم یہ ترتیب بہت نصیح ہے اسکو کھانے سے منع کرنا ہے اور حلال اسیرت  
یہ بہت بہت پاکیزہ اور خوب ہے اسکی معنی یہ ہے کہ در زمان صبح ہر شے از پیشی شدہ و در زمان  
وفا کم از کم شدہ آتش کی کھینچا سہمی تو تخی کر کا لخت و ستر ہے منع اور نو مہر اور وفا سہمی از پیش  
اور کم از کم ہے بار ہے کہ بہتر از پیشی اور کم از کم اگر چہ مجھے جائز ہے لیکن نہ صحت سہمی  
کم ہے جس از پیشی و کم از کم افصح ہے شعر فقہ را خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے کہ قسین  
غایم کم و بھر سہمی تہ ترا کم لہ مارا لیکن ناندہ سے صریح ہیں اگر کتر ہو تاؤ اور اچھا تھا  
بہر حال اتنا خیال رہے کہ ایسے جگہ ترکا لفظ افصح ہے چنانچہ برا شعر ہے کہ جگہ کن مت مت  
از ذرہ کمتر نیست حسن با این تا بنا کہ قندہ سہمی تہ سے درہ چشم توبہ از روزن دیوار کم  
بہت بہت ہے اور رسوم ہوتا ہے اور براہ مندر کا ترجمہ رہا تا ہے فارسی نہیں رہے کہ  
سہمی شمار زندگانے اچھا ہوتا ہے کہ میں اس مطلع کو بون دست کو با ہے  
را بچانست زندگانے اچھا ہوتا ہے کہ میں اس صورت ہی یہ مطلع کیا  
ہو گیا تھا کہ میر دہی آئے تھے ہر نگو نہ تھن اور خدا ہی زمی میں غزل کہوں مگر  
بہر میں نہ حست نہ اور تھو در دہ حضرت نے مد خطہ نہیں فرمایا یہ خط جو تہ  
مجھ لکھا ہے شراب کے نشے میں تھا ہے اور وہ اصداد اراق ہے اسے نام میں خطہ  
فرماتے ہیں اب کلمہ تاکہ زندگانے اسکو توفیق کی اور مطلع رہے جو کہ وہ  
بہت خوب ہے جینہ مولانا ظہور کا ملام ہوتا ہے ہاں اس اعلیٰ کو عری  
دیکھا کہ ہمارے گنت تر ضایع نجا و رنج کی آنا جہ میں جمع ہے ایسے کچھ جو

بہنیں ہے مگر بغیر کے نزدیک جمع جمع نہیں ہے مثلاً معاً چندہ اور احکام صمد اور  
اسرار چندہ یہ آدھ کر کہہ سکتا ہے مگر ان آمال یا یہ کہتے شہرت ہے سے حصار خزان  
گرفت خطاست ہما اپنے تہذیب کا کام ہے افلاطون سند کہن اموث سے ہر نام  
مثلاً حضرت حافظ نے کہا ہے سے صلیح کار کا درخواب کی ۔ بنی تفاوت در الگست تا کمی  
میر رنج ایسے موقع میں یہ جینے کہ بزرگوں کا کلام کہ ہم مورد اعتراض کی غیر اور جدا سے

مردِ نیکو غیر گوارا نہیں رکھیں گے کچھ کو اور برا نہیں رکھیں گے حضرت صلیبؑ کی شہرت  
 فتنہ شخص کے انتقال کے بغلط البتہ برابر ہے موجبِ مدح ہے مگر یہ کون درقہٴ عظیم  
 بر لٹا کہ ہے کہ جہاں اخبار اس کو چھا ہی آپ سطور اٹنا اعتناء فرمائیے کہ گرانہ  
 آفتابِ بیدارِ مگر دربرِ درہ کشتہ نشہ نوحہ خوانِ مژدہ جن کا لہجہٴ بک مکان ہے  
 آیا ہنرِ بجا مار دیکھتے ہیں ایک عیہ کراہے کو لیکر اوس میں رہتا ہنر و انکا ہزار ہا  
 تحفیف کراہے دیکھتے نہ ہنر کا یہ صفت کا یہ صفت سے رہتا ہنر و انکا ہزار ہا  
 لکھ، اگر میرِ خطِ بر حبت مکانِ کفن کے نہیں ہے درویشی سے ہر سدا کا ہے  
 مگر اس بل کونان نہ لکھا کرو محمدؐ بے ماران لکھا کرو اور انصاف ہمارے نفسی بارِ حبت کمال  
 لکھو مسہلی سے فراغت ہوئے اور عزاء کیسا ہے اور اب حمیرا دوانے آؤ ہمارے کتب  
 بائیکا میرا سلام ہے کہہ دیجئے السلام اسدِ محرابِ شہرِ لب و لہجہ کا ہے

بندہ پرور!

”بیش از بیش و کم از کم“ یہ ترکیب بہت فصیح ہے، اس کو کون منع  
 کرتا ہے؟ اور جلالِ اسیر کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ  
 ”ورزمان من مہر بیش از بیش شد و در زمان تو وفا کم از کم شد“ استاد کیا کہے گا؟ اس  
 میں تو تین ٹکڑے کا لفظ و نشر ہے: ”من اور تو“ ”مہر اور وفا“ ”بیش از بیش“ اور  
 ”کم از کم“۔ یاد رہے کہ بیشتر از بیش اور کمتر از کم اگرچہ یہ حسبِ معنی جائز ہے لیکن  
 فصاحت اس میں کم ہے۔ ”بیش از بیش و کم از کم“ افصح ہے۔ وہ شعر تمھارا خوب  
 ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے:

قیس! از تو نہ ایم کم، ولے صبر۔ بیش است ترا، کم است مارا

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر ”کمتر“ ہوتا تو اور اچھا تھا۔ بہ ہر حال، اتنا خیال رہے کہ  
 ایسی جگہ ”تر“ کا لفظ افصح ہے، چنانچہ میرا شعر ہے:

جلوہ کن، منت منہ، از ذرہ کمتر نیست  
حسن با این تابناکی، آفتابے بیش نیست

”ورنہ چشم توجہ از روزن دیوار کم است“ یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے، نارسیت نہیں رہتی۔ ”سہل شمار زندگانی ہا“ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے:

رایگاں است زندگانی ہا  
می توان کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئی تھی کہ تم کو نہ دیا اور خود اس زمین میں غزل لکھوں مگر پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا! یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے، شراب کے نشے میں لکھا ہے، اور وہ اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب ”گلہ“ تاکہ زندگانی ہا“ اس کو موقوف کیجئے اور وہ مطلع رہنے دیجئے، کہ وہ بہت خوب ہے، بعینہ مولانا ظہوری کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی! ہمارے اوراق اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو، ہماری محنت تو ضائع نہ جاوے۔

”ایامے چند“ میں جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے، بلکہ فقر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے۔ مثلاً معانی چند“ اور ”احکام چند“ اور ”اسرار چند“ یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ہاں ”آمال ہا“ یہ کھلی سورٹھ ہے۔ خطاے بزرگان گرفتار خطاست، ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھر رہے۔ مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کجا  
بہیں تفاوت رہ از کجا تا کجا



بیری جان ایسے موقع ہیں یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم مورد اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور بُرا نہ کہے گا حضرت وائے کور۔

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی بہ غلط، الغبنہ میرا بھی موجب نلال ہے مگر یہ کون واقعہ عظیم بولناک ہے کہ صاحبان اخبار اس کو چھاپیں۔ آپ اس طرف اتنا اعتنا نہ فرمائیے :

گرماہ و آفتاب بمیرد، عزامگیں

در تیروز بہرہ کشتہ شود، نودہ خواں مخواہ

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ بتی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا، تحفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے۔ اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے ”وردہلی بہ اللہ برسد“ کافی ہے، مگر اب ”لال کنواں“ نہ لکھا کرو، محلہ ”بتی ماراں“ لکھا کرو۔ اور ہاں صاحب، ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال نکھو۔ مسہل سے فراغت ہوئی، اور آج کیا ہے؟ اور اب اجیر اور وہاں سے آؤ پہاڑ کو کب جائیں گے؟ یہ اسلام بھی کہہ دیجئے گا۔ والسلام۔

اسد اللہ

محررہ دوشنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء

(۷)

کاشانہ وال کے مادر و ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتا، تحریر میں کیا کیا سحر ترازیاں کہتے ہیں۔ اب عزور پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب!

یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اُس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع، میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب اُن عالم صورت کے پوتوں سے، کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھکتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں؛ میں نہیں تنگ آتا تو اُن معنوی پوتوں سے کہ اُن میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا؟ آپ اُن کو جلد میرے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دیجئے کہ میں اُن کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد اُن کو تمہارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور اُن کو دولت و اقبال دے اور تم کو اُن کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں، یعنی نتائج طبع کو فروغِ شہرت اور حسن قبول عطا فرما دے۔

بابو صاحب کے نام کا خط، اُن کے خط کے جواب میں پہنچا ہے، اُن کو دے دیجئے گا۔ اور ہاں صاحب، بابو صاحب اور تم آج کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا۔

لکاشہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء  
اسد اللہ

(۸)

کل تمہارا خط آیا، رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہو، اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمہارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دل!

تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پر یہ حادثہ پڑا ہوتا یا تو اس  
 بلا میں گرفتار ہوا ہوتا، تو کیا کرتا؟ عیاذ باللہ! اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ  
 یہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو بلکہ یہ بھی زائد ہے جو دوست سے  
 کہیے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہر حال، دوست کی دوستی سے کام  
 ہے، اُس کے افعال سے کیا غرض جو محبت و اخلاص اُن میں تم میں ہے، بہ دستور بلکہ  
 روز افزوں رہے۔ ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے، نہ سہی:

وصلے کہ در آں ملال باشد

ہجر الیہ ازاں وصال باشد

آمدم بر سر مدعا؛ تمھاری رے ہم کو اس باب میں پسند۔ عجب طرح کا پیچ پڑا کہ  
 نکل نہیں سکتا نہ تم کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ اُن کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع  
 میں سوائے اس کے کہ تماشائیِ نیرنگِ قضا و قدر بنارہوں، کچھ بن نہیں آتی:

بہ بینم کہ تا کردگارِ جہاں

دریں آشکارا چہ دارد نہاں

جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسناکانہ  
 ادھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں، پہرا ہو گیا ہوں۔ سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ  
 رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہو گیا  
 ہوں اور ایک بہت بڑا و صبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا تھا مگر  
 ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ نائدہ اٹھاؤں کچھ اپنے  
 کسی عزیز کو واپس داخل کروں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے:

تا نہال دوستی کے بروہ

حالیہ نقیم و تنخے کا شیم



صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا، آج کل آجائے گا؛ پھر اُس کے جزو دان کی تیاری کر کے روانہ کر دوں گا۔ ابھی کول میں آرام کرو، اپنے بچوں میں اپنا دل بھلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبر آباد چلے جائیو، وہاں اپنا دل بھلائیو۔ دیکھو اس خودداری میں اُدھر سے کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں۔ والسلام۔

جمعہ دہم دسمبر ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۹)

صاحب!

دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی ”بیش و بیشتر“ کا قصہ زکلا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو، یاے تختانی تین طرح پر ہے: جزو کلمہ:

مصرع: ہمارے ہر سر مرغان ازاں شرف دارد

مصرع: اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یاے تختانی ہے، جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسرے تختانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے، ہمزہ وہاں بھی محل

ہے، جیسے: آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ تو صیغی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ ”فدائے تو شوم“۔ ”رہنائے تو شوم“ یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسرے دو طرح پر ہے: یاے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسرے طرح:

توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: ”آشنائی“۔ یہاں ہمزہ ضرور بلکہ

ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: ”آشنائے“ یعنی ایک آشنا، کوئی آشنا۔

یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، وانا نہ کہاؤ گے۔

”نیم گناہ“ و ”نیم نگاہ“ و ”نیم ناز“ یہ روزمرہ اہل زبان ہے۔ ”نیم“ بمعنی اندک۔  
 و ”گناہ“ کا آدھا اور ”نگاہ“ کی ادھواڑ اور ناز آدھا، یہ مہلات میں ہے، ان چیزوں کا  
 مناصف کیا؟ اگر تم کو ”نیم گناہ“ پسند نہیں، ”تازہ گناہ“ رہنے دو۔  
 ”خستہ“، ”بستہ“، ”تازہ“، ”غازہ“، ”خانہ“، ”دانہ“، ”آوارہ“، ”بیچارہ“  
 ”روزہ“، ”بوزہ“، ہزار لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یاے توحید آتی ہے تو  
 اُس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ ”زہ“، ”گرہ“، ”کلاہ“، ”شاہ“  
 ”آگاہ“، ”آگہ“، ”صبحگاہ“، ”صبحگہ“؛ ایسے الفاظ کے آگے اگر تختائی آتی ہے تو ”زہ“  
 ”گرہ“ ”کلاہ“ ”شاہ“ ”آگاہ“ ”آگہ“ ”صبحگاہ“ ”صبحگہ“ لکھ دیتے ہیں۔

غالب

۱۸۵۲ء

(۱۰)

واہ، کیا خوبی قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب  
 منشی جی کا خط آتا ہے اور اُن کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ خط آیا اور خیر و  
 عافیت معلوم نہ ہوئی۔ یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے اور پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔  
 سنا صاحب! یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلاوا بھی اس  
 سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہنے ہو گئی، البتہ کچھ دیر میں  
 افاقہ ہوگی۔ بعد افاقہ ہونے کے، تم مجھ کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرنا۔  
 میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

ابو صاحب کا خط آیا تھا، پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو  
 آگے بھیجا تھا۔ تمھاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرزِ تحریر سے فراوانی  
 محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اُن کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں، ضرورت  
 کو کیا کریں؟ جلد پھر آئیں گے۔ آپ اُن کو اپنے پاس ہی تصور فرمائیے۔

بابو برگوبند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہوں گے جو آپ کے خط میں اُن کی بندگی لکھی آئی۔ کیوں انھوں نے تکلیف کی؟ یہ سمجھ جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے اُن کا مکان اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہو گئے، اب بندگی سلام کیا ضرور؟

ہاں صاحب، یہ تم نے اور بابو صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر ”اٹلی کے محلے“ کا پتا لکھتے ہو۔ میں بتی ماروں میں رہتا ہوں۔ اٹلی کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہر کار سے مجھ کو جانتے ہیں، ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔ آگے کالے صاحب کے مکان میں رہتا تھا، اب بتی ماروں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اٹلی کا محلہ کہاں اور میں کہاں۔

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کے ساتھ گئے ہیں اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے میں، بلکہ اپنے کام کو بہر صورت، اب آگے ہوں گے، میرا سلام کہیے گا اور اپنی خبر و عافیت کے ساتھ اُن کی معاودت کی خبر لکھیے گا۔ ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تاثر ہے گا۔ ”نظر شگفتن“ و ”گوش شگفتن“، ہم نہیں جانتے، اگرچہ منشی ہر گوپال تفتہ اور مولانا نور الدین ظہوری نے لکھا ہو:

نظارہ باز خونِ دلم گل در آستین

خونش مگو، بگو کہ ز چشم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ ”چمن از چشم چکیدن“ ”شگفتن گوش و نظر“ کی مانند غرابت رکھتا ہے۔ یہ ”خونفشانِ چشم“ کا استعارہ ہے اور ”خونفشانِ“ صفتِ چشم ہو سکتی ہے۔ اگر ”نظر کا خوش ہونا“ اور ”کان کا شاد ہونا“ جائز ہوتا تو ہم اُس کا استعارہ ”شگفتنِ گوش“ کر لیتے۔ ”خوش ہونا“ جب صفتِ چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں؟

یاد رہے یہ نکات سوائے تمھارے اور کو میں نہیں بتاتا ہوں۔ میری بات



کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہوں مگر ہاں ایسی تکرار جیسی ”بیش اور بیشتر“ کے باب میں کی تھی، ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ لکھوں گا، تم کو اُس کے لکھنے کو کیوں منع کروں گا؟

اے صد ہزار راز بہناں اندریں سخن  
گر کم سخن توئی، نگہت کم سخن مباد  
ہرچہ بالفلس خود کنم ز بدی  
نیکیش نام می توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں، رہنے دو :

سرنا کا مہم سلامت باد  
کام را کام می توانم کرد

میں نہیں سمجھا کہ اس کے معنی کیا ہیں؛ کام کو کام سب کر سکتے ہیں اس میں لطف کیا ہے؟

ز تزلزل تازی آں ناز میں سوار ہنوز  
ز سبزہ میدمد انگشت زینہار ہنوز

حزین کے اس مطلع میں واقعی ایک ”ہنوز“ زائد اور بے ہودہ ہے؛ مبتدع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزین تو آدمی تھا؛ یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ جانا اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی تمھارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اُس میں تو ”مکنید“ متعمم معنی ہے، ”مکنید“ زائد نہیں ہے۔ مگر خرابی یہ کہ اگر فارسی رہنے دو تو اور اگر

ہندی کرو تو، مصرع مہمل اور بے معنی ہے :

چہ گل چہ لالہ چہ نسرتین چہ نشتین مکینید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا موتیا، کیا چنپا نہ کرو، ز نہار نہ کرو۔ یعنی کیا نہ کرو؟ اب جب تمہیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو، تب کوئی جانے ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ ذکر نہ کرو۔ اے تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرو۔ حضرت! ”ذکر“ مضاف کیوں کر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرتین و نشتین کی طرف؟ کہو گے کہ ”ذکر“ کا لفظ نہیں، ”بیان“ کا لفظ اوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ ”بیان“ کا لفظ رستوں سے اور زنجیروں سے ان چار لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطوع لکھو، ترجیع بند لکھو یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں، مہمل محض ہے۔ والسلام۔

اسد اللہ

(۱۱)

دسمبر ۱۸۵۲ء

بھائی!

پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمہارا اور ایک خط جانی جی کا لایا۔ تمہارے خط میں اوراق اشعار اور بالو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار دو دن سے مجھ کو وجع الصدر ہے اور میں بہت بے چین ہوں، ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بالو صاحب کے بھیجے ہوئے کو اغذتم کو بھیجتا ہوں، اشعار بعد دو چار روز کے بھیجے جائیں گے۔

اسد اللہ

مرسلہ جمعہ ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء

(۱۲)

بھائی!

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔ جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو اور اگر وقت نہ رہا ہو تو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشا تشویش واضطرار

کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجا بھرت پور کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی۔ کل سے اور بڑی جبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو، یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت ہے؟ راجا کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اسی علاقے میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبان انگریزوں نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے یعنی جو رئیس مرجاتا ہے، سرکار اُس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادے کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے، مگر یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں مختار کون ہے اور ہمارے بابو صاحب میں اور اُس مختار میں صحبت کیسی ہے؟ رانی سے ان کی کیا صورت ہے؟ تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو لیکن انھوں نے ازراہ دوراندیشی تم کو متوسل اُس سرکار کا کر رکھا ہے اور تم مستغنیانہ اور لالبا لیاہ زندگی کرتے تھے، زہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آ پڑا ہے جانی جی کے ساتھ روشناس حکام والا مقام ہونا۔ پس چاہیے کول کی آرامش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یوں آیا ہے اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے؟

جانی جی بھرت پور آئے ہیں یا جمیر میں ہیں، کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے، نہ مختصر نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منفتح جو کچھ واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور جلد لکھو کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے کل شام کو میں نے سنا، آج صبح قلعے نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر ازراہ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں بڑا ک



کے لوگ بیزنگ خط کو غزوری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے؛ جب اُس محلے میں جانا ہوتا ہے تو اُس کو بھی لے جاتے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔

نوشتر چاشتگاہ دوشنبہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

غزوری، جواب طلب۔

(۱۲۰)

پرسوں تمھارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔ غزلیں دیکھ رہا تھا، آج شام کو دیکھنا تمام ہوا تھا۔ غزلیوں کو رکھ دیا تھا؛ چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں، کل نو بجے دس بجے ڈاک میں بھیج دوں، خط کچھ ضرور نہیں؛ میں اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا، جانی جی کا خط لایا۔ اُس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اُس کا تم کو لکھوں؛ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ یہ طریق ایجاز یہ ہے کہ غرضی گزری دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا۔ راجا صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک مقدمہ اپنا سعد اللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے، وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نئے اجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں اور اب اجنٹ، علاقہ بے پور کی راہ سے نہیں آتا؛ آگرے اور گوالیار، کرولی ہوتا ہوا آج میر آئے گا اور اس راہ میں بے پور کا عمل نہیں۔ پس چاہیے کہ راول جی اُسے پھر آویں۔ اُن کے آئے پر غرضی کا جواب ملے گا اور اُس میں دیوان کی رسید بھی ہوگی۔ بھائی، جانی جی تم کو بہت ڈھونڈتے ہیں اور تمھارے بغیر بہت بے چین ہیں۔ میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں نہ اُن کو کچھ سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لا کھٹی نہ لٹے۔ ہاں، یہ بھی جانی جی نے لکھا تھا کہ کل بہت دن کے بعد منشی جی کا خط آیا ہے۔

(۱۴)

آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھنٹہ کی گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا۔ بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہو گئے، مگر ایک امر میں حیران ہوں کہ کیا کروں، یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہوا، میرے پاس بھیجا ہے اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اُس کو اُلٹا میرے پاس بھیج دینا۔ حال اُن کہ خود لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سپاٹو یا آبو جاؤں گا اور آج پانچویں ہے۔ بس، تو وہ کل روانہ ہو گئے، اب میں وہ خط کس کے پاس بھیجوں؟ ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا، جب وہ آکر مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دیں گے، تب وہ خط ان کو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ کیا خط ہے، خط نہیں، مینڈھوالال کا بیٹھ غماز کی عرضی تھی یہ نام مہاراجا بکینڈہ باشی، سعایت بابو صاحب پر مشتمل کہ اُس نے لکھا تھا کہ ہردیو سنگھ جانی جی کا دیوان اور ایک شاعر دہلی کا دیوان مہاراجا جے پور کے پاس لایا ہے اور جانی جی کی درستی روزگار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے، اور اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے اُن کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے، میں نے اُن کو لکھا تھا کہ تم کو میرے سر کی قسم، اب ہردیو سنگھ کو بلوالو۔ میں امر جزی کے واسطے امر کلی کا بگاڑ نہیں چاہتا۔ اُس کے جواب میں انھوں نے وہ عرضی بھیجی اور لکھ بھیجا کہ راجا مرنے والا ایسا تھا کہ ان باتوں پر نگاہ کرتا، اُس نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے پاس بھیج دی تھی۔

بارے، اس خط کے آنے سے جانی جی کی طرف سے میری خاطر جمع ہو گئی مگر اپنی فکر پڑی یعنی بابو صاحب آبو ہوں گے، اگر ہردیو سنگھ پھر کر آئے گا تو وہ بغیر اُن کے ملے اور اُن کے کہنے مجھ تک کا ہے کو آئے گا۔ خیر، وہ بھی لکھتا ہے

کہ راول کہیں گیا ہوا ہے، اُس کے آئے پر رخصت ہوگی۔ دیکھیے، وہ کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اُس کے آتے ہی رخصت ہو بھی جائے۔  
تمھاری غزل پہنچی، یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمھارے پاس، گھبراننا نہیں۔  
واللہ اعلم۔

ذکاء شنبہ شنبہ روز و روزنامہ  
ومرسلہ چار شنبہ ششم اپریل ۱۹۵۳ء  
جواب طلب۔

از اسد اللہ

(۱۵)

بھائی!

ہاں میں نے "تبدیۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبر آباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ راجا مر، رانی نہیں مری۔ ابھی ریاست کا کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ صورتِ انتظام جانی بیج ناتھ کے آنے پر موقوف ہے۔ یہاں تک اُس دوست کی تحریر ہے۔ ظاہر اُس کو بالو صاحب کا نام نہیں معلوم، اُن کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اُس دوست نے یہ طریقِ اخبار لکھا ہے۔ اُس کو میری اور جانی کی دوستی کا بھی حال معلوم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے تمھارے دوست کا کام بنا رہے گا۔ آمین یا رب العالمین۔  
صاحب، بے پورہ کامقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ ہم اُس کا خیال کریں۔ ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اُٹھی۔ راجا لڑکا ہے اور چھپچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی صورت نکل آتی، اور یہ جواب لکھتے ہیں کہ راجا تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیشِ نظر رکھتا ہے، یہ بھی تو آپ از روئے تحریر منشی ہرز بوس گم کہتے ہیں۔ اُن کا بیان کیوں کر دل نشیں ہو، وہ بھی جو



بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپیے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے، ہولی ہو چکی اور میں بے کر چلا۔ بھاگن، چیت، بدیا لکھ، نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے؟ آگے تو بھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور! بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں سو سو روپیے کی۔ ایک تو میرا احمد حسین میکش کے واسطے، راجا صاحب کی طرف سے، تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو، یہ طریقہ نذر شاگردی۔ بعد اُس کے دو ہنڈویاں سو سو روپیے کی، بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں، میرا احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے چار سو اور اُس سے علاوہ تین سو، اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے، اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے، اگر وہ دو برس کے ہیں، تو دو برس میں اور اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

ہاں صاحب! یہ وہی میرا اسم علی صاحب ہیں جو میرے پرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا تھا، وہ ایک خط میرا صاحب کے نام کا، کوئی میاں حکمت اللہ ہیں اُن کا، میرے مکان کے پتے سے لایا تھا، وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میرا صاحب آجاویں تو تم ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت اگر میرے واسطے نہیں تو اس خط کے واسطے آپ دلی آئیے۔

مئی ۱۸۵۲ء

(۱۶)

بھائی!

تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپیے کا نوکر یا سپن دار قرار دیا ہے جو دس بیس روپیہ مہینا قسط آرزو رکھتے ہو؟ تمھاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔

اگر اسیاناً تم دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہوتے تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ یہ حال خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپیہ مہینہ پنشن انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا، تا ادا سے زر۔ ابتداء جون ۱۸۵۳ء یعنی ماہ آئندہ سے یہ قسط جاری ہوگی۔

بابو صاحب کا خط تمہارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے، وہ درنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں اُن کے عذر چاہنے سے مراجعات ہوں۔ ہاے اتفاق! آج میں نے اُن کو لکھا اور کل راجا کے مرنے کی خبر سنی۔ واللہ باللہ! اگر دو دن پہلے خبر سن لیتا تو اگر میری جان پر آہنتی، تو بھی اُن کو نہ لکھتا۔

جے پور کے آئے ہوئے روپیے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی شاید آج شام تک یا کل تک آ جاوے۔ خدا کرے، وہ آلو پہاڑ پر سے ہنڈوی روانہ کر دیں، ورنہ پھر خدا جلنے کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھینچنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے نہ مصارف ہردیو سنگھ اسی میں سے مجرالیں، میری کمال خوشی ہے، اور یہ نہ ہو تو پچیس ہردیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔

منشی صاحب کا ایک خط ہاترس سے آیا تھا؛ کل اُس کا جواب ہاترس کو روانہ کر چکا ہوں۔ واللہ عا۔

محررہ دوشنبہ ۲ مئی ۱۸۵۳ء

از اسد اللہ

(۱۷)

عجب تماشا ہے! بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہردیو سنگھ آگیا اور پانسو روپیے کی ہنڈوی لایا، مگر اُس کے مصارف کی بابت اُنہیں روپیے کئی آنے اُس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے ہیں، سو میں اپنے پاس سے ملا کر پانسو پانسو کی ہنڈوی تنجہ کو بھیجتا ہوں۔ میں نے اُن کو لکھا کہ مصارف ہردیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا، تکلیف نہ کرو۔ پچیس یہ میری طرف سے ہردیو سنگھ کو اور

دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو۔ سو بھائی! آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وجہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرض داروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے، وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں کہ وہ سیکرٹا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں۔ تیس روپیے کی کون سی ایسی بات ہے۔ اگر مصارف ہر دیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا؟ انتہیں اور پیچیں، چوتن روپیے نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔

لفٹے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے، وہ بھی ابھی نہیں آئے بااں ہمہ یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؟ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی تو ظاہر کوئی وجہ نہیں ہے تاچا کثرت انتظار سے عاجز آکر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اس کا جواب مجھ کو لکھو اور اپنی رائے لکھو کہ وجہ دنگ کی کیا ہے؟ زیادہ، زیادہ۔

مرقومہ پنجم جون ۱۸۵۲ء روز یک شنبہ

اسد اللہ

جواب طلب۔

(۱۸)

تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی کا ہاترس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہ دینا۔

یہ تمھارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، یعنی بہت محتاج ہوں۔ سود و سو میں میری پیاس نہیں بجھتی، تمھاری ہمت پر سوہرا آفریں۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار با تھ آجالتے تو میرا



قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی، تمھاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بیچ رہیں گے، سو وہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے، وہ بہ قدر پندرہ سے سولہ سے کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بالو صاحب سے منگوائے گئے تھے، وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے، قیمت اُس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال ہے، سو وہ دے دیے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بالو صاحب کا خط مع ہنڈوی آ جاوے۔

بالو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کو اغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے، وہ میں نے پنجشنبہ چھبیس مئی کو پارسل میں اُن کے پاس روانہ کر دیے اور اُس میں لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ پندرہ دن آج پورے ہوئے۔

لکاشتر پنجشنبہ نہم جون ۱۸۵۳ء

از اسد اللہ

(۱۹)

بھائی!

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی عرضی اور پچیس کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بالو صاحب نے پچیس ہر دیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال، ہنڈوی بارہ دن کی معیاد کی تھی، چھ دن گزر گئے تھے، چھ دن باقی تھے، مجھ کو صبر کہاں؟ متی کاٹ کر دیے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا، بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس ہیں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہ۔

بھائی صاحب آگئے ہوں تو میرا قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اور میرا  
سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں اُن کو خط لکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آجائیں  
تو آپ کا ہلی نہ کیجئے گا اور اُن کے پاس جائیئے گا کہ وہ تمہارے جو یاے دیدار ہیں۔  
سہ شنبہ ۱۴ جون ۱۸۵۳ء  
اسد اللہ (۲۰)

بھائی!

میں نے مانا تمہاری شاعری کو۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ  
سخن سے فرہمت نہ ہوگی۔ یہ جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دلچسپ  
شعر لکھنے کا، اس میں ضرور نشستِ معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو کچھ لکھو اُس کو دوبارہ دوبارہ  
دیکھا کرو۔

کیوں صاحب! یہ ذیل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد کو  
آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا؟ کیا سنسی آتی ہے تمہاری باتوں پر،  
خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے۔

جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ اُن کا حال لکھو۔ تمہارے  
خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ یقین ہے کہ اجمیر میں  
ہوں گے؛ مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے کب چل  
نکلیں۔ یہ بہر حال، تم بھرت پور سے قریب ہو اور اُن کے متوسلوں کو جانتے ہو؛  
اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگواؤ اور جو کچھ تم کو معلوم ہو، وہ مجھ کو بھی لکھو۔  
منشی صاحب مع منشی عبداللطیف کول میں آگئے۔ کل اُن کا خط مجھ کو آیا تھا،  
آج اُس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

اسد اللہ

یکشنبہ ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء

(۲۱)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔ کل ایک رقعہ میرے پاس آیا۔ کوئی صاحب ہیں عطار اللہ خاں اور نامی تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اُس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں، پڑھ کر حال معلوم کرو گے۔ تمہارے شعر میں جو تردد تھا، اُس کا جواب میں نے یہ لکھا ہے، تم کو بھی معلوم رہے :

رفت آنچہ بہ منصور شنیدی تو دمن ہم

اے دل، سخنے ہست نگہدار زباں را

تردد یہ کہ ”آنچہ بہ منصور رفت“ نہیں دیکھا۔ ”آنچہ بہ منصور رفت“ درست ہے۔ جواب : باے موحده ”علی“ کے معنی بھی دیتی ہے۔ پس، جو کچھ ”بر“ سے مراد تھی، وہ باے موحده سے حاصل ہو گئی اور اگر باے موحده کے معنی معیت کے ہیں تو بھی درست ہے۔ نظیری کہتا ہے :

شادی کہ غبن میکشی و دم نمی زنی

در شہر این معاملہ با ہر گدا رود

اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں ”معاملہ“ ہے اور اُس شعر میں ”معاملہ“ کا لفظ نہیں جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے۔ نظیری کے ہاں ”معاملہ“ مذکور ہے اور تفتہ کے ہاں مفرد ہے۔ ”رفت“ کا صلد اور تعدیہ باے موحده کے ساتھ دونوں جگہ ہے۔ والسلام۔

اسد اللہ

اکتوبر ۱۸۵۲ء



(۲۲)

”دید مست“ یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمھارا میں نے تو سمجھ لیا، مگر زہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ ”المعنی فی بطن القائل“ کے یہی معنی ہیں۔

”چشمانِ پُر خمار“ و ”چشمانِ بے حیا“ ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو۔ ان سب اشعار میں نہ عیب نہ لطف۔

دیکھو صاحب، خطا میں تم پھر وہی ”یش و بیشتر“ کا قصہ لائے ہو۔  
”چہ مجرم“ و ”چہ سبب“ و ”چہ گناہ“ پر جو سند لاتے ہو:

عشق است و عد ہزار تمنّا، مرا چہ مجرم

اس کی حاجت کیا ہے؟ ”جاناں مدوے“ ”یاراں مدوے“ یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی، تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا۔  
دیکھو رفیع السودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو، نہ دین کو نقبہاں مجھ سے

باعثِ دشمنی اے گبر و مسلمان مجھ سے؟

غالب کہتا ہے:

مجھ تک ب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام

ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

یعنی ”اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ڈرتا ہوں“ یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں، مگر:

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں:

اگر دریافتی بروانشت بوس  
وگر غافل شدی، افسوس، افسوس !

روز جمعہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء

از اسد اللہ

(۲۳)

بندہ پرور !

ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا۔ یقین ہے کہ بابو صاحب تمھارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدے کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اس خط کا جواب تمھارے پاس سے آئے گا، تب تمھارے اشعار تم کو پہنچیں گے۔ ہاے ہاے میر تقی میر حسین خاں ! ہاے ہاے :

رفتی و مرا خبر نہ کر دی

بر کبھی ام نظر نہ کر دی

یہاں یہ سنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا اُن کا، اُن کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بہ دستور نائب رہے۔

اسد اللہ

۲۳ فروری ۱۸۵۴ء

(۲۴)

منشی صاحب !

تمھارا خط اُس دن یعنی کل بڑھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب حرارت مزاج میں بہت ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی ! اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔

بابو صاحب والا مناقب کا خط تمھارے نام کا دیکھا۔ اب اُس ارسال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے؛ کیوں تکلیف کریں، اور اگر بہر حال اُن کی مرضی ہے تو خیر، میں فرماں پذیر ہوں۔ اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں۔ بعد اچھے ہونے کے، اُن کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار تر تھیں لکھی گئی ہیں۔

اسد اللہ

روز پنجشنبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء

(۲۵)

شفیق میرے لالہ ہر گویا پال تفتہ میرا تصور معاف کریں اور مجھ کو اپنا نیاز مند تصور فرماویں۔ آپ کا پارسل اور آپ کا خط سابق و عنایت نامہ حال پہنچا۔ جواب نہ لکھنے کی وجہ: ایک تو یہ کہ میں بیمار، چار مہینے سے تپ لرزہ میں گرفتار۔ دم لینے کی طاقت نہیں، خط لکھنا کیسا۔ بارے، اب فرصت ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ کول تو معلوم، مگر مکان آپ کا نہیں معلوم، خط لکھوں تو کس پتے سے لکھوں؟ ہاں، آپ نے سرنامے پر چاہ گرامہ لکھا، میں یہ نہیں لکھ سکتا؛ کس واسطے کہ یہ ”حام کے کنویں“ کی مٹی خراب کر کر، اُس کو ”چاہ گرامہ“ لکھا ہے۔ اسما و اعلام کا ترجمہ فارسی میں کرنا، یہ خلاف دستور تحریر ہے۔ بھلا اس شہر میں ایک محلہ بلی ماروں کلبے؛ اب ہم اُس کو ”گرہ کشاں“ کیوں کر لکھیں؟ یا اہلی کے محلے کو ”محلہ ترمندی“ کس طرح لکھیں؟ بہر حال، ناچار تمھاری خاطر سے احمق بننا قبول کیا اور وہی لفظ مہمل لکھ کر خط بھیج دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ بھائی! میرا دل اب شعر و سخن و امارت و ریاست و دین و دنیا و مرگ و زلیات کو فر و اسلام سے سر ہو گیا ہے، مگر تمھاری خاطر سو یہ خوب یاد رہے کہ جتنی دیر میں تم ایک نئی غزل لکھ سکتے ہو، مجھ سے اتنے عرصے میں آپ کی ایک غزل کو اصلاح نہیں دی جاتی۔ جلدی نہ کرو اور میرے طور پر رہتے دو۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس قدر تمھاری جو کہ از قسم



غزلیات ہیں، وہ سب دیکھ کر بھیج دوں گا۔ نصف دیوان سابق دیکھ چکا ہوں، نصف باقی ہے، مگر اب خدا کے واسطے، جب تک یہ آپ کا کلام نہ پہنچے اور کلام نہ بھیجے، کہ میں گھرایا جاتا ہوں۔

اسد اللہ خاں

جون ۱۸۵۴ء

(۲۶)

میر اسلام پہنچے۔ خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔ سابق و حال ابھی سب یوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگرچہ گرمی رفع ہو گئی، مینہ برسے لگے، ہوائے سرد چلنے لگی، مگر دل مکرر ہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔

بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولی عہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہ رکھا تھا، اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کہ لیا اور عید کو دونوں پڑھ دیے۔

بھائی منشی نبی بخش صاحب کو پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا، اُن سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے اُن کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی بہ گوپال صاحب کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل لے لیں۔ اس کے سوا اور جو کچھ تمہارے خط میں لکھا تھا وہ جواب طلب نہیں، اور یوں ہی ہے جو تم سمجھے ہو۔

اسد اللہ

جولائی ۱۸۵۴ء

(۲۷)

صاحب!

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو، یوں کا تھ لیت۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ، آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر، اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے، میں کہاں تک

دیا چہ لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اُس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔  
اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے  
دوسرے دیوان میں اُس کو بھی درج کرو۔

صاحب! جہاں تقطیع میں "الف" نہ سملے وہاں کیوں لکھو؟

اپریل، مئی ۱۸۵۵ء

اسد

(۲۸)

تمہارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا، واقعی اُن چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت  
دُشوار ہو گا۔ دیکھو، میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں صبر کرو اور صبر نہ کرو گے  
تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظِ صحت  
کے واسطے مسہل لیا ہے۔ تمہارے اشعار غور سے دیکھ کر مہبائی منشی نبی بخش صاحب  
کے پاس لفافہ تمہارے نام کا بھیج دیا ہے؛ جب تم آؤ گے، تب وہ تم کو دیں گے۔  
جہاں جہاں تردد و تامل کی جگہ تھی، وہ ظاہر کر دی ہے اور باقی سب اشعار یہ دستور  
رہنے دیے ہیں۔ اب تم کو یہ چاہیے کہ کول پہنچ کر مجھ کو خط لکھو۔ اس لفافے کی  
رسید اور اپنا سارا حال مفصل لکھو۔ اس میں تساہل نہ کرو۔ بابو صاحب کے خط کا  
جواب اجمیر کو روانہ کر دیا جائے گا، آپ کی خاطر جمع رہے۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔  
قبل ۱۸۵۵ء

اسد اللہ

(۲۹)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں  
ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش  
آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اُسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے

تمھارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہً مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اُس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی بہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام بھی دلی اور اُس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے؛ لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان، اس شہر میں نہیں ملتا؛ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحبِ بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نذر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبانِ عالی شان سے عہدے لے لیا تھا کہ بروقت غارتِ دہلی، یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ بالذات جانتا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے مفصل حال لکھتے ہوئے دڑتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں نہ تھے۔ بے ہیں میں غریب شاعر دس دس برس سے تاریخ لکھتے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں؛ خواہی اُس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی



پڑا شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے؛ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مجبوروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے؛ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پلتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یا زوہم منی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک یہ دستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے، مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال، غشی حساب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

اسد اللہ

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

۱۱۔ خط نمبر ۱۸۵۷ = ۱۸۵۸ = ۱۸۵۹ (۲۰)

آج سنیچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا، وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے توکل پہنچ جائے۔

میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کرو گے؟ بینک گھر میں سے خدا کرے، تمہارا روپیہ مل جائے۔

۱ بھائی! میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا، کسی

مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بد خواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، وارڈ گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں، جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنس نہیں پایا۔ کہو، یہ نو دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔ ہر گوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والد دعا۔

روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء  
وقت نیم روز

(۳۱)

از عمر و دولت برخوردار باشند۔

بدھ کا دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے، ڈاک کا ہزارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا۔ سو روپیے کی ہنڈوی بیل؛ جو کچھ کہیے، وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر نیل کے کڑے چلا گیا۔ سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپیہ واروغہ کی معرفت اکٹھے تھے، وہ دیے گئے۔ پچاس روپیہ محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپیہ باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپیے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو، یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے، اگر جلد آگیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خاتم کو جتیار رکھے اور اجر دے۔ بھائی! بُری آئندہ انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

چار شنبہ ۳ فروری ۱۸۵۸ء وقت دو پہر۔

غالب

صاحب!

تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا، تمہارے اس خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ جواب تو لکھ سکتا تھا، مگر کلیان کا پاؤں سوچ گیا تھا، وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا، ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔ بعد چند روز کے جو کہارا چھا ہوا تو میں تم کو آگرے میں سمجھ کر سکندر آباد خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمر الدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا۔ کل اُن کا خط آیا، وہ لکھتے ہیں کہ مرزا لفتہ ابھی یہاں نہیں آئے اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔

میرا حال بدستور ہے۔ دیکھیے، خدا کو کیا منظور ہے، حاکم اکبر نے آکر کوئی نیا بندہ بست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشناے قدیم ہیں مگر میں مل نہیں سکتا، خط بھیج دیا ہے۔ سنو کچھ جواب نہیں آیا۔ تم لکھو کہ اکبر آباد کب جاؤ گے۔ والد دعا۔

غالب

جمعہ ۵ مارچ ۱۸۵۸ء

جان من و جانان من!

کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا، شام کو تمہارا خط آیا، معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد پہنچے خیر، وہ خط پوسٹ پیڈ گیا ہے۔ شاید اٹانہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا تو خیر۔ آج یہ خط تم کو اکبر آباد بھیجتا ہوں، پہنچتے پر جواب لکھنا۔ تقطیع رباعی کی بہت خوب! مگر خیر، ہر ایک بات کا ایک وقت ہے۔ ہم کو ہر طرح لطف صحبت اور لطف شعرا کھالینا۔

بھائی منشی نبی بخش صاحب کے نام کا خط پڑھ کر اُن کو دے دینا اور اس کا



مضمون معلوم کر لینا۔ جس حاکم کو میں نے خط اور قطعہ بھیجا ہے، اُس کے سررشتہ دار کوئی صاحب ہیں، من پھول اُن کا نام ہے، مجھ سے نا آشنائے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو استدعا کرتا کہ اس تحریر کو پیش کیجے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی تو تم ہی اوپر اوپر خط لکھ کر اُن کو بھیج دیتے کہ غالب ایک فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم ہے، اُس کے حصولِ مطالب میں سعی سے دریغ نہ کرنا:

می تو اں آورد استغنا سفار شنامہ

چرخ کج رورا اگر دایم کز بارانِ کسیت

باقی جو حال ہے وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ

لو گے، دوبارہ لکھنا کیا ضرور۔

شنبه ۶ مارچ ۱۸۵۸ء

جواب طلب۔

(۳۴)

صاحب!

تمہاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفریں۔ تم کو یوں ہی چاہیے تھا لیکن میں نے تو ایک بات بہ طریقِ تمنا لکھی تھی، جیسا کہ عربی میں ”لیت“ اور فارسی میں ”کاشکے“ اب تم رودادِ سنو، عرضی میری سر جان لارنس، چیف کمشنر بہادر کو گزری، اُس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کو اخذِ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کر دو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا، وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں

نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سائڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اُس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اُس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو اُن کے ہاں یہ رو بکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے جو اُس کو دیکھیں گے۔

بہ بر حال، یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے، یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو رگاونہ تھا۔ مولوی قمر الدین خاں کا کول نہ جانا اور راہ سے پھر آنا، معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اُن کو زندہ اور تندرست رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو سلام اور اُن کے بچوں کو دعا کہنا اور یہ خط ضرور ضرور پڑھا دینا اور کہنا، بھائی، ہدایت تو اچھی ہے، نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم ٹیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔

گورنری کلمتہ اور گورنری آگرہ اور اجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اُس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملے نے خط نہ لکھا، صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔ خیر:

ہرچہ از دوست می رسد، نیکوست

سُومر زلفتہ! اب میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں، وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمر الدین خاں کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں؟

صاحب!

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمر الدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنسن کے فکر میں تھے، ظاہریوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ اُن کی جو مراد ہو، بر لاوے۔ اُن کو میرا سلام کہہ دینا بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا مولوی قمر الدین خاں صاحب کو بھی سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے بکھینچنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں، بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اکلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔ قصہ مختصر، وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۹ء

غالب

مرزا قاسم!

عجب اتفاق ہوا۔ پچھلے دن بتیں اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا کہ اُس کے متعلق پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمہارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا۔ رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اُس کا دیکھنا شروع کیا۔ بے کار محض اور تباہیوں، پانچ پہر کا دن، یہی بڑی دل لگی ہو گئی۔ خوب دیکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار میں میں نے بہت حظ اٹھایا۔ جتنے رہو، تمہارا دم غنیمت ہے۔

بھائی کا حال غنم لکھو۔ پنسن کے طالب ہیں یا نوکری کے؟ منشی عبدالمطیف



کہاں ہے اور کس طرح ہے؟ علاقہ بتا ہوا ہے یا جاتا رہا؟ صاحب لفٹنگ گورنری کا محکمہ بالکل الہ آباد کو گیا یا سنوڑ کچھ یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ لوگر ہیں یا مستعفی؟ عدالت دیوانی کا محکمہ یہیں رہے گا یا الہ آباد جائے گا؟ اس کا اور گورنری کے محکمے کا ساتھ ہے، چاہیے یہ بھی وہیں جاوے۔

آج تمہارے اشعار کا غز پمفلٹ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے، یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ چار دن میں پہنچ جائے۔

یکشنبہ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء

(۳۷)

صاحب:

پچیس اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں، آج تیس ہے، یقین ہے کہ خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔

ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں، ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے، اُس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا، اٹھارہ انیس برس کی عمر، قوم کا کھنری، خوب صورت، وضع دار، نوجوان، ۱۲، ۱۳ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اُس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ میں ایک تاریخ اُس کے مرنے کی لکھوں، ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اُس کو پڑھ پڑھ کر رو یا کرے۔ سو بھائی، اُس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکرِ شعر متروک۔ معذایہ واقعہ تمہارے حسبِ حال ہے، جو خونچکاں شعر تم نکالو گے، وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے؟ بہ طریقِ مثنوی ہیں تیس شعر لکھ دو۔ مصرعِ آخر میں ماہِ تاریخ ڈال دو۔ نام اُس کا برج موہن تھا اور اُس کو ”بابو“ ”بابو“ کہتے

تھے۔ چنانچہ میں بحر ہرج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں؛ چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آئندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ لو؛ چاہو کوئی اور طرح نکالو، لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو مستوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور ”بالو برج موہن“ سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آ سکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے:

برم چوں نام بالو برج موہن  
چکہ خون دل ریش از لب من

نگاشتہ روز جمعہ سی ام اپریل ۱۸۵۸ء

غالب

(۳۸)

بھائی!

وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زلیست کی نہ رہی۔ تو لہج اور پھر کیا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارہ ریوند اور ارند سی کا تیل پیا۔ اُس وقت تو پچ گیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دوبار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پٹا اور آلو بخارے کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زلیست کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

صاحب! وہ جو میں نے بائیس شعر مرثیے کے لکھ کر تم کو بھیجے، اُس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ

تمھاری تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زندہ ہے اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ اوپر اسی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا؛ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست و گریباں تھے، ایک کو ایک سے ربط، ایک یا دو شعر اس میں سے کیوں کر لیے جاتے؟ اشعار سب میرے پسند بے ستم بے عیب۔ وہ جو تم لکھتے ہو کہ: حرف بالو برج موشن "می زخم" اور اس کا دوسرا مصرع میں بھول گیا ہوں؛ مگر قافیہ میں "من" ہے؛ یہ شعر غالب کو برا معلوم ہوا ہو گا۔ واللہ باللہ! جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ یہ ہر حال بات وہی ہے، جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

بارے ۱۰ اب کیے بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمر الدین خاں صاحب روزوں کے متوالے، ہوش میں آئے یا نہیں آئے؟ آج دس شوال کی ہے ششہ عید کا بھی زمانہ گزر گیا۔ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظر انور سے گزرا تو شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔  
محرمہ و مرسلہ دو شنبہ ۲۷ مئی ۱۸۵۸ء  
غالب

(۳۹)

کیوں صاحب!

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ الغاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا، کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ بگاہ آتے ہیں، اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے



رہتے تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط آنے کی توقع؛ اُس میں وہ دونوں صاحب گاہ بگاہ ہاں ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دو بار ہسربانی کرتے ہو۔

سنو صاحب! اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا، دو خط، تین خط؛ ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔

بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا، اُس کا جواب بھیج دیا گیا۔ مولوی قمر الدین خاں، یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں، کس واسطے کہ مجھ کو مسی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔

بہر حال، اگر آپ آزرہ نہیں، تو جس دن میرا خط پہنچے، اُس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے، اپنی خیر و عافیت، منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال۔ اس سے سوا، گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظ مناسب وقت میں ضرور لکھنا۔ راجا جو وہاں آیا ہوا ہے، اُس کی حقیقت، دھول پور کا رنگ، صاحبانِ عالی شان کا ارادہ وہاں کے بند و بست کا کس طرح پر ہے؟ آکرے کا حال کیا ہے؟ وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

غالب

دکاشتہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

(۴۰)

جیتے رہو اور خوش رہو:

اے وقتِ تو خوشش کہ وقتِ ما خوش کردی

زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرواز دے دیا تھا۔ گرمی ہنگامہ انطباع دیوان وغیرہ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصروف کاغذ و کاپی ہے۔ خداتم کو سلامت رکھے، منتقامت سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے جو قسانہ عجائب لکھا ہے، آغازِ داستان کا شراب مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا، قسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے، اور "یاد رکھنا" "فلان" کے واسطے کتنا مناسب۔

منشی عبداللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے۔ اور تہنیت میں بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو ان سے ملو تو میرا سلام کہہ کر، اس خط کے پہنچنے کی اطلاع لے لینا۔ مولوی معنوی جب کانپور سے معاودت فرمائیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بہ دستور:

ہماں پہلو، ہماں بستر، ہماں درد

شنبہ ۲۶ جون ۱۲۵۸ء روزِ ورودِ نامہ

(۴۱)

مرزا آفتہ کو دعا پہنچے۔ بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟ آگرے میں ہو یا نہیں؟ مرزا حاتم علی صاحب کا شفقت نامہ آیا، یہاں سے اس کا جواب بھیجا گیا، وہاں سے اس کا جواب آگیا۔ میر مکرم حسین صاحب کا خط پرسوں آیا، دو چار دن میں اس کا جواب لکھوں گا۔ میرا حال بہ دستور ہے:

نہ نوید کامیابی، نہ نہیبِ نا اُمیدی

بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور وہ میرے خط کے جواب

میں ہے۔ دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب اُن کو خط لکھوں گا۔ تم اگر ملو تو اُن سے کہ دینا کہ بھائی میرا قاسم علی خاں کے شعر نے مجھ کو بڑا مزہ دیا۔ حُسنِ اتفاق یہ کہ کئی دن ہیسے تھے جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گزادلال کو دیا تھا اور وہ اُس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ لے کر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔

۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

عالم

(۴۲)

مرزا قفّہ !

کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے، آیا اور اُس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو میں بھی حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا۔ بارے، جب اُس کی تحریر دیکھی، تو تمھارے ہاتھ کا پمفلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوئے، مگر اُس کے آگے کالی مہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلو ایسے۔ دلوادیے اور پارسل لے لیا۔ مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا؟ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمھارا آدمی جو ڈاک گھر گیا، اُس کو خطوں کے بکس میں ڈال دیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی اور اُس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔

وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں، یعنی منشی بھگوان پرشاد مسل خواں میرا سلام قبول کریں۔

عالم

۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء



(۴۳)

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف  
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور!

تم کو پہلے یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرّم حسین صاحب  
کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا  
حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا  
اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھنا:

شرطِ اسلام بود و رزّشِ ایماں بالغیب  
لے تو غائب ز نظر، مہر تو ایمان من ست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اُس کے دو دن یا تین دن کے بعد  
دوسرا خط پہنچا۔

سندو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اُس میں بے تکلف  
عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ مفرط بہ طرف شعر و سخن کے،  
تمہاری شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے۔ اور بھائی! یہ جو تمہاری سخن  
گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں  
اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا،  
مگر ہاں! اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر، یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ  
گیا ہے؛ سو گاہ گاہ جب دل اُلٹے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان  
پر آ جاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری گئی  
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں :  
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونق اور تنہا ہی کے غم میں مرتا ہوں ؛ جو دکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم ، مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں : انگریز کی قوم میں سے ، جو ان روسیہ کا نول کے ہاتھ سے قتل ہوئے ، اُس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز ، کچھ دوست ، کچھ شگرد ، کچھ معشوق ؛ سودہ سب کے سب خاک میں مل گئے ۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے ؛ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو ، اُس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو ۔ ہاے ! اتنے یار مرے کہ جواب میں مردوں کا ، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

جون یا جولائی ۱۸۵۸ء

(۴۴۱)

مرزا قفّہ !

تمہارے اوراقِ مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں پندرہ اگست کو اور جنابِ راجا تم علی صاحب کی نشر شاید آغازِ اگست میں روانہ کر چکا ہوں ۔ اُس نشر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم ہوا کہ میری خدمتِ محترم کے مقبولِ طبع ہوئی یا نہیں ۔ نہیں معلوم بھائی نبی بخش صاحب کہاں ہیں اور کس طبع ہیں اور کس خیال میں ہیں ؟ نہیں معلوم مولوی قمر الدین خاں الہ آباد سے آگئے یا نہیں اگر نہیں آئے تو وہ وہاں کیوں متوقف ہیں ؛ میرا منشی قدیم وہاں پہنچ گئے ؛ اپنا کام کرنے لگے ؛ یہ کیا کر رہے ہیں ؟

آپ کو یہ تاکید لکھتا ہوں کہ ان تینوں باتوں کا جواب الگ الگ لکھے اور جلد لکھے۔ اس خط کے پہنچنے تک اغلب ہے کہ پارسل پہنچ جائے، اُس کے پہنچنے کی بھی اطلاع دیجئے گا۔

اب ایک امر سنو: میں نے آغازِ یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک رودادِ شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ ”دساتیر“ کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اُس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً تمھارا نام منشی ہرگوپال؛ ”منشی“ لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا؛ اس کی جگہ ”شیوا زبان“ لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے، یعنی نہ چھدرانہ گنجان، اور ارقِ بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جز میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ ایک ہے، اُس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔ اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں، لیکن صاحبِ مطبع اتنے پیسوں مانے گا؛ اور البتہ چاہیے، کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپنی جائے۔ یقین ہے کہ پانسو، سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین آئے، چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہوگی؛ رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی، متن کی تو آپ کو معلوم ہوگئی۔ حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہ ہر حال، اگر ممکن ہو تو اس کا تکدمہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔ اگر منشی قمر الدین خاں آگئے ہوں تو اُن کو



بھی شریک مصلحت کر لو۔ ان تینوں باتوں کا جواب اور پارسل کی رسید اور اس مطلب خاص کا جواب، یہ سب ایک خط میں پاؤں، ضرور ضرور ضرور۔

لنگاشتہ و رواں داشتہ سہ شنبہ ہفتم اگست ۱۸۵۸ء

جواب طلب۔ واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا۔ غالب

(۴۵)

صاحب!

عجب اتفاق ہے، آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط، جاگیر کے سکاؤں کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا کہ دوپہر کو رضی الدین نیشا پوری کا کلام ایک شخص پہنچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ قصارا، جب میں نے اُس کو کھولا، اُسی ورق میں یہ شعر نکلا:

اگر بگنچ گہرِ سلیم ادفِتاد، چہ باک

کفِ جوادِ ترا از برائے آں دارم

چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ ناگاہ تمہارا خط آیا، مجھ کو لکھنا ضرور ہوا۔ آج تمہیں دو خط بھیجے ہیں، ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ، اور ایک اب بارہ پر تین بجے بیرنگ اُس شعر کو اب چاہو رہے دو۔

بابے بابے! تم بھائی سے ملے، "غیاث اللغات" کھلوائی، "جواد" کا لغت دیکھا، مگر میرا ذکر نہ کیا کہ وہ تمہارا جو بابے حال ہے۔ "دستجو" اور اُس کے چھاپے کا ذکر نہ کیا۔ البتہ اگر تم ذکر کرتے۔ تو وہ دونوں باب میں کچھ ذماتے اور مجھ کو دعا سلام کہہ دیتے۔ چوں کہ تم نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا، اس سے معلوم ہوا کہ بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر اٹھنوں نے کچھ نہیں کہا تو اُن کا ستم

اور اگر اُن کا کہا ہوا تم نے نہیں لکھا تو تمہارا کرم۔ بہ ہر حال، خوب مصرع حافظ کا تم نے مجھ کو یاد دلایا ہے :

یارب! مباد کس را مخدوم بے عنایت

خواہی تم، خواہی منشی نبی بخش سلمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ یاد رہے یہ مصرع اگر مجھ پر زنجیر سے باندھو گے تو بھی نہیں بندھے گا۔

اگر دستبنو کو سرسرخ غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تحریر، تمہاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے۔

آخر بروز دوشنبہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

(۴۶)

نورِ نظر و لختِ جگر مرزا افتخار !

تم کو معلوم رہے کہ راے صاحب مکرم و معظّم راے امید سنگھ بہادر یہ رقعہ تم کو بھیجیں گے۔ تم اس رقعے کو دیکھتے ہی اُن کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، تب تک حاضر ہو کرنا اور ”دستبنو“ کے باب میں جو اُن کا حکم ہو، بجالانا۔ اُن کو پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کریں گے، وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں راے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بہ موجب اُن کے حکم کے، میرے پاس ارسال کرنا۔ اور وہ جو میں نے پانچ جلد کی آرائش کے باب میں تم کو لکھا ہے، اُس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔

ہاں صاحب، ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے، اُس رباعی کو چھاپا ہونے سے پہلے حاشیے پر لکھ دینا، جہاں یہ فقرہ ہے : ”نے نے اختر بخت

خسرو در بلندی بجائے رسید کہ رُخ از خاکیاں نہفت؟  
 جائیکہ ستارہ شوخ چشمی و رزد  
 افسر افسار و گرزن ارزن ارزد  
 خرشید ز اندیشہ جاوہر گردش  
 بر چرخ نہ بینی کہ چساں حی لرزد

چوں کہ حاشیہ معنی لغات سے بھرا ہوا ہے تو تم اس فقرے کے آگے نشان  
 بنا کر، اوپر کے حاشیہ پر رُباعی لکھ دینا اور حاشیہ بین پر، جہاں اور معنی لکھے  
 ہوئے ہیں، وہاں رُباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دینا: "افسر" "افسار"  
 "گرزن" "بہرہ و فتح" "جاوہر گردش"۔

رکاشت: ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء

غالب

(۴۷)

بھائی!

تمہارا وہ خط، جس میں اوراقِ مثنوی ملفوف تھے، پہنچا۔ اوراقِ مثنوی،  
 اوراقِ "دستنبو" کے ساتھ پہنچیں گے۔ اب تمہارے مطالب کا جواب جدا جدا  
 لکھتا ہوں۔ الگ الگ سمجھ لینا۔

صاحب! تم نے مرزا حاتم علی صاحب سے کیوں کہا؟ بات اتنی تھی کہ مجھ  
 کو لکھ بھیجتے کہ نثر آئی اور مرزا صاحب نے پسند کی۔ اب اُن سے میرا سلام کہو  
 اور یہ کہو کہ آپ کے شکر بجالانے کا شکر بجاتا ہوں۔

چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب  
 دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور محبت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے



کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعے اُن کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو، طرزِ تحریر کیا ہوگی اور صاحبانِ مطبع کو اُس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔ جیتے رہو، اس غم زدگی میں مجھ کو ہنسایا۔ وہ کون ملا تھا جس نے تم کو پڑھایا:

گرچہ عمل کار، خردمند نیست

عملکار، اہلکار۔ یہ شعر شیخ سعدی کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے:

جز بخردمند مفرما عمل

یعنی خدمت و اعمال سوائے علما اور عقلا کے، اور کے تفویض نہ کر، پھر خود کہتا ہے:

گرچہ عمل کار خردمند نیست

یعنی اگرچہ خدمات و اشغالِ سلطانی بہ قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطر میں ڈالے۔ ”عمل“ الگ ہے اور ”کار“ مضاف ہے بہ طرف ”خردمند“ کے؛ ورنہ دو بانیِ خدا کی، ”عمل کار“ ”اہل کار“ کے معنی پر نہیں آتا مگر قتیل اور واقف یا اور پورب کے مالکیوں کی فارسی۔

اگست ۱۸۵۸ء

(۴۸)

صاحب!

عجب تماشا ہے۔ تمہارے کہے سے منشی شیونرائن صاحب کو خط لکھا تھا سو کل اُن کا خط آیا اور انھوں نے ”دستبنو“ کی رسید لکھی، ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہوگا، آخر تمہیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا کہ تم نے مجھ کو اُس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا۔

اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے امید سنگھ کی ملاقات ہو لینے پر خط کا

لکھنا منحصر رکھا ہے تو وہ بھی ہو چکی ہوگی۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی، اب اُس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگزر اینکڑوں مطاب و مقاعد رہ جائیں گے اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے تو اُس کتاب اور منشوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا؟ بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو؟ خدا کے واسطے، خفگی کی وجہ لکھو۔ صبح کو میں نے یہ خط روانہ کیا ہے، بدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ؛ اگر شام تک تمھارا خط آیا تو خیر، ورنہ تمھاری رنجش کا بالکل یقین ہو جائے گا اور یہ سبب وجہ نہ معلوم ہونے کے، جی گھرائے گا۔ میں تو اپنے نزدیک کوئی سبب ایسا نہیں پاتا۔ خدا کے واسطے، خط جلد لکھو، اگر خفا ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔

جانتا ہوں کہ تم رائے اُمید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے۔ عیاذاً باللہ! میں اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں، مرزا الفتہ دست بنو تم کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔

اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان گزرا ہے، کوئی مطلب تم کو لکھنا نہ چاہیے مگر ضرورت کو کیا کروں، ناچار لکھتا ہوں۔ صاحب مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: ”مرزا نوشتہ صاحب نقائب اللہ غور کرو“ یہ کتاب بے جوڑ جملہ ہے۔ دُرُتا ہوں کہ کہیں صفحہ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ ”ایا“ فارسی کا دیوان یا ”اردو یا“ ”پنج آہنگ“ یا ”مہر نیمروز“ چھاپے کی، یہ کوئی کتاب اُس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام لکھ دیتے؟ تم نے بھی اُن کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے، وجہ اس داویلا کی نہیں ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ ولی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتے سے ولایت تک، یعنی

وزرا کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "مرزا فوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا لکھوایا گیا میری محنت رائیگاں گئی، گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔ لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں۔  
 بڑھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ ۱۸۵۸ء

(۴۴)

لہذا لشکر، تنہا را خط آیا اور دل سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم میرا خط اچھی طرح پڑھا نہیں کرتے، میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جز میں آجائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جز میں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو بہ ہر حال اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں اس کی ریش دلاویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔ رباعی حاشیے پر لکھ دی، اچھا کیا۔ سبھائی منشی نبی بخش صاحب سے نثر کے دو فقرے، جس محل پر کہ اُن کو بتائے ہیں، منور لکھو ادینا۔ میں نے جو تم کو "مرزائی" کا خطاب دیا ہے، اُن فقرہ میں اس کا اظہار کیا ہے۔

بہت ضروری یہ امر ہے اور میں منشی شیو رائن صاحب کو آج صبح کو لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے: "اگر دردم دیگر نہیب دلائل بہم زند"۔ "نہیب کی جگہ" "نوائے" بنا دینا، "بہ نوائے" مباحث بہم زند"۔ "نہیب" لفظ عربی ہے اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاکو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیل جائے اور اُسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔



راے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطیع کی اعانت کی، حق تعالیٰ اُن کو اس کار سازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔ صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اُس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بدل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی کا ہو گیا ہے۔ چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ بر خوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمھارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں، مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیوں کر کیا جاسیے۔ سُنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حروف پر سیاہی کی تلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ تلم سے جدول بھی کھج جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور عنائی اور ہوشیاری اُن کی میرے کس دن کام آئے گی؟

مرزا قفۃ! تم بڑے بے درو ہو، دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ آگہ تم اُس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچے بند تو میسر نہیں، عحات اور نقاش کہاں! شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ قصہ مختصر یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو اُن کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں؛ اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ دورہ پیہ فی جلد اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے، ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھ روپیے، آٹھ روپیے، دس روپیے صد بارہ روپیے۔ میاں کو سمجھا دینا، کمی کم طرف نہ گریں، پتیرا چھی بنے۔ نہایت بارہ میں چھ جلدیں تیار ہوں۔

منشی سنیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص، بس۔

اجزائے خطاب کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ "بہادر" کا اور "بہادر" کے لفظ کے بعد تخلص "اسد اللہ خاں بہادر" غالب۔

بھائی! تم نے اوراقِ منشوی کی رسید نہ لکھی۔ کہیں وہ پارسل میں سے گر تو نہ گئے ہوں؟ دیکھو، کس لطف سے میرے نام کی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے مگر میں اس کی عبارت کیا بتاؤں؛ صاحبِ مطبع اس امر کو، اردو میں، آخر کتاب لکھ دیں۔ منشی جی سے نثر لکھوالو، منشی عبداللطیف کو یہ خط پڑھا دو، "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دو، صاحبِ مطبع کو میرا نام بنا دو، خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو، برخوردار عبداللطیف سے مقدار روپیہ کی دریافت کر کے مجھ کو لکھ بھیجو، اپنی منشوی کی رسید لکھو، اپنے بہ جان و دل مصروف ہونے کا اقرار کرواں سب امور کی مجھے خبر دو۔

جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگامِ نیمروز غالب

(۵۰)

مرزا آفتہ کو دعا پہنچے۔ دونوں فقرے جس محل پر بتلائے ہیں، حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے۔ "نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نوائے" بنا دیا ہوگا۔ برخوردار منشی عبداللطیف کو میرا خط اپنے نام کا دکھا دیا ہوگا۔ اُن کی سعادت مندی سے یقین ہے کہ میری التماس قبول کریں اور ادھر متوجہ ہوں۔ کاپی لکھی جانی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہوگا؛ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔ بھائی! منشی صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضرور نہیں، مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدردان ہیں؛ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تصحیح کے روادار ہوں گے؟ بھائی! تم نے بھی لکھا اور منشی شیونرائس

صاحب نے بھی لکھا؛ میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمہ عبارت میں چھاپ دو۔ "نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفید خلّاق میں چھپوایا ہے۔ اور میری رائے میں اس کا یہ تمامہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبان مطالب جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے پر جرات نہ کریں۔ اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیونرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ سب باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اب دو امر ضروری الاظہار تھے، اس واسطے یہ خط لکھا ہے؛ ایک تو اردو عبارت 'دوسرے یہ کہ میرے شفیق مکرم سید مکرم حسین صاحب کا خط میرے نام آیا ہے اور انھوں نے ایک بات جواب طلب لکھی ہے، اُس کا جواب اسی خط میں لکھتا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ اُن سے کہ دو، بلکہ یہ عبارت اُن کو دکھا دو؛ بندہ پرور، نواب عطاء اللہ خاں میرے بڑے دوست اور شفیق ہیں۔ اُن کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ سیف الدولہ؛ یہ دونوں صاحب صحیح و سالم ہیں۔ شہر سے باہر دو چار کوس پر کوئی گاؤں ہے، وہاں رہتے ہیں شہر میں اہل اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور اُن کے مکانات قرق ہیں؛ نہ ضبط ہو گئے ہیں، نہ واگذاشت کا حکم ہے۔

۲۔ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۱)

مشفق میرے، کرم فرما میرے !  
تمہارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے



کے واسطے بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ رسم تولیوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہوگا۔ غرض کہ تقطیع اور شمارِ سطور اور کاپی کا حسنِ خط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسندِ صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے! واللہ! بے مبالغہ کہتا ہوں؛ اگر بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخے میں سہو، کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اُس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ تم میری طرف سے اُن کو سلام کہنا، بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے، انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہوگی۔

کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنیچ کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذرِ حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر سہوں اور باقی چارہوشیورام پوری پر اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، وہ اُس کاغذ پر چھاپنی جائیں اور باقی شیشورام پوری پر یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلفِ محسن ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ اُن کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں؛ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو، تو خیر، دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیشورام پوری پر سہوں؛ باقی جلدوں میں تمھیں اختیار ہے۔ ہاں حساب اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور خوشنہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ آگے اس سے میں نے برخوردار منشی عبداللطیف کو لکھا تھا کہ ان چھ کتابوں کی کچھ تزئین اور آرائش کی فکر کریں۔ معلوم نہیں، تم نے وہ پیام اُن کو پہنچایا یا نہیں۔ آپ اور منشی عبداللطیف اور مرزا حاتم علی صاحب ہتر

باہم صلاح کریں۔ اور کوئی بات خیاں میں آوے تو بہتر ورنہ ان چھ نسخوں کی جلدیں انگریزی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو روپیے کی لاگت کی بنوادینا اور اس کا روپیہ تیاری سے پہلے مجھ سے منگوالینا:

”آن کہ ہمہ را در یکدم بہ نوید بشوید پید آورد اگر در دم دیگر بہ نہیب  
مباشش بہم زندالح“

اس میں ”نہیب“ کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہو کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاکو سے چھیل کر ”بہ نواسے“ لکھ دینا۔ یعنی ”بہ نواسے“ مباشر بہم زند“ ضرور ضرور۔ اس کا انتظار نہ کیجسو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا تو بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے نہ چھاپے میں غلط ہو، اگر اجزائے اصل میرا میر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی منشی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوادینا۔

روز سہ شنبہ ہفتم ستمبر ۱۸۵۹ء

از غالب

(۵۲)

اچھا میرا بھائی! ”نہیب“ والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بد لو اڈالتا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوالینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے ہر چند مسودے میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

لکھتے ہو کہ مرزا صاحب دو جلدیں درست کریں گے، یہ تو صورت اور ہے، یعنی میں نے چھ جلدیں، بارہ روپیے کی لاگت میں بہ کار سازی و ہنر پردازی، برخوردار منشی عبداللطیف چاہیں تھیں۔ منتظر تھا کہ اب ان کا قبول کرنا مجھ کو لکھو گے

اور روپیہ مجھ سے منگواؤ گے۔ ظاہر عبداللطیف نے پہلوتہی کیا۔ مرزا صاحب اگر کفیل ہوئے تھے، تو چھ جلدیں بنواتے نہ کہ دو۔ البتہ اس احتمال کی گنجائش ہے کہ دو بہت پر تکلف اور چار بہ نسبت اُس کے کچھ کم۔ اگر یوں ہے، تو یہ تو مدعاے دلی میرا ہے مگر اطلاع ضرور ہے۔

راے امید سنگھ کے نام کا خط بہ احتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں، اُن کو دے دو۔ یہ جو تم لکھتے ہو کہ ”نہیب“ کا لفظ لکھ دیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاپا شروع ہو کر دور تک پہنچ گیا۔ کیا عجب ہے کہ کتابیں جلد منقطع ہو جائیں۔

ہمارے منشی شیونرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیا ہے، تاہم خریداروں کی فراہم ہو جائیں۔

مرزا آفتاب خان: ان دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں ”آفتاب نامہ“ کے خریدار ہوئے ہیں اور میں نے بہ موجب ان کے کہنے کے برادر دینی مولانا مہر کو لکھا ہے۔ حضرت نے لاؤ نعم جواب میں نہیں لکھا۔ تم اُن سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں۔ آج سولہ ستمبر کی ہے، دو لمبر اخبار کے، حکیم صاحب کے نام کا سرنامہ، خان چند کے کوچے کا پتا لکھ کر روانہ کریں۔ آئندہ ہفتہ بہ ہفتہ بھیجے جائیں اور حکیم احسن اللہ خاں کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے۔ جس دن سے کہ وہ اخبار شروع ہوا ہے، اُس دن سے مزے اخبار شاہی کا صفحہ نقل کر کے ارسال کریں۔ کاتب کی اجرت اور کاغذ کی قیمت یہاں سے بھیج دی جائے گی۔ بھائی! تم مرزا صاحب سے اس کو کہہ کر جواب دو اور مجھ کو اطلاع دو۔ ”نہیب“ کے نہیب سے مراجعات ہوں، اُس کی درستی کی خبر بھیجو۔ باقی جو چھاپے کے حالات ہوں، اُس کی آگاہی ضرور ہے۔



## بھائی!

مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک خط بھیج چکا ہوں، اب اس وقت تمہارا خط اور آیا۔

سنو صاحب! لفظ مبارک، میم، حاء، میم، وال، اس کے ہر حرف پہ میری جان نثار ہے؛ مگر چوں کہ یہاں سے دلایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ، یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "مرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے؛ جو چاہو، سو لکھو۔

بھائی کو سلام کہنا۔ اُن کے خط کا جواب صبح کو روانہ کر چکا ہوں۔

مرزا تفتہ، اب تم ترمین جلد ہائے کتاب کے باب میں برادر زادہ سعادت مند کو تکلیف نہ دو۔ مولانا مہر کو اختیار ہے، جو چاہیں سو کریں۔

خط تمام کر کے خیال میں آیا کہ وہ جو مرزا صاحب سے مجھ کو مطلوب ہے، تم پر بھی ظاہر کروں۔ صاحب، وہاں ایک اخبار موسوم بہ "آفتابِ عالم" نکلتا ہے، اُس کے ہتھم نے التزام کیلئے کہ ایک صفحہ یا ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے حالات کا لکھتا ہے۔ نہیں معلوم، آغاز کس مہینے سے ہے۔ سو، حکیم احسن اللہ خاں یہ چاہتے ہیں کہ سابق کے جو اوراق ہیں، جب سے ہوں، وہ جو چھاپ خانے میں مسودے رہتے ہیں، اُس کی نقل کسی کا تب سے لکھوا کر یہاں بھیجی جائے۔ اجرت جو لکھی آئے گی، وہ بھیجی جائے گی۔ اور ابتداء ستمبر ۱۸۵۸ء سے اُن کا نام خریداروں میں لکھا جائے۔ دو ہفتے کے دو لمبے اُن کو ایک ماہانے میں بھیج دیے جائیں۔ اور پھر ہر مہینے، ہفتہ در ہفتہ اُن کو نذر اخبار کا پہنچا کرے۔

یہ مراتب جناب مرزا حاتم علی صاحب کو لکھ چکا ہوں اور اب تک آثارِ قبولانہ لا رہے ہیں۔ نہ لفظ حکیم صاحب پاس پہنچے نہ اُن صفحات کی نقل میرے

پاس آئی۔ آپ کو اس میں سعی ضرور ہے۔ اور ہاں صاحب، آفتاب عالمتاب کا مطبع تو کشمیری بازار میں ہے مگر آپ مجھ کو لکھیں کہ مفید خلائق کا مطبع کہاں ہے؟ عجب ہے کہ ان صاحب شفیق نے میری تحریرات کا جواب نہیں لکھا۔ فرمایش حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی بہت اہم ہے۔ عند الملاقات میرا سلام کہہ کر اس کا جواب بلکہ وہ اخبار ان سے بھیجواؤ۔

جمعہ، ۱۵ ستمبر ۱۸۵۸ء  
(۵۴)  
غالب  
بھائی!

آج صبح کو یہ سبب حکیم صاحب کے تعلق سے کے شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔ کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا ہی تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک خط تمھارا اور ایک خط مرزا صاحب کا لایا۔ اب کیا کروں! خیر، چپ ہو رہا۔ شکوہ محبت بڑھائے گا۔ مرزا صاحب کی عنایت کا شکر بجا لاتا ہوں یقین ہے کہ جلد ہی میرے خاطر خواہ بن جائیں گی؛ کس واسطے کہ جو آج کے خط میں اُکھنوں نے لکھا ہے، وہ بعینہ میرا مکتوب ضمیر ہے۔ خدا اُن کو سلامت رکھے۔ میرا سلام کہہ دینا۔ اُن کے خط کا جواب کل پرسوں بھیجوں گا۔

راے امید سنگھ بہادر خوبان روزگار میں سے ہیں۔ فقیر کا سلام نیاز اُن کو کہہ دینا۔ خدا کرے، اُن کے سامنے کتابیں چھپ چکیں۔ بارے، جب وہ گوالیار کو تشریف لے جائیں تو مجھ کو اطلاع لکھنا۔

”نہیب“ کے ”نوائے“ بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی! میں فارسی کا محقق ہوں؛ کاتب اُن اجزا کا، جن کے رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔

علم اُس کا غیاث الدین رام پوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح

سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق اُن اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں  
 دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں، اب  
 صرف اُس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔ آج جس طرح مجھ کو تمہارا اور مرزا صاحب  
 کا خط پہنچا، لازم تھا کہ حکیم صاحب کو بھی لغات اخبار پہنچ جاتا مگر اس وقت  
 تک نہیں پہنچا اور یہ دو پہر کا وقت ہے۔ خیر، پہنچ جائے گا۔ میں نے تمہارا خط  
 اُن کے پاس بھیج دیا تھا، انھوں نے تمہاری رائے منظور کی۔ اب تم وہ اخبار  
 جس طرح کہ تم نے لکھا ہے، اُن کے پاس بھیج دو۔ اور صاحب مطبع قیمت اخبار  
 اور اجرت کاتب اُن کو لکھ بھیجے۔ اپنے نام اور مسکن سے اُن کو اطلاع دے، بس۔  
 اُس کو اپنے طور پر روپیہ بھیج دیں گے۔ ہم تم واسطہ شناسائی ہم ذکر ہو گئے۔  
 ہاں، اگر احیاناً روپیہ کے بھیجنے میں دیر ہوگی، تو میں کہہ کر بھیجو ادول گا، یہ البتہ  
 میرا ذمہ ہے۔

سہ شنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۵)

صاحب!

تقصید کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے بھی مجھ کو دی  
 ہے، خدا اُن کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب کے خط میں اُن کو ایک مصرع  
 کسی استاد کا لکھ چکا ہوں۔ میں سراسر اُن کا ممنون احسان ہوں۔ میرا سلام  
 کہنا اور لغات اخبار کے نہ پہنچنے کی اطلاع دینا۔ میرے نام کا کوئی لغات ضائع  
 نہیں جاتا۔ خدا جلنے اس پر کیا بھوک پڑا۔ ظاہر انھوں نے پوسٹ پیڈ  
 بھیجا ہوگا، پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو؟

”شبیہ“ بمعنی ”صدائے اسپ“ لغت فارسی ہے؛ بہ شبن مکسور ویلے



معروف وہاں سے ہوز مفتوح وہاں سے ثانی زدہ، اور عربی میں اُس کو ”صہیل“ کہتے ہیں۔ ”صہیل“ کوئی لغت نہیں ہے، نہ عربی نہ فارسی۔ اگر غنیمت کے کلام میں ”صہیل“ لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے، غنیمت کا کیا گناہ:

”در خود ز روئے ہندسہ گاہے شمار یافت“ اصل مصرع یوں ہے۔ میں نے سہو سے خدا جانے کیوں کر لکھ دیا ہے بھائی! مہر خواں کے دو معنی ہیں: ایک تو ”خطاب“ کہ جو سلاطین ابرا کو دیں، اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں، یعنی ”عزت“ حاشیے پر شوق سے لکھوا دو۔ مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ اس عبارت سے جو تمہارے ذکر میں ہے، پہلے ”مہر خواں“ کے معنی حاشیے پر چڑھ گئے ہیں، مگر رکھنے کی حاجت کیا ہے اور اگر لکھ بھی دو تو قباحت کیا ہے۔ بھائی صاحب کیوں مضائقہ فرمائیں؟ حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا۔ صاحبانِ کونسل کی رائے ولایتِ آگرہ، یعنی میرے محکمے میں منظور و مقبول۔ نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو:

بنامِ آں کہ او نامے ندارد  
بہر نامیکہ خوانی سر بر آرد

شفیق بالتحقیق مولانا مہر، ذرہ بے مقدار کا سلام قبول کریں۔ کل آپ کو خط لکھ چکا ہوں، آج یا کل پہنچ جائے گا۔ رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے، مگر چونکہ حکم و کار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں، بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی، اُن کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ کیوں بھائی صاحب! قرار داد اور تجویز یہی ہے، اور پھر سمجھا چلے گی کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں:

نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بد وضعی ہے کہ جناب اڈمنسٹرن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب، ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔ آپ گنجائش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں، ایک اور بھی ایسی ہی بنوائیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوائیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی، کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔

بھائی مرزا تفتہ اکل کے مرزا صاحب کے خط میں سے اُس مادہ تاریخ کا قطعہ لکھ لینا۔ تم کو لکھ چکا ہوں، ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا، ایک قطعہ مولانا حقیر سے بھی لکھواؤ۔  
صبح پنجشنبہ سی ام ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۶)

کیوں صاحب!

اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟ نہ مرزا صاحب ہی آئے، نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں، ایک بار منشی شیونرائن صاحب نے کرم کیا تھا اور خط میں یہ رقم کیا تھا کہ اب ایک فرما باقی رہا ہے۔ اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرمانثر کا باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرما قصیدے کا تھا تو اب جلدیں بنی شروع ہو گئی ہوں گی۔

تم سمجھے؟ میں تمھارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا

حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو، تمھارا اور اُن کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے؛ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف نہ ہے اور اب کیا دیر ہے؛ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؛ بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی؛ مرزا صاحب نے جلدیں صحافت کو دے دیں؛ میں اب اُن کتابوں کا آنا کب تک تصور کروں؛ دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہو گی، کہیں دواہی کی تعطیل تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمر الدین خاں صاحب کا نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں اُن کا آگرے کا آنا لکھا، پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے؛ وہاں تو منشی غلام غوث خاں صاحب اپنا کام بہ دستور کرتے ہیں، پھر یہ اُس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؛ کہیں کسی اور کام پر معین ہو گئے ہیں؛ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے، مولوی قمر الدین خاں صاحب اُس کے بند و بست کو آیا چاہتے ہیں؛ اُس کا ظہور کیوں نہ ہوا؛ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔ جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے کہ کتاب کا حُسن کانوں سے سنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا؛ مگر آنکھوں کو شک ہے کانوں پر اور کان چشک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا۔

بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تحفیف تصدیع چاہتا ہوں؛ یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔

جناب منشی شیونائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجئے گا



اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا چوں کہ میرے خط کا جواب لکھا اور مہذا کوئی امر خواہ  
طلب نہ تھا! اس واسطے اُس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ زیادہ۔

رکاشتہ و رواں واشتر صبح شنبہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء راقم غالب

(۵۷)

اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمہارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگہاں کل جو خط  
آیا، معلوم ہوا کہ دو دن کول میں رہ کر سکندر آباد آگئے ہو اور وہاں سے تم نے خط لکھا  
ہے۔ دیکھیے اب یہاں کب تک رہو اور آگرے کب جاؤ۔ پرسوں بر خور داریو نرائن  
کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے، اب قریب ہے کہ  
بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کس دن کتابیں آجائیں، خدا  
کرے سب کام دلخواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب، منشی بالکنڈے صبر کے ایک خط کا جواب ہم پر قرض ہے میں  
کیا کروں؟ اُس خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا؛ پس میں  
اُن کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں، تو میرا سلام کہہ دینا، اور مطبع  
آگرہ سے کتابوں کا حال تو تم خود دریافت کر ہی دو گے، میرے کہنے اور لکھنے کی کیا  
حاجت۔

چار شنبہ سوم نومبر ۱۸۵۸ء

(۵۸)

کیوں صاحب!

کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے ولی کے خاک نشینوں  
کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زہار کوئی خط  
سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے بہر حال بس لٹنو دیانشور من گفتگوے می کنم۔

کل جمعے کے دن بارہ تاریخ نومبر کو تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی بر خوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا، سب خوب، دل خوش ہوا اور شیونرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں، منشی شیونرائن نے اندور کو واسطے رائے امید سنگھ کے، کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب! تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو یسکندر آباد کب تک رہو گے، آگرے کب جاؤ گے؟  
 شنبہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء  
 جواب طلب۔

(۵۹)

آج پنجشنبہ کے دن اٹھارہ نومبر کو تمھارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمھارا خط پہنچتا ہے اور میرا خط نہیں پہنچتا۔ میرے خط کے نہ پہنچنے کی دلیل یہ کہ تم نے اصلاحی غزل کی رسید نہیں لکھی۔ میں نے کتب کا پہنچنا تم کو لکھا تھا، اُس کا تم نے ذکر نہ لکھا۔ صاحب! تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا قہر کی بھیجی ہوئی موافق اُن کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیونرائن کی اطلاع کے کل تک میرے پاس پہنچ جائیں گی۔ اور یہی منشی شیونرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی اطلاع دی ہے۔

منشی بنی بخش صاحب تمھارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں، شاید میں تم کو لکھ بھی چکا ہوں۔ میرا قاسم علی صاحب کی بدلی کا حال معلوم ہوا۔

یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ دلی ان دنوں میں آئے تھے، مجھ سے مل گئے ہیں؛ اُن کو ایک کتاب ضرور بھیج دینا۔

بھائی! میں ہرگز نہیں جانتا کہ میرا بادشاہ دہلوی کون ہیں اور پھر ایسے کہ جو کہیں کے منصف ہوں۔ کچھ اُن کے خاندان کا حال اور اُن کے والد کا نام لکھو تو میں غور کروں، ورنہ میں تو اس نام کے آدمی سے آشنا نہیں ہوں۔

پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء وقت دوپہر

(۶۰)

برخوردار!

تمہارا خط پہنچا، اصلاحی غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ مقطع اب اچھا ہو گیا رہنے دو۔ کل جمعے کے دن انیس نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا فہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے، آفتاب کی سی نمائش ہے۔ مجھے یہ فکر کہ کہیں اُن کا روپیہ تیاری میں صرف نہ ہوا ہو۔ اچھا، میرے بھائی! اس کا حال جو تم کو معلوم ہو، مجھ کو لکھ بھیجو۔

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے، لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب! مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے، یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔

میرا بادشاہ کی اور اپنی ناشناسائی آگے تم کو لکھ چکا ہوں۔ اب تمہارے اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے اور امراؤ سنگھ کے آشنا ہیں۔ کچھ اُن کے خاندان کا نام و نشان دریافت ہو، تو مجھ کو بھی لکھ بھیجو، تاکہ میں جانوں کہ یہ کس گروہ میں سے ہیں۔



میاں، وہ راست دروغ بگردنِ راوی نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے، جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو اور تاج گنج کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکم عفو تو قیصر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توفیقِ آزادی پاتے ہیں یہ دو شخص کیسے مجرم تھے جو مقید ہوئے!

محررہ صبحِ شنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۱)

مرزا تفتہ!

تمہارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا، خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں اُن کو لکھتا۔ لکھتے ہو کہ مرزا مہر کے دو چار روپیے زائد صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے اُن سے استفسار کیا تھا۔ آنکھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی میں وہی بارہ روپیے صرف ہوئے ہیں۔ محصول کی ایک رقم خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی تو اس کا کیا مضائقہ، مجھ کو تمہارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے، البتہ اُن کے دو تین روپیے اُٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ گنہگار شاد آد تخلص اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں مگر رنجیت کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے کہ یہاں آئے اور بالکلند بے صبر کی غزلیں اصلاح کو لائے، وہ دیکھ کر اُن کو حوالے کر دیں۔

مہتری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں، امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری اُن

کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب، سادہ بے جلد، اُن کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اُس کتاب کی رسید میں آیا، بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی ایک تماشنا اور ہے، وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ ”دستبنو“ پہلے اس سے کہ تم بھیجو، ”مطبع مفید خلاق“ نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اُس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکریٹروں کی نذر یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں :

تما نہال دوستی کے برود  
حالیار فتم و تنخے کا شیتم

شنبہ ۲ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۲)

صاحب !

تمہارا خط آیا، میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو بچپانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں

پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؛  
وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے، وہ حکیمِ ستائی کا ہے، اور وہ نقلِ حدیثیں  
مرقوم ہے:

پسرے باپ پر بزاری گفت  
کہ مرا یار شو بہ ہمرہ جفت  
گفت: بابا! زنا کن وزن نے  
پند از خلق گیر و از من نے  
در زنا، گر بگيردت عسے  
بہلد، کو گرفت چوں تو بسے  
زن کنی، ہرگز نہ رہا نکند  
ور تو بگزاریش، چہا نکند

بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے، کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا  
روپیہ اکٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل  
ہے، نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا  
ہے، وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا  
جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسبابِ کدام  
زین ہو سہا بگزر یا مگزر، می گزر و

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش  
ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیسے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا  
ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب



موت آئے گی، مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بسبیل  
حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر سفتے میں ایک بار خط لکھا  
کرو۔

یکشنبہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۶۳)

کیوں صاحب !

روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی ؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو  
روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی  
جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی  
دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ  
ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو  
اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے  
میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔  
یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آؤ آئے میں بخل نہ  
کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

غالب

(۶۴)

دیکھو صاحب !

یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے

ہو اور مرزہ یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا، تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔ آج تک رے امید سنگھ یہ ہیں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمہارا مدعا حاصل ہو گیا ہے۔ جس دن وہ آئے تھے، اُسی دن مجھ سے کہ گئے تھے۔ میں بھول گیا اور اُس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب! وہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا الفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے "تضمین اشعار گلستاں" کے اُن کی خواہش کے بموجب، کوئی پارسی ہے بہی ہیں، اُس کے پاس بھیج دیے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کرے گا۔ امید سنگھ نے اُس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔ اب جو تم کو اُس خیال میں مبتلا پایا تو اُن کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار اُن کے گھر گیا بھی ہوں مگر محلے کا نام نہیں جانتا۔ نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔

میر بادشاہ صاحب سے عند الملاقات میری دعا کہ دینا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ! لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تخلص کہ میں نے آگے اُن کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ناگاہ مجھ سے آکر ملے اور تمہارا حال پوچھتے رہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بہ خیر عافیت سکندر آباد میں ہیں جب میں نے اُن سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں؟ انھوں نے کہا: صاحب! وہ میرے بزرگ اور استاد ہیں، میں اُن کا شاگرد ہوں۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں۔ بہ سہیل ڈاک آئے تھے اور آج بہ سبیل ڈاک انہا لے کو گئے! انالہ اُن کا وطن ہے اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

دکھاشتر، دو شنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء

صاحب!

تمہارا خط مع رقعہ مردِ سخن فہم پہنچا۔ تمہاری خوشامد نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ جواب میں رنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بسبیلِ ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا، کل وہاں سے آیا، آج تم کو یہ خط بھجوا یا۔

غالب

محرمہ و مرسئہ چہار شنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء

(۶۶)

صاحب!

میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں، شاید نہ پہنچا ہو؛ اس واسطے از روئے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بسبیلِ ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبے کے دن دلی آگیا اور چار شنبے کے دن تم کو خط بھیجا۔

کل آخر روز راجا امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے۔ تمہارا خط اُن کے دکھانے کو رکھ چھوڑا تھا۔ وہ اُن کو دکھایا۔ پڑھ کر یہ فرمایا کہ کسی اور مندر میں قصدِ اقامت نہیں ہے، نیا ایک تکیہ بنایا چاہتا ہوں۔ آدمی بندر بن گئے ہیں، کوئی مکان مول لیں گے، وہاں اپنی وضع پر رہوں گا۔ میرا سلام لکھنا اور یہ پیام لکھنا کہ آپ کا کلام بمبئی تک پہنچ گیا۔ اب طہران کو بھی روانہ ہو جائے گا:

سوادِ ہند گرفتاری بہ نظمِ خود، تفت

بیا کہ نوبتِ شیراز و وقتِ تبریز است

صبح یکشنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۹ء



صاحب!

تم تو اچھے خانے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمھارا خط آئے تو جواب لکھوں۔ کل تمھارا خط شام کو آیا، آج صبح کو جواب لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں مگر فارسی، انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلے کا نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شبہ کا نام بتانا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جلنے ان کی ہلا کہ ”بلی ماروں کا محلہ“ کیا چیز ہے۔ وہ تو بہ نسبت میرے بہت بڑے آدمی ہیں سینکڑوں خط انگریزی ہر روز ان کو آتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے پھر ان کے پاس آدمی بھیجا، اور آپ کا خط اپنے نام کا بھیج دیا۔ انھوں نے میرے آدمی سے کہا کہ لو اب صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اس کا کیا جواب لکھوں؟ محلے کا پتا آپ ہی لکھ بھیجے سو میں پہلے امر واقعی تم کو لکھ کر تمھاری خواہش کے موافق لکھتا ہوں۔ ان کے مکان کا پتا: ”بلی ماروں کا محلہ، دسوں کا کوچہ“۔

”بستبنو“ کا حال یہ ہے کہ میں نے ایک بار سات روپیہ کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری ان سے منگوائی، پھر ان کو اٹھارہ آٹے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو، انھیں کے ہاتھوں وہیں سے بھجوائیں اور اُس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سر دھنے کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اُس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے لے چکا ہوں مگر نقد، ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائی ہیں۔ ایک بار ہنڈوی اور دو بار ٹکٹ بھیج چکا ہوں۔ تم کو میری جان کی قسم، سہل طور پر ان کو لکھ بھیجنا کہ غالب نے کتنی کتابیں منگوائی ہیں۔ اور نقد منگوائی ہیں یا قرض، اور جو وہ لکھیں، مجھ کو لکھ بھیجنا۔

غالب

شنبہ ۱۹ فروری ۱۸۵۹ء

(۶۸)

صاحب !

تمہارا خط آیا، دل خوش ہوا۔ تمہاری تحریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم کو آگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسال قیمت منظور ہے؛ چنانچہ حق تصنیف تم نے لکھا ہے۔ بھائی ! کیا میں تم کو جھوٹ لکھوں گا۔؟ اور شیونرائن نے اگر ذکر ارسال قیمت کا نہیں لکھا، تو یہ بھی تو نہیں لکھا کہ بے ارسال قیمت منگوائی ہیں تم کو میرے سر کی قسم اور میری جان کی قسم ! شیونرائن سے اتنا پوچھو کہ اُس پاس جلد کے بعد کے جلدیں غالب نے اور منگوائیں؟ اور قیمت بھیج کر منگوائیں یا قیمت اُس سے یعنی ہے؟ دیکھو، میں نے قسم لکھی ہے، یوں ہی عمل میں لانا۔

راے امید سنگھ صاحب یہیں ہیں۔ مجھ سے ان دنوں میں ملاقات نہیں ہوئی، جو تمہارے خط کا ذکر آتا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا اور یہ جو تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ اگر "دسوں کا کوچہ" نہ ملے گا تو وہ خط تیرے پاس آئے گا۔ سو وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صاحب ! تم کو وہم کیوں ہے؟ ایک امیر نامور آدمی ہے، اُس کے نام کا خط کیوں نہ پہنچے گا؟

اجی مرزا تفتہ ! بھائی منشی نبی بخش صاحب کو تمہارے حال کی بڑی پرسش ہے۔ تم نے اُن کو خط لکھنا کیوں موقوف کیا ہے؟ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ اگر آپ کو مرزا تفتہ کا حال معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھیے گا۔

یک شنبہ، ۲ فروری ۱۸۵۹ء

غالب

(۶۹)

کیوں مرزا تفتہ !

تم بے وفا، یا میں گناہگار؟ یہ بھی تو مجھ کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو

ابھی ایک صاحب میری ملاقات کو آئے تھے، تقریباً تمہارا ذکر درمیان آیا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کول میں ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ خط کول بھیجوں یا سکندر آباد؟ اگر کول بھیجوں تو مسکن کا پتا کیا لکھوں؟ بہ ہر حال، سکندر آباد بھیجتا ہوں، خدا کرے پہنچ جائے، تمہارا دیوان بہ طریق پارسل میرے پاس آیا میں نے ہر کارے کو راجا امید سنگھ بہادر کے گھر کا پتا بتا کر وہاں بھیجوا دیا، یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ پانچ چار دن سے سنتا ہوں کہ وہ متھرا اور اکبر آباد کی طرف گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر نہیں گئے۔ بہ ہر حال، اس خط کا جواب جلد لکھو اور ضرور لکھو۔

بھائی! تم سیاح آدمی ہو، جہاں جایا کرو، مجھ کو لکھ بھیجا کرو کہ میں وہاں جاتا ہوں یا جہاں جاؤ، وہاں سے خط لکھو۔ تمہارے خط کے نہ آنے سے مجھے تشویش رہتی ہے۔ میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے؟  
محرمہ یک شنبہ، ۲ مارچ ۱۸۵۹ء

غالب

(۷۰)

صاحب!

آج تمہارا خط صبح کو آیا، میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ تمہاری ناسازگاری طبیعت سن کر دل کڑھا۔ حق تعالیٰ تم کو زندہ اور تندرست اور خوش رکھے۔  
اوراقِ مثنوی بھیجے ہوئے بہت دن ہوئے، جس میں حکایت طالبِ علم اور سنار کی تھی۔ واقعہ بلند شہر کا اور وہ اوراق میں نے پمفلٹ پاکٹ نہیں بھیجے، خط میں پیٹ کر، چون کہ خط ڈبل تھا، وٹکٹ لگا کر ارسال کیے ہیں۔ رسید ملے تو اس کو دیکھ کر تاریخ معلوم ہو جائے۔ قیاس سے ایسا جانتا ہوں کہ پان



سات دن ہوئے ہوں گے۔

منشی نبی بخش کا خط بہت دن سے نہیں آیا۔ گھر اُن کا تاج گنج، وہ خود مع بعض متعلقین آگرے۔ ایک بار تاج گنج کے پتے سے خط اُن کو بھیجا تھا، جواب نہ آیا۔ اب ناچار ہر خوردار شیونرائن سے اُن کا حال پوچھیوں گا۔ تم باہمہ کمالات خفائی بھی ہو۔ راتے امید سنگھ سے خط کی امید کیوں رکھتے ہو؟ جب آگرے جاؤ گے اور وہ وہاں ہوں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ میں خود واقف نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ از روے قیاس کہہ سکتا ہوں کہ آگرے یا بندرا بن۔ کبھی کہیں سے اُن کا کوئی خط مجھ کو آیا ہو تو میں گناہگار۔

یک شنبہ سوم ذی القعدہ پنجم جون سال حال ۱۸۵۹ء غالب

(۷۱)

صاحب!

ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ ہر خوردار میر بادشاہ آئے، میں اُن کو دیکھ کر خوش ہوا، وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے، تمہارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں، نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں۔ خیر!

ہر آنچہ ساقی ماریخت، عین الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن، کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ بسا دن کی گلی میں، جو حکیموں کی گلی کے قریب ہے، جو بس صاحب کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اُس کے قریب کی زمین افتادہ بھی

خریدی ہے اور اُس کو بنوار ہے ہیں۔ تمھارا میں نے ذکر کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے، جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط اُن کا آیا تھا، اُس کا جواب لکھ چکا ہوں؛ پھر اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔

بہ ہر حال، میرے بھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں باز دید کو نہیں گیا شاید وہ آج گئے ہوں یا جاویں، پھر اکبر آباد کو جائیں گے۔ میں آج آدمی اُن کے پاس بھیجوں گا۔

کل مرزا حاتم علی مہر کا خط آیا تھا۔ تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا مرزا تفتہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ سبھائی! اُن کو خط لکھ بھیجو۔  
محرمہ، ۱ جون ۱۸۵۹ء

(۷۲)

صاحب!

ایک خط تمھارا پرسوں آیا، اُس میں مندرجہ کہ میں میرے ٹھہ جاؤں گا۔ آج صبح کو ایک خط تمھارا اور آیا، اُس میں مندرجہ کہ پہلی جولائی کو جاؤں گا۔ اور تجھ سے ملتا جاؤں گا۔ پرسوں کے خط میں بھی اور آج کے خط میں بھی پارسل کا ذکر تھا کہ بیس جون کو ہم نے بھیجا ہے۔ بیسویں جون کو آج دسواں دن ہے۔ اس دس دن میں کوئی پارسل کوئی پمفلٹ پاکٹ میرے پاس نہیں پہنچا۔ آخری پمفلٹ پاکٹ دو مثنویوں کا وہ تھا کہ جس میں ایک مثنوی بلند شہر کے واقعے کی تھی، کہ ایک لڑکا مر گیا، اُس کی ارنکھی پھٹکتی رہی، اُس کا عاشق سامنے کھڑا جلتا رہا۔ سو اُن دونوں مثنویوں کو میں نے اصلاح دے کر

تمہارے پاس بھیج دیا ہے بلکہ یوں یاد پڑتا ہے کہ تم نے اُس کی رسید بھی لکھ بھیجی ہے۔ لیکن مجھ کو گمان یہ ہے کہ یہ امر میں جون سے آگے کا ہے نہ ہر تقدیر، بعد اس پارسل کے کوئی اور پارسل میرے پاس نہیں آیا۔ اچھی کو اندہ ہر طرف کے عموماً اور تمہارے خصوصاً دودن سے زیادہ میں نہیں رکھتا۔ جو کاغذ مجھے تک نہ پہنچے، میں ناچار ہوں بلکہ خود میرے ایک خط کا جواب تم پر قرض ہے۔ یا تو وہ نہ پہنچا یا تم نے اُس کا جواب لکھنا ضرور نہ جانا۔ وہ خط جس میں میرا بادشاہ کا دلی آنا اور اُن کا مجھ سے ملنا اور تمہارا ذکر مجھ میں اور اُن میں ہونا۔ معہذا، راجا امید سنگھ کا دلی میں آنا اور بے خبر میرے گھر آ جانا اور تمہارا اُن سے ذکر ہونا اور اُن کا یہ کہنا کہ اُن کا کُل ایک خط میرے پاس آیا تھا، سو میں نے اُس کا جواب لکھ بھیجا تھا۔ اب میں کیا جانوں کہ تم کو یہ خط پہنچا یا نہیں پہنچا۔ تمہارا وہ پارسل جس کو تم اب مانگتے ہو، میرے پاس ہرگز نہیں آیا۔

چار شنبہ ۲۹ جون ۱۸۵۹ء وقت نیم روز

غالب

(۷۲)

بھائی!

تمہارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا:

ہ ہند آمدندے ز ایراں دیار

”آمدند“ کی جگہ ”آمدندے“ بہ صیغہ استمرار کمال باہر معلوم ہوا:

رسیدند در ہند ز ایراں دیار

اُس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی پوستین کا بیچنا راہ میں واقع ہوا، پھر



”سیدند در ہند“ بے جا۔ تمھارا تصرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اُسی طرح رہنے دو۔

صاحب! ”سنبلستان“ سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمھارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ رخ کو گل، زلف کو ”سنبل“ فرض کرتے ہیں! ”سنبلستان“ میں کیا عیب ہے؟ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اس وقت تک کہ اکتوبر کی آٹھویں، ہفتے کا دن، تیسرے پہر کا وقت ہے، میر تقی میر علی صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہاترس کے منصف اور دلی کے نامنصف ہیں۔  
روز شنبہ، ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء آخر روز  
از غالب

(۷۴)

صاحب!

تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا:

جہانیاں ز تو برگشتہ اند اگر غالب

تراچہ باک، خدائیکہ داشتی، داری

خدا کے واسطے، میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟

بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں، مرزا

الہی بخش جو شہزادوں میں ہیں، اُن کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ

انکار کر رہے ہیں، دیکھیے کیا ہو۔ حکیم جی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں، اب وہ

مع قبائل اُن مسکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر

نہ جائیں۔ رہا میں:

تو بکسی وغریبی، ترا کہ می پرسد

نہ جزا نہ سزا، نہ نفریں نہ آفریں، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے  
 تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی، اب صرف روٹی ملے جاتی ہیں  
 شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اُس کی کچھ فکر نہیں ہے، مگر تم  
 کو میرے سر کی قسم، یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سنی؟ مجھے اُس  
 کے معلوم ہونے سے مزہ ملے گا۔

شنبہ ۵ نومبر ۱۸۵۹ء

غالب

(۷۵)

میری جان!

کیا سمجھے ہو! سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں:

ہریکے را بہر کارے ساختند

انت متا، سو متا۔ مصری میٹھی، نمک سلونا، کبھی کسی شے کا مزہ نہ بدلے  
 گا۔ اب جو میں اُس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھے گا کہ غالب کیا جانے  
 کہ عبدالرحمن کون ہے اور مجھ سے اُس سے کیا رسم و راہ ہے؟ بے شبہہ جانے  
 گا کہ تفتہ نے لکھا ہو گا۔ میں اُس کی نظریں سبک ہو جاؤں گا اور تم سے وہ  
 اور بھی سرگراں ہو جائے گا۔ اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اُس شخص کو اپنے  
 عزیزوں میں گنا ہے، بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی  
 عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی  
 وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں، اُس کو قوم اور ذات اور  
 مذہب اور طریق شرط ہے اور اُس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اُس  
 دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اُس شخص سے جس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں

ازراہ حسن اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہ دیا تو کیا ہوتا ہے۔ زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اُس کی سالی کا بیٹا، اس کو جو چاہو سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب اُدھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اُس کو لکھنا لغو و بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔

تمہارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا، ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمہارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندر آباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہ تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۷۶)

بھائی!

میں نے دلی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنجشنبہ انیس کو مراد نگر اور جمعے میں کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ اکیس کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہ جہاں پور، پرسوں گڑھ مکیشتر سہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا۔ سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔ باقی جو کچھ لکھنا ہے، وہ رام پور سے لکھوں گا۔

راقم غالب

مرقومہ چاشت گاہ شنبہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء

(۷۷)

صاحب!

تمہارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلی اور دلی سے رام پور پہنچے۔ یقین



ہے کہ رام پور سے میرے بھیجے ہوئے سکندر آباد پہنچے ہوں گے۔ سوائے ایک مصرع کے مجھے اور جگہ کی اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناساے مزاج روزگار کہتے ہو، خود اس میں اُس سے کیا کم ہو؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ رام پور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں میں! اُن کا مسکن میرے مسکن سے دُور۔ پھر درِ دولت رئیس کہاں اور میں کہاں! چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا، میں نے مکان جدا گانہ مانگا، دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں، اب اُس میں رہتا ہوں۔ بہ حسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے، ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رام پور کا نام اور میرا نام۔ محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں بلکہ درِ دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابق واقع و مناسب حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی تو تم کو بلالوں گا۔

غالب

اوائل فروری سنہ ۱۸۶۷ء

(۷۸)

میری جان!

آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ شرط اقامت بلالوں کا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے تمھارے نہ رہوں گا، نہ رہوں گا، زہار نہ رہوں گا۔

منشی بالکنڈ بے صبر کا خط بلند شہر سے دلی اور دلی سے رام پور پہنچا،

”تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا، تو یہاں سے، اور اگر وہی چلا گیا تو وہاں سے  
 اصلاح دے کر اُن کے اشتعار بھیج دوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار مہینا بھر  
 صبر چاہیے۔ وہ لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ از بس کہ یہاں کے حضرات  
 مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصتِ مشاہدہ اوراق نہیں ملی۔  
 تم اسی رقعے کو اُن کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء

غالب

(۷۹)

برخوردارِ سعادت آثارِ منشی ہر گوپال سلمہ اللہ تعالیٰ  
 اس سے آگے تم کو حالاتِ مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار نہیں  
 پایا۔ بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مراد آباد اور وہاں سے رام پور آئیں گے۔  
 بعد اُن کے جانے کے کوئی طورِ اقامت یا عدمِ اقامت کا کھمبہ نہ گا۔ منظور مجھ  
 کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا، تو فوراً تم کو بلالوں گا۔ جو دن زندگی کے  
 باقی ہیں، وہ باہم بسر ہو جائیں۔ والدعا۔

یکم مارچ ۱۸۶۰ء

راقم غالب

(۸۰)

مرزا آفتاب

اس عمرِ زندگی میں مجھ کو ہنسنا نا تمھارا ہی کام ہے۔ بھائی! ”تضمینِ گلستاں“  
 چھپوا کر کیا فائدہ اُٹھایا ہے۔ جو انطباع ”سنبھان“ سے نفع اٹھاؤ گے۔  
 روپیہ جمع رہنے دو۔ آمد اچھی چیز ہے، اگرچہ قلیل ہو اور اگر روپیہ لینا منظور

ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوگا۔ اگر اچانک ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اُس کو مدت چاہیے۔ ”رستخیز بیجا“ ہو چکا۔ اب ہو تو ”رستخیز“ ہو یعنی ”قیامت“ اور اُس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی ”رستخیز“ کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمالِ فتنہ سالِ آئندہ پر رہا، سو بھی مہینہ۔

میاں! میں جو آخر جنوری کو رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا اُستاد تھا اور وہاں گیا تھا؛ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا، تو بھی پانچ چار ہزار روپیے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا، دو سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا، لفٹنگ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔

یہ تو سب سن لیا، اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے، اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے، اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بہ شرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینہ، یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔



(۸۱)

مرزا الفتہ!

ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجبِ مفرط کے موجبِ نشاءِ مفرط ہوگا۔ میں اجرا سے پنسن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشا پنسن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنسن پانے کا مستحق نہیں ہے؛ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے، میرے پنسن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہِ آئندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپیے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

غالب

۱۶ اپریل ۱۸۶۷ء

(۸۲)

بھائی!

آج اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زبردست سالہ مجتمہ ہزاروں کہاں سے ہوئے! سات سو پچاس روپیے سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپیے مجھے مدد خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو روپیے متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپیے؛ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اُس کا قرض دارِ قدیم ہوں۔ اب جو وہ دو ہزار لایا، اُس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ سات کم پندرہ سو اُس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اُسی

سے حساب کروایا۔ گیارہ سو کئی روپیے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھپیس سو ہوئے۔ اصل میں۔ یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو پانسو سات روپیے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے؛ نو سو باقی رہے، آدھے تو لے، آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں چوہتھی کو وہ روپیہ لایا ہے، کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں، ہفتہ بھر میں جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن رات سے پھر کر آؤ، اُسی دن مجھ کو اپنے وردِ مسعود کی خبر دینا۔ والدعا۔

شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ء ہنگامِ نیم روز

عالم

(۸۳)

برخوردار مرزا آلفہ !

دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں مندور۔ اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پٹن دارانِ قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں سال میں دو بار بہ طریق ششماہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار، ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا، تارام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی :

رسم ہے مرے کی چھما ہی ایک  
خلق کا ہے اسی چلن پر مدار  
مجھ کو دیکھو کہ ہوں یہ قیدِ حیات  
اور چھما ہی ہو سال میں دو بار

دس گیارہ برس سے اُس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اُس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اُٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول، اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا، گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب، گمان یہ گزتا تھا کہ یہ کنگھڑا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دو شنبہ نو جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا، جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہشت ہے، اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلی ماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلے میں بھی جا رہتا تو قاصدانِ ڈاک وہیں پہنچتے، یعنی اب اکثر خطوط لال کنویں کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ یہ ہر حال، تم وہی ”دلی، بلی ماروں“ کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ دو مسودے تمہارے اور ایک مسودہ بے صبر کا، یہ تین کاغذ درپیش ہیں۔ دو ایک دن میں بعد اصلاح ارسال کیے جائیں گے، خاطر خاطر جمع رہے۔

صبح جمعہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

(۸۴)

مرزا آفتاب!

کل تمہارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔ آج تم کو یہ خط لکھتا ہوں اور اسی خط کے ساتھ خط مہسود میر بادشاہ بھیجتا ہوں۔ کاغذ اشعار کل یا پرسوں روانہ ہوگا۔ فن تاریخ کو دون مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات



لکھنے سے اداسے حقِ محبت ہوتا ہے۔ یہ ہر حال میں نے منشی بنی بخش مرحوم کی تاریخِ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمر الدین خاں صاحب نے ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے:

|                           |                           |
|---------------------------|---------------------------|
| شیخ بنی بخش کہ با حسن خلق | داشت مذاقِ سخن و فہم تیز  |
| مرگِ ستم پیشہ امانش نداد  | کیست کہ بامرگ بسید ستیز   |
| سالِ وفاتش ز پئے یادگار   | بادل زار و مژہ دجلہ ریز   |
| خواستم از غائب آشفته سر   | گفت: مدہ طول و بگو رستخیز |

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں، بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے۔ جیسا کہ یہ مصرع:

در سالِ غرس ہر آنکہ ماند بیند

الوری کے قصائد کو دیکھو، دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعدادِ سالِ مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ ”رستخیز“ کی پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب۔ اگر تاریخِ ولادت یا تاریخِ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی قدر موجبِ اداسے حقِ مودت ہے تو میں حقِ دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

سیحِ دو شنبہ پنجمِ جمادیٰ اول ۱۳۷۷ھ  
داد کا طالب غالب  
نوز و ہم نومبر سالِ حال ۱۸۶۰ء

(۸۵)

صاحب!

تمہارا خط میرٹھ سے آیا۔ ”مرآۃ الصیغۃ“ کا تمہارا تذکرہ ”سنبلستان“ کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے، اور خدا ہی تمہاری بزد کا نگہبان رہے۔ بہت گزر گئی

ہے، تھوڑی رہی۔ اچھی گزری ہے، اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کے کیا ہاتھ آیا۔ جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدی نے "بوستان" سے کیا پھل پایا، جو تم "سنبلستان" سے پاؤ گے؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ ہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے، نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصیدہ ہے۔ لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ۔

جناب بھائی صاحب یعنی مصطفیٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہ دینا۔ ہمیشہ کی پنسن کا جاری ہو جانا بہت خوشی کی بات ہے، مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بروے کار آوے، یعنی آپ کا پنسن بھی واگذاشت ہو جاوے۔ اللہ اللہ اللہ۔

صبح یک شنبہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

(۸۶)

اجی مرزا الفتہ !

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبو یا۔ باے کیا بری کاپی ہے ! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے ! صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے پانچ لیریز جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوقِ خوب رو ہے، بد لباس ہے۔ بہ ہر حال، دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے، چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔

غالب

مرقومہ صبح شنبہ ۹ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

میاں مرزا الفت!

ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ واہ! چشم بدو و تسلسل معنی،  
سلاست الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارف  
ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع  
یہ ہے:

چاک گردیدم و از جیب بہ دامال رستم

پہلا مصرع تمہارا اگر اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ  
خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا چلائے کہ ایک دیوان میں جز قصائد کا کہہ لو  
مگر خبردار! قصائد بہ قید حروف، تنجی نہ جمع کرنا۔

صاحب! مجھے اس بزرگوار کا معاملہ اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ  
اب لکھا ہے، سابق کا تمہارا لکھا ہوا سب یاد ہے۔ میں نے اُس کو دوست  
یہ طریقہ طرز لکھا ہے۔ بہر حال، وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اُس کو بھیجا،  
اُس کی ماں مرے، اگر میرے اُس خط کا جواب لکھا ہو۔

بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا، داغِ کہنہ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ  
منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے  
نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا، اُسی دن پانچ ہزار روپیے  
کے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی مگر الدولہ  
مرحوم لکھنؤ سے آئے، انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا  
نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناخ کو لکھا کہ تم  
دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری؟ انھوں نے جواب میں لکھا کہ



پانچ ہزار ملے: تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو  
 دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اُس نے  
 ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے  
 پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں اکھنوں نے لکھا کہ اب تم  
 مجھے خط لکھو، اُس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ  
 بھیجا ہے۔ اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ میں نے  
 نہیں جانا کہ اُس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہنا سچ ہوں اپنے نام کا۔ خط  
 بادشاہ کو پڑھا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ اُن کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج  
 دوں گا۔ کھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔  
 تیسرے دن شہر میں خبر اُڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں  
 اور ناسخ کیا کرے!

دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

غالب

(۸۸)

مرزا آفتاب صاحب!

اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔  
 پہلے تو یہ کہ ”خنجر و گوہر“ کو تم نے از قلم تنافر سمجھا اور اُس پر اشعارِ سائنہ سند  
 لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں تسلیم:

شراب نقل نخواہد بگیر ساغر را

کہ احتیاجِ شکر نیست شیر مادر را

یہ غزل شاہ جہاں کے عہد کی طاحی ہے۔ صاحبِ وقہمی و شعراے ہند سے

اس پر غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی کیوں ارادو۔  
”ضیاء الدین احمد خاں“ نام ہے؛ ہندی میں رختاں تخلص، فارسی میں نیر تخلص؛

ہمانا نیر رختاں ضیاء الدین احمد خاں

دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے! یہ نہ کہنا کہ شعر ممدوح کا نام نہ لکھا جاتے ہیں؛ وہ  
بہ حسبِ ضرورت شعر ہے۔ جس بحر میں پورا نام نہ آئے، اُس میں شوق سے لکھو؛  
جائز، روا، مستحسن۔ جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے، اُس میں فرو گذاشت  
کیوں کرو۔؟

غالب

دوشنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۱ء

(۸۹)

صاحب:

”گوہرا“ ”خاوررا“ یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔ ہم نے اصلاح دے کر  
تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ جب تم صاف کر کے بھیج دو گے، ہم تمہارے ممدوح کو  
دے دیں گے۔ کل تمہارا یہ قصیدہ پہنچا۔ ہم نے دوپہر کو دیکھ کر درست کیا۔ آج پختہ  
بارہ ستمبر کو ڈاک میں بھجوا دیا۔

صاحب! آج میرا بادشاہ آئے، تمہاری خیر و عافیت اُن کی زبانی معلوم ہوئی۔  
اللہ تمہیں خوش رکھے اور مجھ کو تمہارے خوش رکھنے کی توفیق دے۔ ممدوح کا  
نام کیا لکھوں؟ بات اسی قدر ہے کہ رام پور میں کوئی صورت کسی طرح بنتی نظر  
نہیں آتی، ورنہ کیا تمہارا قصیدہ وہاں نہ بھجواتا؟

”دُرا“ کو یہ نہ کہو کہ تشدید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدد ہے۔ شعرا اُس

کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدی کے مضرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ ”دُرّاعہ“ بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے ”جادہ“ اور ”دُرّاعہ“ دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ وال کی تشدید سے اور یہ ”رے“ کی تشدید سے۔ مگر خیر ”جادہ“ و ”دُرّاعہ“ بھی نکھتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ ”دُرّاعہ“ ہرگز نہیں ہے۔ یہ کہو کہ ”دُرّاعہ“ بے تشدید بھی جائز ہے۔

پنچشنبہ ۱۲ ستمبر ۱۹۶۱ء

غالب

(۹۰)

”انگشتی“ اور ”خاتم“ دونوں ایک ہیں۔ تم نے ”خاتم“ بہ معنی ”ٹنگین“ باندھا، یہ غلط۔ ”جنس و فاعل کس محر“ کیا ترکیب ہے؟ ”جنس کس محر و فاعل“ البتہ درست ہے۔ نظر اول میں بہ سبب تکرار حواس اور کثرتِ در و درم پا کے میں نے خیال نہ کیا ہو گا۔

یہ خط لکھ کر بند کر رکھا تھا کہ کل صبح رزائے کروں سکا؛ چشم بد دور! آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے، آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ وہ سرا جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے، اُس کو کتر کر یہ سطر لکھ کر پھر بند کرتا ہوں۔ سبحان اللہ!

”دیگر نتواں گفت اخصل را کہ اعم ست این“

اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو! غور کرو، بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کر دے۔ شرف قزوینی کے مطلع میں ”ساغر غم در کشیدہ ایم“ و ”وم در کشیدہ ایم“۔ دوسرے شعر میں:

پیما نہاے زہرِ ستم در کشیدہ ایم

”در کشیدہ“ کو ربط ”پیما نہ“ کے ساتھ ہے یا ”زہر“ کے ساتھ؟ اگر



”زہر درکشیدن“ جائز ہوتا تو وہ ”سم“ کے تلافیے کو کیوں چھوڑتا؟ تیسرے شعر میں ”قلم درکشیدن“ ہے۔ چوتھے شعر میں ”آب درکشیدن“ ہے۔ پانچویں میں ”سر درکشیدن“ ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر بہ مثل ”زہر آب“ ہوتا تو روا تھا۔

سبحان اللہ! ”یہ عبارت“: ”جائیکہ شرف قزوینی ساغر و پیمانہ وزہر درکشید“ اے برادر! شرف زہر کجا درکشید؟ بلکہ پیمانہ زہر درکشید۔ شہا ہم ساغر سم درکشید ”سم درکشیدن“ کجا؟ ”پیمانہ غم درکشیدن“ کجا۔ ہم نے تو تم کو اجازت دی ہے۔ خیر رہنے دو، ہند میں اس کو کون سمجھے گا؟ چاہویں کر دو:

دانی من و دل آنچہ بہم درکشیدہ ایم

در یک نفس دو ساغر سم درکشیدہ ایم غالب

سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو:

گمان زیست بود بر منت ز بیدری

براست مرگ، وے بدتر از گمان تو نیست

خیر شرف قزوینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو۔ ”غالب“

میں ایسا جانتا ہوں کہ ”دراغہ“ یہ تشدید ہے اور وہ ”ورع“ یہ وزن ”زرع“

اور لغت ہے۔

صاحب! یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا

ہے! ایک خیال رکھا کرو کہ شعر اخیر میں کوئی بات ایسی آجائے کہ جس سے اختتام

کے معنی پیدا ہوا کریں۔

ایک قصیدہ اصلاح دے کر بھیج چکا ہوں اور اُسی ورق پر فلاسنے

صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں۔ ادھر کے جواب کا ہرگز خیال

نہ رکھو اور ادھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہوا کرے تو گھبرایا نہ کرو۔  
اب میرے پاس دو قصیدے ہیں: ایک "لشکرِ برآورم" اور ایک کل آیا ہے۔  
"برجاماند" و "دریاماند" خوب کہے، کہ مضمون سے پہلے ممدوح ڈھونڈ مٹھنا  
پڑتا ہے! اگر میں تم کو ممدوح بتا سکتا تو قصیدہ اُس کے نام کا تم سے منگوا چکا  
ہوتا اور اُس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی! ایک دقیقہ ہے، کہ لکھنے کے قابل  
نہیں۔ ہاں، ملاقات ہوئے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ اللہ۔  
ستمبر ۱۸۶۱ء

(۹۱)

صاحب!

قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا! آفریں ہے! پھر اُسے ارد کے شعرِ تثنیہ کیوں کرتے  
ہے؟ نہ اس کی کچھ حاجت، نہ اس میں کوئی افزائشِ حسنِ تمھاری۔ ایک شعر  
کو ایک شعر کے بعد رکھ دیا ہے تاکہ مقطعِ کلام ہو جائے۔ پہلا قصیدہ تمھارا  
"برآورم" "در آورم" کی روایت کا سست ہے، اُس کو ہم نے نامنظور کیا؛  
مگر نظر ثانی میں جو شعر قابلِ رکھنے کے ہوں گے، وہ لکھ کر تم کو بھیج دیں گے۔  
بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ آئندہ اس پانغز سے احتراز  
کرو:

تورِ سعادت از جہتِ قاصدِ مچکد

یہ کیا ترکیب ہے؟ "جہت" بروزن "چشمہ" ہے۔ یعنی دو ہلے ہوز ہیں۔ "جہت"  
تصدیک ایک ہلے ہوز کہاں گئی؟

ہر کجا چشمہ بود شیریں

”چشمہ“ کی جگہ ”چٹہ“ لکھتے ہو۔ یہ بات ہمیشہ کو یاد رہے۔ اتنے بڑے مشاق سے ایسی غلطی بہت تعجب کی بات ہے۔ میاں :

برگِ دنیا نہ سازِ دیش بود

یہ کوئی لغت نہیں۔ ایک لفظ نہیں کہ کسی فرہنگ میں سے نکل آئے؛ یہ طرزِ تحریر ہے۔ کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے؟ اس امر سے قطع نظر وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی وال اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بختی کروں۔ دو جوتیاں آپ لگا دیں ایک جوتی تم سے لگوا دی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔ میں ”برہان“ کا خاکہ اڑا رہا ہوں، ”چار شربت“ اور ”غیاث اللغات“ کو حیض کا لٹا سمجھتا ہوں؛ ایسے گم نام چھو کروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ ”برہان قاطع“ کے علاوہ بہت نکالے ہیں۔ دس جز کا ایک رسالہ لکھا ہے اُس کا نام ”قاطع برہان“ رکھا ہے؛ اب اُس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا ورنہ کاتب سے نقل کروا کر قلمی ایک جلد بھیج دوں گا۔ بہت سودمند نسخہ ہے۔

اس قصیدہ متبرکہ کو موافق اصلاح کے اس کاغذ سے اور کاغذ پر نقل کر کے اور جو مطالب کہ اس کاغذ پر مرقوم ہیں اُن کو حافظے کے سپرد کر کے اس ورق کو پھاڑ ڈالو اور اس قصیدے پر ناز کیا کرو۔ یہ قصیدہ تمہارا ہم کو بہت پسند آیا ہے۔

جمو ۳ اکتوبر ۱۸۶۱ء

غالب

(۹۲)

صاحب!

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کا تمہیں صلہ دے۔



نواب مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں سے قصیدے کی رسید آگئی۔ یقین ہے کہ تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ دریں ولایہاں آیا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا، کیا کہنا ہے، ایسا ہے اور ایسا ہے، میں چند روز میں وہاں آتا ہوں، عند الملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہوں گی۔

ضیاء الدین خاں صاحب کا بھی مقدمہ آج کل فیصل ہوا چاہتا ہے۔ وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے، اُن کو دیا جائے گا، انشاء اللہ العلیٰ العظیم۔

از من فراغ بر د بریدم من از فراغ  
 "بریدم من از فراغ" یعنی قطع نظر کردم از فراغ و نوید شدم از فراغ۔  
 اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء

(۹۳)

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں۔ اُن کو میں نے تمہاری فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے، تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے، یہ کون ہے یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب اور دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین خاں، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۱ء میں یا اوائل جنوری ۱۸۶۳ء میں حاضر ہوں گے۔  
 اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء

(۹۴)

صاحب!

دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف؛ ایک فارسی، ایک عربی۔ ہر چند اس

منطلق میں لغاتِ ترکی بھی آجاتے ہیں مگر کمتر میں عربی کا عالم نہیں مگر نیرا جاہل بھی نہیں بلکہ اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں، علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں؛ ایک تو یہ کہ اُن کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دوسو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پسیدہ ہوئے ہیں۔

”جوہ“ لغتِ عربی ہے بمعنی ”بخشش“ ”جوہاد“ صیغہ ہے صفتِ مشبہ کا بے تشبیہ اس وزن پر صیغہ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود لکھوں گا مگر جب کہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا تو میں نے مانا۔

کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاء وں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اُس کے قوافی لکھ لیے اور اُن قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ! بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لغت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اُس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف تلافیہ دیکھ لیا۔ اور اُس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو، نظیری کا دیوان وقتِ تحریر قصیدہ پیش نظر ہوگا اور جو اُس کے قافیے کا شعر دیکھا ہوگا، اُس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمہارے اس خط کو دیکھنے سے پہلے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ بھی ہے، چھپ جائے آں کہ وہ شعر، بھائی! شاعری، معنی آخری ہی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

”زمان“ لفظ عربی ”ازمنہ“ جمع، دونوں طرح فارسی میں مستعمل، ”زمانے“، ”یک زمان“، ”ہر زمان“، ”زمان زمان“، ”در آں زمان“، سب صحیح اور

فصح۔ جو اس کو غلط کہے وہ گدھا۔ بلکہ اہل فارس نے مثل "موج" و "موجہ" یہاں بھی  
 "ہے" بڑھا کر "زمانہ" استعمال کیا ہے۔ "یک زمان" کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا،  
 سندی کے شعر لکھنے کی کیا حاجت؟

سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں رہتے  
 ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھا گھس، اُلو  
 عبدالواسع ہانسی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلو کا پٹھا فتنیل "صفوت کدہ"  
 شفقت کدہ" و "نشت کدہ" کو اور "ہم عالم" و "ہم جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی  
 ویسا ہی ہوں جو "یک زمان" کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میسر ہاتھ  
 میں ہے۔ لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَلِلّٰہِ الشُّکْرُ  
 مرقومہ چار شنبہ ۲۴ ماہ اگست ۱۸۶۲ء

(۹۵)

بھائی!

"ریمیا" و "ہیمیا" خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون  
 اور بوعلیؑ یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ "کیمیا" اور "سیمیا" دو علم شریف ہیں۔ جو اشیا کی  
 تاثیر سے تعلق رکھے، وہ "کیمیا" اور جو اسما سے متعلق ہو وہ "سیمیا"۔

جاں غم سیمیا نخورد گہے

دل سوے کیمیا نیا و روم

شعرا معنی ہو گیا۔ یہ نہ سمجھا کر وکراگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق  
 پیدا نہیں ہوتے تھے؟



”زمان“ و ”زمانہ“ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؛ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں ”زمان“ و ”زمانہ“ لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کا ٹا گیا؛ سمجھو پہلا مصرع لغو دوسرے مصرع میں ”نبرد“ کا فاعل معدوم۔ ”حلقہ زرا“ کی ”زے“ پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصے میں لکھا کہ نہ ”حلقہ زرا“ درست نہ ”حلقہ زرا“ درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے، خیر رہنے دو۔ مڑا ہوں، مجھے سمجھاتے ہو کہ ”صد جادو کلام اہل زباں خواہند یافت۔“ مگر میں بانی کلام اہل زبان نہیں؛

گردش چرخ استخوان سائند

اس سے یہ بہتر ہے :

سودہ شد استخوان ز گردش چرخ

باقی اور مصرعے سب اچھے بنائے ہیں۔

اگست ۱۸۶۲ء

غالب

(۹۶)

مرزا تفتہ !

جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے وردی ہے اور بدگمانی۔ مَعَاذُ اللہ، تم سے اور

آزردگی ! مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہر گوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ

”موجبِ ملال ہو؟ رہا غماز کا کہنا، اُس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا کہ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا؛ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری

بڑائی کہتے تو میں اُس کو جھڑک دیتا اور اُس سے آزرہ ہوتا۔ بھائی! مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی، خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بہ کار آمدنی نہیں۔ خیر کبھی دیکھ لوں گا، جلدی کیا ہے؟ تین بات جمع ہوئیں: میری کاہلی، تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظران مراتب پر کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بالکنڈ بے صبر کا ایک پارسل ہے کہ اُس کو بہت دن ہوئے، آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں:

ضعف نے غالب نکما کر دیا  
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔ آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا! اُس کو دیکھا، لغافہ کیا، آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوا یا۔

غالب

۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء

(۹۷)

صاحب بندہ!

میں نے جس کا ایک ایک خانہ دیکھا، سوائے تین کاغذوں کے، کوئی کاغذ تمھارا نہ نکلا۔ اور اس وقت بہ سبب کم فرصتی کے میں ردیف اُن تینوں قصیدوں کی

نہیں بتا سکتا اور وہ مقدمہ پچاس کا بہ اقتضائے حالات زمانہ سست ہو گیا ہے،  
مٹ نہیں گیا۔ ویرا یہ درست آید انشاء اللہ۔

اب میرا حال سنو:

درنومیدی بے امید است

پایان شب سیر سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لاٹرڈکننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے۔ میں نا اُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹ گورنر پنجا ب آئے ہیں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لاٹرڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں اُن اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے؛ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ، شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری؟ گویا مردہ جی اٹھا؛ مگر ساتھ اُس مسرت کے یہ بھی سنا تا گزارا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر اُدھر روپیے کی تدبیر؛ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپیے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدایہ مشکل بھی آسان کرے گا لیکن ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تمھیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آکر خط لکھوں گا۔

روزہ چار شنبہ ۱۳ رمضان ۱۲۷۹ھ

۴ مارچ ۱۸۶۳ء



(۹۸)

لو صاحب!

ہم نے لفٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے، انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

اپریل ۱۸۶۳ء

غالب

(۹۹)

حضرت!

آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔ بعد اصلاح بھیج دیے گئے۔ ستر برس کی عمر! آلام روحانی، نہ میں کہوں، نہ کوئی باور کرے۔ امراض جسمانی میں کیا کلام ہے؟ بائیں پاؤں میں جہینا بھرے ورم ہے، کھڑے ہونے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افضالِ دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ قصہ مختصر! ایک قصیدہ سابق کا اور ایک کل کا آیا ہوا، یہ دونوں ایک لفافے میں آج روانہ کرتا ہوں۔

جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء

غالب

(۱۰۰)

حضرت!

پرسوں صبح کو تمہارے سب کو اغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر

بھجوا دیے۔ سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔ اسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا،  
اُس کو بھی روانہ کرتا ہوں۔

اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو  
کچھ لکھتا ہوں، وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مزے کی بات ہے کہ میرا لکھا ہوا میسر  
حال باور نہیں، اور کسی نے جو کہ دیا کہ غالب کے پاؤں کا ورم اچھا ہو گیا اور اب  
وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔ بیس برس آگے یہ  
بات تھی کہ ابرو باراں میں یا پیش از طعام چاشت یا قریب شام تین گلاس پی لیتا  
تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برس تیں  
ہوئیں، بڑے بڑے مینہ برے، پینا یک طرف دل میں بھی خیال نہ گزرا بلکہ رات  
کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل  
نہ نکلا، کھولن شروع ہو گئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں، اُن کی رائے کے مطابق کل سے  
نیب کا بھرتا بندھے گا۔ وہ پکا لائے گا، تب اُس کو پھوٹنے کی تدبیر کی جائے گی، تلوا  
زخمی، پنڈلی زخمی، اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے تو اُس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا  
ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔

۵ جولائی ۱۸۶۳ء

(۱۰۱)

مرزا تفت!

یہ غلطی تمہارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباح

یہ کہ "اعلم" پر تشدید لفظ عربی ہے؛

”دیگر نتواں گفت اخس را کہ اعم است“

مگر بحر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسانِ عجم نے یوں بھی لکھا ہو، کاف کے استقام کی کیا توجیہ کرو گے؟ اور پھر اس صورت میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو زکال ڈالو۔ ہمیں نے تمہیں قصائد لکھنے کو کہا تھا، اب ہم منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو۔ مدح بہ شرطِ ضرورت لکھو، مگر بہ فکر و غور۔

۱۶ جولائی ۱۹۳۳ء

غالب

(۱۰۲)

سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں ”بروے استاد بن رنگ“ کو کہاں سے سمجھتا؟:

پہ از من نصیحت گرے بایست

نہ انم پس از من چہ پیش آیدت

میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں، اُس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدتِ مرض کا بیان مبالغہ شاعرانہ ہے، اُس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا۔ حال آں کہ یہ دونوں کلمے از راہِ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرحِ بسانِ واقعی کو باور نہ کیا، تو میں نے تمہیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں۔ اور یہ کلمہ تمہیں میں نے جب لکھا ہے کہ عجب کر لیا ہے کہ حسبِ تاکِ دم میں دم اور باتھ میں جنبشِ تعلیم ہے، جب تک موقعِ اصلاحِ خیال



میں آسکتا ہے؛ آج جو تمہارا دفتر پہنچے گا، اُس کو کل روانہ کر دیا کروں گا۔  
 مجھلا حال میرا یہ ہے کہ قریب بہ مرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوٹے،  
 پاؤں میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا، لیٹے  
 لیٹے نکھتا ہوں۔ کل تمہارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اُس کو دیکھ کر تھیں  
 بھجوا دیا۔ زہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجتے رہو، ایک  
 دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔

صبح پنجشنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء

غالب

(۱۰۲)

صاحب :

”کشیدن“ کی جگہ ”در کشیدن“ و ”بر کشیدن“ بلکہ ”بر کشیدن“ کی جگہ  
 ”در کشیدن“ نہ چاہیے۔ ”بر آمدن“ و ”در آمدن“ کا استعماں بعض متاخرین نے  
 عام کر دیا ہے۔ یعنی ”در آید“ سے ”بر آید“ کے معنی لیے ہیں؛ لیکن ”در کشیدن“ اور  
 ”بر کشیدن“ اور۔

میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم نے درماتہ کے پھوٹے نے ہر  
 ڈالا ہے۔ ہاور کرنا اور میرے سب آدمی، بلکہ بعض دوست جو رہتے ہیں وہ  
 بھی گودہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک درشائے صبح تک پڑا ہوا ہوں۔ غشوز  
 کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار صراح کو بہت جگہ سے آتے کھنکھنے سب  
 کو منع کر دیا۔ ایک رئیس۔ مہار اور ایک نم۔ ان کی صلاح رد گئی۔

مارچ نمبر ۱۸۶۳ء

(۱۰۴)

نورِ چشمِ غالبِ از خود رفتہ، مرزا آفتہ!  
خدا تم کو خوشش اور تندِ رست رکھے نہ دوست بھیل نہ میں کا ذنب؛  
مگر یہ قول میرِ تقی؛

اتفاقات ہیں زمانے کے  
بہ ہر حال، کچھ تدبیر کی جائے گی اور ایشاءِ اللہ صورتِ وقوع جلد نظر  
آئے گی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا:  
یا کرم خود نماند در عالم  
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد  
اغیناے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعارِ عاشقانہ بہ طریقِ غزل کہا کرو اور  
خوش رہا کرو۔  
سہ شنبہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء  
نجات کا طالب۔ غالب

(۱۰۵)

صاحب!

کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پر یہ لکھ کر کہ یہ  
پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیج دیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں  
کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمت گار ناخواندہ آدمی، اس کا حکم بجالایا اور  
اس کو خطوں کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے،  
دست آویزِ معقول ہے۔ اگر وہاں کے ڈاک تم سے خط کا محصول مانگیں تو تم  
اس جملے کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔

مکان، میرے گھر کے قریب، حکیم محمود خاں کے گھر کے نزدیک عطار بھی پاس، بازار بھی قریب۔ ڈھائی روپیہ کرایے کو موجود مگر مالک مکان سے یہ وعدہ ہے کہ ہفتہ بھر کسی اور کو نہ دوں گا۔ بعد ایک ہفتے کے اگر تمہارا مسافر نہ آیا تو مجھے اور کرایہ دار کے دینے کا اختیار ہے۔

رام پور کے باب میں مختصر کلام یہ ہے کہ نہ میں والی رام پور کو لکھ سکتا ہوں، نہ اس نہ لکھنے کی وجہ تم کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر کبھی ریل میں بیٹھ کر آ جاؤ گے تو زبانی کہہ دوں گا۔

رہنہ ۳ ربیع الثانی و ششم ستمبر ۱۸۶۴ء

غالب

(۱۰۶)

بھائی!

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اُسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مہینہ شروع ہوا۔ شہر میں سنکڑوں مکان گرے اور مہینہ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اُٹھنے، سونے جاگنے، بیٹھنے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اُگا لداں رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق



ہوا اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔ میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے، تمھاری خیر و عافیت اُن سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات اُن سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں۔ احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ قصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب سہل کی فکر ہے۔ سو اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا، تکلف کی ملاقات کا، آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑ رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ اللہ صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء

۱۰۷

منشی صاحب!

میں سال گذشتہ بیمار تھا۔ بیماری میں خدمتِ احباب سے منقطع رہیں رہا۔ اب مردہ ہوں۔ مردہ کچھ کام نہیں کر سکتا۔ کمشنر ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترک ملاقات ہے مگر ڈپٹی کلر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے۔ ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں، تو میں نہ دیکھتا ہوں۔ ذکر و در صاحب ڈپٹی کلر چھے حسینے کی رخصت کر رہا ہے۔ ان کی جگہ ریٹی گن صاحب مقرر ہوئے، اُن سے نہ چارہ بندہ پرا۔ وہ تذکرہ شعرا سے بندہ انگریزی میں لکھتے ہیں، مجھ سے بھی خوب نے مریدان میں نے ساتھ کتابیں سنائی ضیاء لدین خاں صاحب سے۔ ان سے کہیں۔ ان سے پاس بھیجیں۔ پر انھوں نے مجھ سے کہ جن شعر کہے تھے، ان سے ان کا نسخہ بھیجیں۔ میں نے سہلو، ان کو بھیج دیا۔

اس کے لئے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے:

نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر رئیس لوہارو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رختاں تخلص کرتے ہیں، اسد اللہ خان غالب کے شاگرد۔ نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہاں گیر آباد، اردو میں شفیقہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے منشی سرگوپال معزز قانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خان غالب کے شاگرد۔ ظاہر بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا، پھر کچھ آپ لکھا ہوگا۔ مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں۔ تمہارے خط کی رو سے میں نے اطلاع پائی۔ اب میں مولوی مظہر الحق، اُن کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا۔ اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے، اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا، عرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔ خدا کرے کچھ تم کو فائدہ ہو جائے۔ ورنہ یہ ظاہر سوائے درج ہونے نام کے، اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے۔

رٹی گن صاحب اب عدالت خفیہ کے جج ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب پہاڑ سے آئے، اپنا کام کرنے لگے۔ رٹی گن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے۔ معبذا جاڑے کا موسم بڑھا پے کا عالم، وہاں تک جانا دشوار اور پھر کوئی مشتبہ نکتہ ابوالنظر میں نہیں۔ بہر حال، مولوی مظہر الحق پرسوں یک شنبہ کے دن میرٹھ میں آئیں گے، حال سمجھ کر کے، گرمیر، جانا یا لکھنا تمہاری نجات کا موجب ہوگا تو ضرور جاؤں گا۔

(۱۰۸)

آؤ مرزا لفتہ، میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو: ایک شب نے کو مولوی منظر الحق آئے تھے، اُن سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو اُن کے بھائی مولوی الوار الحق نے بہ موجب حکم ریٹنگن صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دیوان تمہارے اور نشر عشق اور ایک تذکرہ؛ یہ چار کتابیں تمہاری بھیجی ہوئی، اُن کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمہارے بہت معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہو گا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمہارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے۔ باقی مابہ خیر، شما بہ سلامت ہاں، ان کے تحت میں پندرہ بیس روپیے شاہرے کے علاقے ہیں، اگر تمہاری اجازت ہو، تو اس امر میں اُن سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے، حیران ہوں کہ تمہیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا؛

گمانِ زبیت بُوَد بر منت نہ بیدردی

بدست مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست

سامع مرگیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب منخمل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپیے مہینہ دیتے ہیں؛ سال گذشتہ اُن کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کا سرکار سے ملتا ہے، عوامِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجئے تو میں ”سکول“ سہی، درہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بہ شرطِ خدمت ہے تو جو آپ کا مرصی ہے، وہی میری



قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوحِ مقررہ نو بزرگ آئی، اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے؟ آج تک نواب صاحب اندراہ جواں مردی دیے جاتے ہیں۔ اور بھائی، تمھاری مشق، چشمِ بددور صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا۔ اور اگر خواہی نہ خواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان! میرے بعد کیا کرو گے؟

میں تو چراغِ دم صبح و آفتابِ سرکوب ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ

۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء

نجات کا طالب، غالب

(۱۰۹)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ غالب کی دعاے درویشانہ قبول کریں۔

ہم تو آپ کو سکندر آباد، قانون گولیوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ، راجا مان سنگھ کی حویلی، مطبعِ اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدارِ یا حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نول کشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ مھلا، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یکشنبہ ہے، اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے تو پینچنبے، حد جمعے کو پہنچتا تھا۔

مرزا قسٹ کیا فرماتے ہو؟ کیسے ریٹ گن صاحب، کہاں ریٹ گن صاحب پینچنبے کے دن، انیس جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات تو دیر کو نہیں گیا۔ انوار الحق گھاٹ پر نوکر ہیں، پندرہ روپیے شاہرہ پاتے ہیں۔ زیادہ زیادہ۔

صبح یکشنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب، غالب

(۱۱۰)

میرزا لفتہ، کہ پیوستہ بدل جا دارد  
ہر گجا ہست، خدایا بسلامت دانش

صاحب!

کئی بار جی چاہا کہ تم کو خط لکھوں مگر متحیر کہ کہاں بھیجوں؟ اب جو تمہارا خط آیا، معلوم ہوا کہ حضرت ابھی لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ خط نہ بھیجوں تو گنہگار۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مجھ میں اصلاح کی مشقت کی طاقت نہیں رہی، مہذا تمہارا کلام پختگی کو پہنچ گیا ہے، اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئین شکار سکھاتا ہے؛ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ تم مجھے اپنے کلام کے دیکھنے سے محروم رکھو۔ جو غزل، قصیدہ لکھا کرو، نہ مسودہ بل ایک نقل اُس کی ضرور مجھ کو بھیجا کرو۔

غالب

فروری ۱۸۶۵ء

(۱۱۱)

مرزا لفتہ! پیر شو و بیاموز۔

تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو، وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو، وہ قیاس کہیں مطابق واقع ہوتا ہے، کہیں خلاف۔ عربی کہتا ہے:

روح را ناشتا فرستادی

یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا۔ ”ناشتا“ اُس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اُس کی: ”نہار منہ“۔ تم لکھتے ہو:

کہ عجب ناشتا فرستادی

یعنی غذاے صبح، جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: اُس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں؟ واقف کہتا ہے:

نے محرمِ قفس، نہ بہ دامِ آشنا شدیم  
نفرینِ کینم ساعتِ پروازِ خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے: ”بری گھڑی“ اور ”سبھ گھڑی“۔ اہل زبان ایسے موقع پر ”طالع“ لکھتے ہیں:

نفرینِ کینم طالعِ پروازِ خویش را

تقل کہتا ہے:

یک و جب جائے بکوعے تو زخوں پاک بنود  
گشتہ بر گشتہ تپاں بود، و گر خاک بنود

یہاں ”پہچ نہ بود“ کا محل ہے۔ ہندی میں ”کچھ نہیں“ کی جگہ ”خاک نہیں“ بولتے ہیں اور پھر صاحب ”برہانِ قاطع“ کا کیا ذکر کرتے ہو، وہ تو ہر لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے، زیرِ زبر۔ پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا ہے۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کافِ عربی سے لکھے گا، کافِ فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طائے حطی سے لائے گا، تا سے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا۔ فضلاے کلمات کے حاشیے دیکھو کہ وہ اُس کی کیا تحقیق کرتے ہیں۔ ”نبیا“ ثبوت کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ ”امام“ کے مشتقات میں سے نہ ہمارے ہیں۔ ”نبی بخش“ کا محفف ”نبیا“ اور ”امام“ کا متعلق اگر مذکور ہے، تو ”امامی“ اور اگر مونث ہے تو ”امامی“۔ طغرائے ہندی لغت کے لاتے کا التزام کیا ہے:

وقتِ آں آمد کہ مینا را گبِ ہندی سر کند



اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں مگر کیا کریں؟ گڑ گالوں کا نام ہے ایک گاؤں کا، اس کو کیوں کر بدلیں؟ ہاں "گڑ" ہرے قرشت کہیں گے لکھنؤ نام ہے ایک شہر کا، وہ "لکھنؤ" بغیر ہائے مخلوط کے کہیں گے۔ فی زمانہ "چھاپے" کو "چاپ" بولتے ہیں۔ عرفی "جھکڑ" کو "جکر" بولتا ہے:

آں باد کہ در ہند گر آید، جکر آید

ہائے ثقیلہ، ہائے مخلوط، تشدید؛ یہ تینوں تقالبتیں مٹا دیں۔ صاحب "برہان قاطع" اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے؛ اپنے کو "سوا" اور خلق کو گمراہ کرتا ہے:

ہرزہ مشتاب و پے جاہ شناساں بردار

اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی "مسلم الثبوت" نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اُس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں۔ گالے کا بچہ بہ زور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اُس کو خدا سمجھے۔ یہ جھکڑے قصے جانے دو، دو باتیں سنو: ایک تو یہ کہ "ارغنون" کو بہ غین مضموم میں نے سہو سے لکھا۔ دراصل "ارغنون" بہ غین مفتوح اور مخفف اُس کا "ارغن" اور مبدل منہ "ارگن" ہے۔ دوسرے یہ کہ جب موسوی خاں نے "ایوانے" کو "ایوان" لکھا تو اس لفظ کی صحت میں کچھ تامل نہ رہا۔

رام پور سے اپریل مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب

آگیا۔ آئندہ جو خدا چاہے۔

یکشنبہ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب غالب

صاحب!

تم نے "تن تن" کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ لکھا نہ تھا۔ "تن تن" اور "تننا" اصوات ہیں مار کے۔ ہندی و فارسی میں مشترک "نبیا" اور "امام" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں کیا، شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "نبیا" "محفف" "نبی بخش" اور "امام"، متعلق بہ "امام" ہے۔ مشتقات میں سے اس کو تصور نہ کرو۔ قاعدہ دانان اشتقاق تم پر سنیں گے۔

"ایو اے" کے جتنے شعر تم نے لکھے ہیں، سب مانع ہیں "ایو اے" کے اور سند "ایو اے" کی۔ موسوی خاں نے بہ حسب ضرورت شعر "ایو اے" لکھا ہے۔ تہمتن بروزن "قلمن" ہے۔ فردوسی نے سوجگہ "شاہتاے" میں "تہمتن" بہ سکون ہاے ہوز لکھا ہے پس کیا اس لغت کی دو صورتیں قرار پاگیں؟ لا حول ولا قوۃ! لغت وہی بہ حرکت ہاے ہوز ہے۔

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا، صائب کے شعر کی حقیقت شرح و بسط سے لکھی، تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ "ایو اے" کو الگ سمجھے، "مصیبتا" کو جدا سمجھے، بھلا میرے قول کو گوزشتر سمجھتے ہو؟ "نرا" "مصیبتا" یا "حسرتا" "برہان" تا طع" میں یا "بہار عجم" میں ہم کو دکھا دو۔ وہی "اے" ہے کہ جب اس کے بعد "مصیبتا" یا "حسرتا" یا "ویلا" آتا ہے تو تختانی کو حذت کر کے "واویل" وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو "اے وایل" لکھو، چاہو "واویل" لکھو، چاہو آخر میں ہاے ہوز لکھو، جیب کہ "وا مصیبتا"، چاہو بے ہاے ہوز "وا مصیبتا" اور یہی حال ہے "حسرت" و "درد" و "اسف" و "دریغ" کا۔ جہاں "اے" کے ساتھ "وا مصیبتا" پاؤ، وہاں "اے" کو حرف ندا اور منادی یعنی "ہم نشیں اور "ہدم" کو مفرد سمجھو۔ فریبگ لکھنے

والوں نے اشعارِ قدما میں ترکیبیں دیکھیں، اپنا قیاس ”دوڑا کر اُس کی حقیقت ٹھہری  
کہیں اُن کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سو اُن میں یہ دکتی ایسا کج فہم ہے کہ اُس کا قیاس  
سولنت میں شاید دس جگہ صحیح ہو۔ میں نے توصوف لکھ دیا تھا کہ موسوی خاں  
کے شعر کی سند پر ”ایوا“ کو رہنے دو، مگر صائب کے شعر میں ”ایوا“ کو الگ اور مصیبتاً  
کو جدا نہ سمجھو۔ تمہارے قیاس نے پھر تمہیں کہیں کا کہیں پھینکا اور تم نے بھی کہا  
کہ صائب نے ”ایوا“ لکھا ہے۔

آخر مئی ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب۔ غالب

(۱۱۳)

میرے مہربان، میری جان، مرزا الفتہ سخن دان!

تمہارا سکندر آباد اور میرے خط کا تمہارے پاس پہنچنا، تمہاری تحریر سے معلوم ہوا۔  
زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں شرکی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک  
مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ  
رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت اروح  
مجسم اور بہ اعتبار اخلاق آیتِ رحمت ہیں، خزانہ فیض کے تھویدار ہیں جو شخص  
دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اُس کے پٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی  
ہزار روپیہ سالِ نعلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ  
معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نول کشور کی عرضی پیش ہوئی خلاصہ  
عرضی کا سن لیا، واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا  
ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔

بھائی مصطفیٰ خاں صاحب بہ تقریبِ تہنیتِ مسندِ تشینی و شمولِ جشنِ آنے



دلے ہیں، اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع پانچ دسمبر کو خلعت کا  
آنا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء وقت چاشت نجات کا طالب غالب

(۱۱۴)

لو صاحب!

کچھڑی کھائی، دن بہلائے  
کپڑے پھاٹے گھر کو آئے

آٹھ جنوری ماہ و سالِ حال، دو شنبے کے دن غضبِ الہی کی طرح اپنے گھر  
پر نازل ہوا۔ تمہارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا، رام پور میں، میں نے پایا،  
جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔  
پانچ دن صدرِ اصدو صحت کے ہاں پڑا رہا۔ اکھنوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت  
کی۔

کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو  
اتار کر پھینک دو گے؟ ترک لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے  
پے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو، اسی  
صورت سے، بہر صورت گزرنے دو:

”تاب لائے ہی بنے گی غالب“

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس خط کی رسید کا طالب

غالب

جنوری ۱۸۶۶ء

(۱۱۵)

مرزا تفتہ صاحب !

پرسوں تمہارا دوسرا خط پہنچا۔ تم سے پردہ کیا ہے، ایک فتوح کا منشتر ہوں، اُس میں میں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کا قریب آ گیا ہے، اِنشاء اللہ خط میرا مع حصہ فتوح جلد پہنچے گا۔ پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس، ڈاک منشی کرناں، باآں کہ مجھ سے اُس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، مگر میں جب جیتا تھا، تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے، میں نے اُس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی اُن کو اطلاع لکھو۔

میں زندہ ہوں۔ اوپر کے لمبر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ بہ اعتبار ترک اصلاحِ نظم لکھا ہے؛ ورنہ زندہ ہوں، مردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرض دار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زلیت سے بیزار، مرگ کا امیدوار

۱۸۶۷ء

غالب

(۱۱۶)

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ ! کس ملعون نے یہ سببِ ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار میں نے تو بہ طریقِ قہرِ درویش بہ جانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جوڑو برے خاندن کے ساتھ مرنا بھڑنا اختیار کرتی ہے، میرا تمہارا ساتھ وہ معاملہ ہے۔

میاں!

تمہارے انتقالاتِ ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشتق سخن کر رہے ہو اور میں مشتق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ نہ بےست بسر کرنے کو کچھ کھوڑی سی راحت دے رہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اقرار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں بنی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیسے تو کیا! کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بے رنگی میں گزریاؤں۔ جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کاپتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں۔ لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سرب ہے۔ ہستی نہیں ہے، پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں؛ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے، اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا؟ قطعاتِ تاریخ اگرے کیوں کر بھیجوں؟ پھر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔

”خالقِ معنی“ بمعنی ”معنی آفریں“ صحیح اور مسلم اور جائز۔ لیکن جس طرح ”اللہ“ میں مثلاً دلام کو دلام کے قائم مقام قرار دیا ہے، ”الہ“ اور ”الہی“ میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیوں کر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا، اتفاق سلف شرط ہے۔ جب اور



کسی نے "الہی" میں دو الف نہیں مانے، تو ہم کیوں کر مانیں؟

"دویم" بروزن "جویم" غلط۔ "دوم" ہے، بغیر تختانی بالعرض تختانی بھی لکھیں، تو "دیم" پڑھیں گے، اگرچہ لکھیں گے "دویم"۔ واؤ کا اعلان نکال باہر ہے۔ ہاں "دومی" درست ہے مگر نہ بہ حذف تختانی مثل "رئی" نہ بہ حذف نون بلکہ بہ طریق قلب بعض "دویم" کا "دومی" ہو گیا۔ کمزیر کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخ وفات کا اور مادہ سوچو، کس واسطے کہ جب "الہی" میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والدعا۔

روز بروز نامہ بلکہ وقت و روزنامہ، بعد خواندن نوشتہ شد۔ یکشنبہ از غالب

صاحب!

واقعی "سدا" کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔ تمہارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا، اس واسطے کاٹ دیا۔ "قرب" کون سا لفظ غریب ہے جس کو اس طرح پوچھتے ہو؟ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ "قرب" اور "سدا" دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں۔

(۱۱۹)

حضرت!

اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں، کم ہے۔ کیا کیا شعر نطالے ہیں، لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک مزید پر سیب کا یا بھی کا درخت آگ جائے۔ خدا تم کو سلامت

رکھے۔ دکان بے رونق کے خریدار ہو۔

(۱۲۰)

مرزا قفّہ!

کیا کہنا ہے! نہ طہیر کا پتا نہ غالب کا۔ مداح شایستہ صد ہزار آفریں  
اور ممدوح سزاوار صد نفیریں۔

(۱۲۱)

میاں!

سنو، اس قیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے جیسے ہم  
تم اپنے اپنے مسائلِ دینی سے بلکہ ہم تم باوجود عدم واقفیت امور دین سے  
نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ آماہق کہاں،  
وہاں سے نکالے گئے، دلی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب سے آئے  
ہیں، ایک بار میرے پاس نہیں آئے، نہ میں اُن کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق  
بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے، چہ جائے اُن کو مدح کیجے۔ اے نور تہی:

اے دریغ! نیست ممدوح سزاوارِ مدیح

اے دریغ! نیست معشوتے سزاوارِ غزل

غالب

(۱۲۲)

دل بے واغدار بود و منان

در نظر باہیار بود و منان

اگر ”بود“ کے آگے کے واؤ کو موقوف اور محذوف کر دو گے تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائے گا۔

میری جان! جو خجالت کہ تجھ کو تم سے ہے، شاید بہ سبب عبادت نہ کرنے کے، قیامت میں خدا سے بھی نہ ہوگی اور بہ سبب خلافِ شرع کرنے کے پیہر سے بھی نہ ہوگی مگر خدا ہی جانتا ہے جو میرا حال ہے۔

مرگِ ناگاہ کا طالب غالب

(۱۲۳)

حضرت!

اس غزل میں ”پرزانہ“ و ”پیمانہ“ و ”بیت خانہ“ تین قافیے اصلی ہیں۔ ”دیوانہ“ چوں کہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشتخص ہو گیا ہے، اُس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجئے۔ باقی ”غلامانہ“ و ”مستانہ“ و ”مردانہ“ و ”ترکانہ“ و ”دلیرانہ“ و ”شکرانہ“؛ سب ناجائز و نامستحسن۔ ایٹا اور ایٹا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایٹا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ ”کاشانہ“ و ”شانہ“ و ”افسانہ“ و ”جانانہ“ و ”فرزانہ“ یہ قافیے کیوں ترک کیے، یاد رہے، ساری غزل میں ”مردانہ“ یا ”مستانہ“ یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہو گئی اور غزل لکھ کر بھیجو تا اصلاح دی جائے۔

عفو کا طالب غالب





# نواب علاء الدین احمد خاں علائی

(۱)

مرزا نسیمی کو دعا پہنچے۔ آنکھ کی گہا جنی جب خود پک کر پھوٹ گئی تھی اور پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ یہ طریق خوشامد طبیب سے رجوع کی۔ جب اُس نے نشتر تجویز کیا تو خواہی نہ خواہی امثال امر کرنا پڑا اور شاید یوں نہ ہو کچھ مادہ باقی ہو، یہ ہر حال حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شفا بخشتے :

## قطعہ

|                               |                           |
|-------------------------------|---------------------------|
| بسکہ فعال مایہ دید ہے آج      | بہر سلحشور انگلستان کا    |
| گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   | نہرہ ہوتا ہے آب انساں کا  |
| چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے     | گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا |
| شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک       | تشہ خوں ہے ہر مسلمان کا   |
| کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک    | آدمی واں نہ جاسکے یاں کا  |
| میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا | وہی رونا تن و دل و جاں کا |

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ      سوزشیں داغ ہائے پنہاں کا  
گاہ رو کر کہا کیے باہم      ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا  
اس طرح کے وصال سے یارب      کیا مٹے دل سے داغ ہجران کا

۱۸۵۸ء

(۲)

آج بدھ کے دن، ۲۷ رمضان کو، پہر دن چڑھے، جس وقت کہ میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا، داک کا ہرکارہ تمھارا خط اور شہاب الدین خاں کا خط معاً لایا۔ مضمون دونوں کا ایک۔ واہ کیا مضمون، ان دونوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں، ایک داغ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سُجَّانُ اللہ! میں نے اُس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔

میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں، لوگوں کے مادے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں، وہ بیشتر لہجہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ اپنے سبھائی کی رحلت کا مادہ ”دریغ دیوانہ“ نکالا۔ پھر اُس میں سے کہے ”کے عدد گھٹائے۔ تمام دو پہر اسی فکر میں رہا، یہ نہ سمجھنا کہ مادہ ڈھونڈھا۔ تمھارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں، بارے ایک قطعہ درست ہوا، مگر تمھاری زبان سے، یعنی گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر میں تین شعر زائد، دو موضح مدعا، لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیم اچھا ہے یا بُرا ہے۔ ہاں، اِغلاق تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوحِ مزار پر کھدوانے کے قابل نہ ہو:

قطعہ

در گریہ اگر دعویٰ ہم چشمیٰ نہ کرد  
بینی کہ شود ابر بہاری فجل از ما



ناچار بگرییم شب و روز کہ این سبیل  
 باشد کہ برد کا لبہ آب و گل از ما  
 گفتی کہ نگہدار دل از کشمکشِ غم  
 خود کرد بر آورد غمِ جاں گس از ما  
 یحییٰ شد و از شعلہٗ سوز غم ہجرش  
 چون شمع دود دود بسر متصل از ما  
 غم دیدہ "نسیمی" پے تاریخِ وفاتش  
 بنوشت کہ در داغِ لپسِ سوختِ دل از ما

"ما" کے عدد "۴۱"، "دل" کے عدد "۳۴"۔ "ما" میں سے "دل" گیا۔ گویا "۴۱" میں سے "۳۴" گئے۔ باقی رہے سات، وہ "داغِ لپس" پر بڑھائے، ۲۷، ۲۸ ہاتھ آئے۔

بدھ ۱۱ مئی ۱۸۵۸ء

۲۷ رمضان ۱۲۷۴ھ

(۳)

خاکِ نمن کم و تو بادِ بہار  
 نہ توانی مرا زجا بردار  
 ہاں، نسیمی، زمین چہ می خواہی  
 زحمتِ خویشین چہ می خواہی

خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی، تو مبارک، اور میں نے تمہیں تہنیت دی، تو مناسبت۔ **بِاللّٰهِ الْحَمْدُ، بِاللّٰهِ الشُّکْرُ**۔ بھائی سچ تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر بیزنگ بھیجوں تو کھار ماندہ، اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھڑ تک جلے کون؟ اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے

کہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل ہونہیں سکتا۔ انھوں نے بھی یہ شرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا، چل دیا:

تادرمیانہ خواستہ کردگارِ حسیّت

دوشنبہ ۱۳ محرم ۱۲۷۵ھ

مطابق ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

غالب

(۴)

سبحان اللہ ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور کچھ لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو۔ یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ "دسائیر" اور "برہان قاطع" کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازاں جملہ "برہان قاطع" تم کو دے چکا ہوں۔ "دسائیر" میرا ایمان و حریرِ جان ہے۔ اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح، نہزل و ہجو میرا آئین نہیں، پھر کہو، کیا لکھو؟ بوڑھے پہوان کے سے پیچ بتاتے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں، یاد رکھنا اور مطابق واقع سمجھنا۔ تمھارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمھارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمھارے پاس بھی پہنچ جائے گا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسمِ دراہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کب گناہ ہو

مرقومہ روز دوشنبہ ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

صاحب!

میری داستان سنئے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتہد سہ سالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ازاں حقوق چار سو روپیہ دینے باقی رہے اور ستاسی روپیہ گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینا بہ دستور ملا۔ آخر جون میں حکم آگیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں، ماہ بہ ماہ پنشن تقسیم نہ ہوا کرے۔

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمد گرا سی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو، نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں، نہ ملا۔ تمھاری چھوٹی چھوٹی نے بے کس نوازی کی۔ کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایتِ مرعی نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پاؤں زمین پر ہے، ایک پاؤں رکاب میں۔ ٹوٹے کا وہ حال۔ گوشے کی یہ صورت۔

کل شنبہ، اٹھارہ ذی الحجہ کی اور سات جولائی کی، پہر دن چڑھے تمھارا خط پہنچا۔ دو گھنٹی کے بعد سنا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوکھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے ان کو دہلاؤ افسردہ پایا، دل کڑھا۔ علی حسین خاں بھی آیا، اُس سے بھی میں ملا۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اُس کو چاہتے تھے، ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بہ ظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں



کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

زکات و رواں داشتہ یک شنبہ بین الظہر والعصر

۸ جولائی ۱۸۶۰ء

راقم غالب

۱۹ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ

(۶)

مولانا نسیمی کیوں خفا ہوتے ہو۔ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر خلیفہ اول ہے، تم خلیفہ ثانی ہو۔ اُس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے، جانشین دو لون مگر ایک اول ہے اور ایک ثانی ہے۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسن طبع خدا داد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پر غم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دو؟ علماء الدین خاں تیری جان کی قسم میں نے پہلے رٹکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکانہ جیا۔ مجھ کو اس دہم نے گھیر لیا ہے کہ میری نحوست طابع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے مستعمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب دوہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلا رکھے اور عمرو دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امر کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور مستحق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اُس سے قطع نظر نہ کرو

اور اُس مسخرے کو گناہ و ذلیل نہ سمجھو تو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں، ہزار باخط اطراف و جوانب سے آتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں نکھتے، بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام نکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام، یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور ستھان نہ نکھا جائے، ہر کارہ میرا تیا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی نکھ کر میرا نام نکھ دیا کیجئے، خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

پنجشنبہ ۴ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

(۷)

میری جان!

تخلص تمہارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔ "پشٹی" کو یہ تکلف اس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ؟ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی "خ" کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بہ تقدیم موحده علی النون لکھو۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ "رہرو" ایک اچھا تخلص ہے، "رہرو" اُس کی تجنیس موجود ہے۔ "شیون" ایک اچھا تخلص ہے، "ستون" اُس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے یہ مناسبت اسم "عالی" تخلص خوب تھا مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں "نامی" "سامی" یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا فائق کی پیروی کرو، مولانا "لائق" کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس ترکیب سے لفظ "نالائق" پیدا ہوتا ہے، مولانا "شائق" بن جاؤ۔ سنہی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجب سنو، "نیمی" تخلص "خماسی" بردزن ظہوری و نظیری اچھا ہے، اگر بدلنا ہی منظور ہے تو "نامی" "سامی" "رہرو" "شیون" یہ چار تخلص رباعی بردزن عرفی و غالب اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو، میرے نزدیک سب سے بہتر تمہارے

واسطے خاص "فخری" تخلص ہے، کہو گے کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آم کا نام "فخری" ہے، حاصل کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے، وہ آج لکھ بھیجتا ہوں، سبھائی "موبد" تخلص نیا ہے اگر یہ پسند آئے تو یہ رکھو۔ والد دعا۔

صبح یکشنبہ ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء

نجات کا طالب غالب

(۸)

میری جان، علانیہ سہہ دان!

اس دفعہ دخل مقدر کا کیا کہنا ہے! "فرہنگ لغات دساتیر" تمھارے پاس ہے، میں چاہتا تھا کہ اُس کی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے "دساتیر" مجھ سے مانگی۔ اُسی صحیفہ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر "دساتیر" نہیں تو فرہنگ کی خواہش کیوں ہے؟ حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں، اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اُس فرہنگ کی نقل بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے۔ "دساتیر" میرے پاس ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اُس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب، اگر "دساتیر" ہوتی اور میں بھیج دیتا تو البتہ سبھائی صاحب کا مشکور ہوتا، دین و دنیا میں کیوں ماحور ہوتا؟ ارسال اہدا پر حصول اجر کیوں مترتب ہو گیا؟ سبھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اُس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان و شیوع کا ہوتا تو عند اللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ:

غالب

دولت بہ غلط نبور از سعی پشیمان شو

کافر نہ توانی شد، ناچار مسلمان شو

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بہ

چوں ندیدند حقیقت، رو افسانہ زدند

حافظ



مولانا  
مذہب عاشق ز مذہب ہا جداست  
عاشقان را مذہب و ملت خداست

رات کو خوب مینہ برس رہا ہے، صبح کو تھم گیا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، ابر تنک چھا رہا ہے۔

یقین ہے کہ تمھاری جدہ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانہ لوہارو ہوں، کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعید رازی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سیر راہ ہے، وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔

بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں۔؟  
حضرت ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔

مرقومہ شنبہ یکم جون وقت صبح چھ بجے سات کے عمل میں ۱۸۶۱ء  
غالب (۹)

جان غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عم نامدار سے شنبہ ہے کہ "لغاتِ دساتیر" کی فرسنگ وہاں ہے، اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے، خیر:

آنچہ مادر کار داریم، اکثرے درکار نیست

تم فخر نویس ہو اُس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اُس نہال کا رہا ہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے۔ رہی دید وادید اُس کی رو صورتیں، تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود

کہتا ہوں کہ میرا عذر نہ ہمارا مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔  
سنو عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گیل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ  
ایک ہے جو خود فرماتا ہے لَعِنَ الْمُلُکُ الْیَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتے ہیں اَللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ  
ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گیل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن  
یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں  
رجب ۱۲۱۲ھ میں رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حالات میں رہا۔

۲۲۵ھ رجب کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیٹری میرے پاؤں میں  
ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نشر کو  
مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگائیں برس بلاد شرقیہ میں پھرتا  
رہا۔ پایاں کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ  
قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھادیں۔ پاؤں بیٹری سے فکار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے  
زخم دار، مشقت مفری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سال  
گذشتہ بیٹری کو زائے زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ ایرٹھ، مراد آباد ہوتا  
ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا  
بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف  
سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۴۹ھ میں چھوٹ جاؤں۔ یہ ہر تقدیر، بعد رہائی کے تو  
آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا  
جاؤں گا:

فرخ آنروز کہ از خانہ زنداں بروم

سوے شہر خود ازین داری ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں دو اردو غزلیں اپنے

حافظے کی تحویل میں نے بھیجتا ہوں سبھائی صاحب کی نذر:

### غزل

از جسم بہ جاں نقاب تا کے  
 ایں گنج دریں خراب تا کے  
 ایں گوہر پُر فروغ، یارب  
 آلودہ خاک و آب تا کے  
 ایں راہِ رسالک قدس  
 و اماندہ خورد و خواب تا کے  
 بتیابی برقِ جز دے نیست  
 ما و یں ہمہ اضطراب تا کے  
 جان در طلبِ نجات تا چند  
 دل در تعبِ عتاب تا کے  
 پرستش زِ توبے حساب باید  
 غم ہائے مرا حساب تا کے  
 غالب بہ چنین کشاکش اندر  
 یا حضرت بو تراب تا کے

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روے تو بود  
 چشم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود  
 آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب  
 نفسم پردہ کشائے اثرِ خوے تو بود



چه عجب صانع اگر نقشِ دیانت گم کرد  
 کو! خود از حیرتِ یانِ رخِ نیکوے تو بود  
 یہ کفِ بادِ مہادِ ایں ہمہ رسوائیِ دل  
 کا خرازِ پردِ گیانِ شکنِ موسے تو بود  
 مردن و جان یہ تمنائے شہادتِ دادن  
 ہم نہ اندیشہٴ آرزوینِ بازوے تو بود  
 دوست دارم گر ہے را کہ بکارم زدہ اند  
 کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود  
 مالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پس مرگ  
 تا چہا در دل غالب ہوسِ روے تو بود

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور  
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور  
 لوگوں کو ہے ٹھٹھیر جہاں تاب کا دھوکا  
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور  
 ہے خونِ جگرِ جوش میں، دل کھول کے روتا  
 ہوتے جو کئی دیدہٴ خندانہٴ فناں اور  
 یا رب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات  
 دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور  
 تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے  
 لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

مرتاز ہوں اس آواز پہ ہر چند سراڑ جائے  
جلاد کو لیکن وہ کہے حبائیں کہ ہاں اور  
ہیں اور بھی دُنیا میں سخن و رہت اچھے  
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے  
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے  
صند کی ہے اور بات، مگر خوبروی نہیں  
مجھو لے سے اُس نے سنکڑوں وعدوں کیے  
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو  
دینے لگا ہے بول سے بغیر التجا کیے  
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ میں مے  
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے  
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو  
کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کیے  
غالب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا  
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ  
جون ۱۸۶۱ء

### علائی مولائی !

اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھا۔ واہ کیا کہنا ہے، رام پور کے علاقے کو گاؤں شنگ اور مجھ کو بیل یا اس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ اور وہ پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مراحم کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے ج طریق وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعا ہے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاؤں کیڑوں کے واسطے کرایہ کروں، کیڑوں کے صندوق میں ادھی درجن شراب دھڑوں، آٹھ کھار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو نفاذ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظہ لوہارو بھجوا کرے گا۔ گاؤں ہو سکتی ہے شراب مل سکتی ہے، کھار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو، باہر کے مکان میں سے محل سرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستان کی گھڑی بھر میں دم کھڑتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے۔ والی رام پور نے بھی تو مرشد زادے کی شادی میں بایا تھا۔ یہی بکھا گیا کہ میں اب مسدوم محض ہوں، تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

سجائی کے اور تمہارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے پر کیا کروں، عقرب دقوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا، کاشش لوہارو کی جگہ گوڑ گاؤں ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کی نزدیکی ہے، وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط و انحطال روز افزوں نہ تم یہاں آ سکتے ہو نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر حملہ چل گیا بہتر، ورنہ:

اے واسے زخمی دیدار دگر، بیچ



منہ لکھا الی اللہ

حاجہ الیٰ ہستی ہے کیونکہ الگ میں گر پڑوں مہینا ڈیرہ مہینا اور پیکر ہو ڈروں  
 بہتہ رہ آبان و آذر میں بشرط عبت قصہ و نگار بہ چند ورق پوسفہ مرا  
 نے از در و پیا آرم اخبار کا ترے لکھوار کہرتی اور میر پاس پسر ہوتی تھی  
 شاق کو دیتی تار وہ کسے آدمی کے ہاتھ کو بھیج دے اور تم میر طرف سے میر بھائی  
 اور انبی والد ماجد کو کہ جو تھا کہ دیکھا کہ بیٹا تو کئے سنت کے دل لگا کو لکھا  
 مکتفی ہو جائیگی یہ سطر میر جو اب میں میں تمہارا خط لکھ کر جو آج اس وقت ڈاک  
 سے میں نے پایا ہے نیم روزہ شنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۷۱ مطابق بہ ستمبر ۱۸۶۱ء

(من الغالب الى العلائی)  
صاحب!

آگ برستی ہے، کیوں کر آگ میں گر پڑوں؟ مہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو، دے دہن بہت دور ہے۔ آبان و آذر میں بہ شرطِ حیات قصدِ کردل گنا۔

یہ چند ورق یوسف مرزا نے از روئے ”دلی اردو اخبار“ کاتب سے لکھوار رکھے تھے اور میرے پاس پڑے ہوئے تھے۔ کاتب کو دیے تاکہ وہ کسی آدمی کے ہاتھ تم کو بھیج دے اور تم میری طرف سے میرے بھائی اور اپنے والد ماجد کو دو۔ جب اٹھا کر دیکھا کریں گے تو کئی منٹ کی دل لگی کو یہ اشعار مکتفی ہو جائیں گے۔ یہ سطرین جواب ہیں میں تمہارے اس خط کے، کہ جو آج اس وقت ڈاک سے میں نے پایا ہے۔

نیم روز و شنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء

(۱۲)

میری جان!

کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی، پانی ٹھنڈا ہو گیا، فصل اچھی ہو گئی، اناج بہت پیدا ہو گیا۔ تو قیامِ جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا، خرقہ پایا۔ سجد و سجادہ کا یہاں پتا نہیں ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا، اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی، استادِ میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا گناز نومبر میں تیر رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر، آبان ماہ و آذر ماہ سے کیا غرض:

بے تیر و دے ماہ و اُردی بہشت

برآید کہ، خاکِ ہاشیم و خشت

استادِ میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اُن کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں

چھوٹے ہیں دعا، اور اس رُوسے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کم و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں درود اور موافق مضمون اس مصرع کے :

”سوے اللہ واللہ مافی الوجود“۔ سجد

حضرت، وہ ”شرف نامہ“ نہیں ہے، کسی احمق نے ”شرف نامہ“ میں سے کچھ لغات، اکثر غلط، کم تر صحیح، چُن کر جمع کیے ہیں۔ نہ دیا چہ ہے کہ اُس سے جامع کا حال معلوم ہو نہ خاتمہ ہے کہ عہد و عصر کا حال کھلے بائیں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آجائیں گے تو اُن سے کہہ دوں گا۔ اگر وہ لا دیں گے تو ان کو قیمت دے کر علانی مولائی کو بھیج دوں گا۔

خستی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب، جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اُس کا کچھ خیال بھی آتا ہو، خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو، سمجھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اُس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چبے لگتا ہوں۔

نجات کا طالب۔ غالب

سہ شنبہ ۱۵ ماہ اکتوبر ۱۸۶۱ء

(۱۳)

آج جس وقت کہ میں روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا، شہاب الدین خاں تمھارا خط اور مصری کی ٹھیلیاں کرائے، میں اُس کو واکر گھر گیا۔ اپنے سامنے مصری تلوائی، آدھا پاؤں پر دو سیرنگلی، خانہ دولت آباد۔ یہی کافی و دافی ہے اور اب حاجت نہیں۔ روٹی کھا کر بہر آیا تمھارے ابن عم کا آدمی جواب خط کا متقاضی ہوا کہ شتر سوار جانے والا ہے۔ میں کھانا کھ کر لیٹنے کا عادی ہوں لیٹے لیٹے مصری کی رسید لکھ دی۔ مطالبہ مندرجہ خط کا جواب بہ شرط حیات کل بھیجوں گا۔

غالب

چاشتگاہ سہ شنبہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ



(۱۴)

مرزا اعلیٰ !

پہلے اُسٹا د میر جان ص، حب کے تہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ تاکہ میرے حواس جو  
منتشر ہو گئے ہیں، جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے قصور کا مورد نہیں جانتا۔ جھگڑا  
اُن کی طرف سے ہے تم اُس کو یوں چکاؤ، یعنی اگر اُن کو صرف آشنائی و ملاقات منظور ہے تو  
وہ میرے دوست ہیں، شفیق ہیں، میرا سلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت و رشتہ داری ملحوظ ہے  
تو وہ میرے بھائی ہیں مگر عمر میں چھوٹے، میری دعا قبول فرمائیں۔

صاحبین کی رائے کا اختلاف مشہور ہے، مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ہر ایک  
قول جدا جدا لکھوں۔ آج نہ لکھا نہ سہی، دو چار دن کے بعد لکھوں گا۔ تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ  
صاحبین مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ ہیں۔

بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھ کو منظور اور یہ غزل معروض ہے۔ میری طرف سے سلام کہو:

از من غزلے گیر وہ فرمائے کہ مطرب

در نے و مدار روئے نوازش دوسہ دم را

غزل

جز دفع غم ز بادہ نہ بوزہ است کام ما

گوئی چراغ روز سیاہست جام ما

در خلوتش گزر نہ بود بادرا مگر

صرصر بہ خاک راہ رساند پیام ما

اے باد صبح غطرے ازاں پیرہن بیار

تسکین ز بوسے گل بد پذیرد مشام ما

ہر بار دانہ ہر ہما انگنیم و مور

آید بدام و دانہ ر باید تروا ہم ما

گفتی، چو حالِ دل رشتنود، مہرباں شود  
 مشکل کہ پیشِ دوست توان برد نام ما  
 زما بہ ما پیام و ہم از ما بہ ما سلام  
 رنجِ دلی مباد پیام و سلام ما  
 مقصود ما ز دہر ہر آئینہ نیستی ست  
 یارب کہ ہچ دوست مباد اہلکام ما  
 غالب بقولِ حضرتِ حافظ ز فیضِ عشق  
 ثبت است بر جریدہٴ عالم دوام ما

جنوری، فروری ۱۸۶۲ء

(۱۵)

صاحب!

صبح جمعے کو میں نے تم کو خط لکھا، اُسی وقت بھیج دیا۔

پہر دن چڑھے سنا کہ شب کو پھر دورہ ہوا، گیا۔ خود اُن سے حال پوچھا۔ علی محمد بیگ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ یہ نسبت دورہ ہاے سابق خفیف تھا اور افاقہ جلد ہو گیا۔ کل مرزا شمشاد علی بیگ ناقلِ تھے کہ مجھ سے علی حسین خاں کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ دوہرو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں، مگر پیٹ بھر کے۔ غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک سے سلوک منظور نہیں، تنہا ہوا سے شمشاد در سراسر است!

رموزِ مملکتِ خولیش خسرواں دانند  
 گدائے گوشہ نشینی، تو حفا محروسش

غالب

یکشنبہ ۹ فروری ۱۸۶۲ء

(۱۶)

نیرا صغر سپہر سخن سرائی، مولانا علانی کے خاطر نشان و دل نشیں ہو کہ آج صبح کو پانچ یا چھ گھنٹی دن چڑھے، دونوں بھائی صاحب تشریف لائے، میں گیا اور ملا۔ علی حسین خاں کو بھی دیکھا، تھوڑی دیر کے بعد بھائی صاحب والدہ صاحبہ کے پاس گئے۔ میں گھر آیا، کھانا کھایا۔ دوپہر کو تمھارا خط پایا۔ دو گھنٹی لوٹ پوٹ کر جواب لکھا اور ڈاک میں بھجوا دیا۔ یہ مرض جو بھائی کو ہے، اس راہ سے کہ ضدِ صحت ہے، مکروہِ طبع ہے ورنہ ہرگز موجبِ خوف و خطر نہیں۔ میں تو بھول گیا تھا اب بھائی کے بیان سے یاد آ گیا کہ بارہ تیرہ برس پہلے ایک دن ناگاہ یہ حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ موسمِ جوانی کا تھا اور حضرت عادی بہ فیون نہ تھے۔ تنقیہ بہ قے فوراً اور بہ اسہال بعد چند روز عمل میں آیا۔ اب سنِ کہولت، استعمالِ فیون مزید علیہ، دورہ جلد متواتر ہوا۔ اضطرابِ ازراہِ محبت ہے، از روئے حکمت اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔ نظری میں یکتا حکیم امام الدین خاں وہ ٹونک۔ عملی میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں، وہ کرولی رہے۔ حکیم محمود خاں وہ ہسائیہ دیوار بہ دیوار، حکیم غلام نجف خاں، وہ دوستِ قدیم، صادق الاولیاء، حکیم بقا کے خاندان میں دو صاحبِ موجود، تیسرے حکیم منجھلے، وہ بھی شریک ہو جائیں گے۔ اب آپ فرمائیے، حکیم کون ہے؟ ہاں دو ایک ڈاکٹر، بہ اعتبارِ قومی حکام نامور، یا کوئی ایک آدھ بید، حوٰی منزوی اور گندم۔ بہ ہر حال، خاطر جمع رکھو، خدا کے فضل پر نظر رکھو۔ سُبْحَانَ اللہ! تم مجھ سے سپارش کرو امین الدین خاں کی، کیا میرے پہلو میں دل بامیرے دل میں ایمان، جس کو محبت بھی کہتے ہیں، بہ قدر پریشہ و سرور بھی نہیں؟ معالجہ حکما کی راہ پر رہے گا۔ ندیمی اور غم خواری میں اگر قصور کروں، تو گناہگار۔ میاں ایسے موقع میں رائے اطباء میں خلافِ کم واقع ہوتا ہے۔ مرضِ مشخص، دوا معین۔ سوء مزاج ساذج نہیں، مادی ہے اور مادہ بارد ہے۔ کوئی طبیب سوائے تنقییہ کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقییہ میں سوائے محرجاتِ بدہنم اور کچھ تجویز نہ کرے گا۔ تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیہِ خاص



ہوا اور ایارج کا مسہل دیا جائے۔ اسماء و آیات شفا بخش مقرر ہیں۔ ردِ سحر و دفعِ بلا ان کے ذریعے سے متصور ہے۔ لیکن ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے تہ توڑ دی ہے کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں۔ تمھارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا بے چارہ، لگ ایک ایسے گوشے میں رہتا ہے کہ جب تک خاص دہاں کا قصد نہ کرے، کبھی کوئی دہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث، دہاں خیزت و مساکین سے طلبِ دعا اور اہل اللہ سے استمداد۔ شہر میں مساکین شمار سے باہر، اہل اللہ میں ایک حافظ عبد العزیز۔ مابہ خیر، شتاب سلامت۔

وقت نماز ظہر شنبہ ۱۵ شعبان ۱۲۴۸ھ

۱۵ فروری ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب۔ غائب

دن اور تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں

(۱۷)

صاحب!

کل تمھارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور میاں شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے، سو اس کے موافق حبوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آکر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے گا مگر انداز و اداسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور ان کے ہوا خواہوں کی رے میں قصد اس استعرج کا مذہب ہے۔ نسخے کی حقیقت کو میزانِ نظر میں تول رہے ہیں۔ استاذ میر جان بھی تھے، نیم ن معقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح خیریت ہے۔

کل تمھارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں

ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکبادن برس سے مقیم ہوں، ایک کنپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکر جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ اثاث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امراے اسلام میں سے اثاث گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیہ روز کا پسند دار، سو روپیہ پیسے روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میرزا صراہدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا۔ بیمار پڑا، نہ دوا نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجھیزہ تکفین ہوئی۔ احب کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اُس کے پاس ایک پیسا نہیں، بچے کی آمد نہیں، مکان اگر چہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے، چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر، نوشتن جان کر کے، یہ ایک بیٹی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایے کی املاک و اگذاشت ہو کر پھر فرق ہو گئی، تباہ خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے، قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تیس لاکھ روپیہ کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیانِ واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اُس کو بھی سچ جانو۔

اپنے والد، جد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر آسب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمالِ ایارحات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ ہنگام نیم روز یکشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء عافیت کا طالب۔ غالب

جسوب میں مکترب دوائیں نکھیں۔ بہت لمبے چین رہے آٹھ دس دست آئے۔ آخر روز مزاج بحال ہو گیا تنقیہ اچھا ہوا۔ اب یہ فضل الہی اچھے ہیں اور یقین ہے کہ مرض عود نہ کرے۔ دلی کی قلعہ کدت اپنے والد کی رائے پر رہنے دو۔ بہ قدر مناسب، وقت عزم خیر خواہ نہ کچھ کہوں گا ضرور، لیکن نہ برابر ام میں تم سے زیادہ اُن کا مزاج داں ہوں۔ یہ خود پسند اور معہذا سپارش کا دشمن ہے۔ منل بچوں کے مقدمے کو طبیعت اسکان پر چھوڑ دو۔ میں دخل نہ کروں گا۔ ہاں اگر خود مجھ سے پوچھیں گے یا میرے سامنے ذکر آجائے گا تو میں اچھی کہوں گا:

بریدہ باد زبانی کہ ناسرا گوید

برانہ ماننا۔ اگر یہ دونوں بھائی یا ان میں سے ایک رفیق ہو گیا، یوں تمام عمر خوشی گزر جائے، لیکن تم کے برس، کے مہینے، کے ہفتے کا گریمنٹ لکھتے ہو۔

صبح شنب یکم مارچ ۱۸۶۲ء

غائب

(۱۹)

صاحب!

میرا برادر عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ از روئے عقل اعادہ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا دہم، اس کی دو القمان کے پاس بھی نہیں۔

مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھو گے، میری طرف سے جواب وہی ہوگا، جو آگے لکھ چکا ہوں، یعنی میں تماشاائی محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو بھلی کہوں گا۔

آپ کے عزم عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غائب کو بیٹھے ہوئے ہزار ہا تسویات و خیالات دکھائی دیتے ہیں یہ حضرت نے اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھے ہیں کہ جس طرح میں مبتلا ہوں و ساوس وادہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخارات مراقبی میں گرفتار ہوں گے۔ قیاس مع الفارق ہے نہ تجنیں صادق۔ یہاں لا مؤجود



إِلَّا اللّٰه کے بادۂ ناب کا رطلِ گراں چڑھاتے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹاتے ہوئے بیٹھے ہیں :

کجا غیر و کو غیر و کو نقشِ غیر

سوائے اللہ، واللہ، ما فی الوجود

”ضمیران“ بروزن ”ڈرگران“ لغتِ عربی ہے نہ معرب۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پھول ہندوستان میں ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کی تحقیقات از روئے الفاظِ الادویہ ممکن ہے۔ ”آج اُس نے جلابِ بیا، دس دست آئے، موادِ خوب اخراج ہوا۔ فارسی غیر فصیح۔“ امروزہ فلا نے سہل گرفت، وہ دست آمدند، موادِ خوب برآمد۔ ”فارسی فصیح“ امروزہ فلا نے پگاہ داروے سہل آشامید۔ تا شام وہ بار نشست یا وہ بار بہ مستراح رفت

یادہ بار بہ بیت الخلاء رفت۔ مادۂ قاسد چنانکہ باید، اخراج یافت۔ معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطق میں خصوصاً اور اہلِ پارس کے روزمرہ میں عموماً ”نشستن“

استعارہ ہے ”ریدن“ کا، چنانچہ ایک تذکرے میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شرابی دعوت اپنے باغ میں کی۔ مرزا صائب اور اُس عصر کے کئی شعراء جمع ہوئے۔ ایک شاعر کہ تذکرے میں اُس کا نام مندرج ہے اور میں بھول گیا ہوں۔ اکول تھا مگر معدہ اُس کا ضعیف تھا، حرص و شہرہ کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا۔ مہضم نہ کر سکتا تھا۔ کھانا کھا کھا کر، شراب پی پی کر، دروازہ باغ کا مقفل کر کے سب سو رہے۔ اس مردِ اکولِ فضول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا۔ نہ ایک جگہ بلکہ کبھی اُس کیاری میں، کبھی اُس روش پر، کبھی اُس درخت کے تلے، کبھی اُس دیوار کی جڑ میں۔ قصۂ مختصر نایت شرم و حیا سے دوچار گھڑی رات رہے، دیوار سے کود کر چلا گیا۔ صبح کو جب سب جاگے، اُس کو ادھر ادھر ڈھونڈا، کہیں نہ پایا۔ مگر حضرت کا فضاہ کئی جگہ نظر آیا۔ مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا: ”یاراں شمار چہ افتادہ است کہ مے گوئید، فلا نے در باغ نیست، می بیغم کہ مخدوم ہم دریں باغ چند جانشین است۔“

رہائی خط میں لکھنا بھول گیا۔ یہ میں نے بھائی کو ہنیت میں بھیجی تھی :  
 اے کردہ بہ ہرزہ نشانی تسلیم  
 پیدا نہ کلاہ تو شکوہ و سہیم  
 بادا بتو فرخندہ، نہ سزدانِ کریم  
 پر واتیگی جدمب اقطاع قدیم

(۲۰)

یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علانی !

خدا کی دہائی نہ میں ویسا ہوں گا، جیسا تیر سمجھا ہے اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفغانی اور خیال  
 تراش میں ویسا ہوں گا جیسا مرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے،  
 اے کاش کے ہر آنچہ، ستم، داند

دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھی  
 غنوں کا، جس سے تمہارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیر دار میں نہ تھا کہ ایک جاگیر دار مجھ  
 کو بُلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا، دو جانے جا کر شادی کماؤں اور پھر  
 اُس فصل میں کہ دنیا کڑوا کر ہو۔ دوبارہ بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اُس موسم میں کہ جاڑے  
 کی گرمی بازار ہو۔

کل استاد میر جان صاحب نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے اُن کو جانے نہ  
 جانے میں مترق و پایا ہے، جائیں نہ جائیں۔ میں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا  
 رہوں گا۔ غلام حسن خاں اگر کسی وقت آجائیں گے تو اُن کو تمہاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشان  
 کروں گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو  
 طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دلی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو شک ہے  
 جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً در رئیس فرخ آباد خصوصاً کہ جہان سے اتنا کر مرزین عرب میں

چھوڑ دیا۔ ابا بابا :

پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو، بیمار دار  
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان "کاچھاپا  
تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آگئی۔ وہ تمھارے عم نامدار کی نذر ہوئی۔  
باقی جلدیں جن کا میں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے، جب تک  
قیمت نہ بھیج دوں، کیوں کر آئیں؟ روپیے کی تدبیر میں ہوں اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔  
تمھارے پاس جو "قاطع برہان" پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد  
ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پوچھ لو اور اگر قلمی ہے تو درجہ  
اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔  
آج یوم النہیس ۱۹ جون المبارک، بارہ پرتمین بجے تمھارا خط آیا۔ ادھر پڑھا ادھر  
جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی آئے۔ تمھارا خط اُن  
کو دیا۔ وہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم لکھ رہے ہیں۔ ابر آیا ہوا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔

یوم النہیس ۱۹ جون ۱۳۶۲ھ

(۲۱)

جان غائب خط تمھارا سوا تر پہنچ مغرب غرابین سے ہے بشیر کا کلام  
میں مضامین حقیقت آئیں ہیں یکن دربان گلہ دار دو گریبان گلہ دار اس میں  
میں اوکے غزل میں نے نہیں دیکھی جگر محمد شاہ سے کہ غزل میں زمین میں ہے  
در بزم وصال تو ہنگام تماشائے روز جبینہ ترکان گلہ دار یہ ایک شعر کا کلام  
یاد آجی رہا تمھارا باب گمان ہے میں بلکہ زنجیر تھمتا میرا سدا کہو اور یہ شعر مبارزہ  
ست نوب گمان زیستہ بو بر منتہ بدو بدلتہ مرگ لی ہر روز گمان تو  
مجھ کا فرد و کفن کے فکر پر رہا ہے وہ سنگ مرمر و سخن کا لب۔ جی زخم ہوتا تو وہ  
کین زخم جلد آتا مجھ پر یہ تکلیف آتھو تو اور تم سے زمین میں جند شو کہہ کر صبح





نکتہ چیں جو غم دل او کو سنائی نہ بنی کیا بنی بات چٹا بات بنائی نہ بنی

کون تو جہنم کی آگ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ جہنم کی آگ تو جہنم کی آگ ہے  
 کون تو جہنم کی آگ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ جہنم کی آگ تو جہنم کی آگ ہے  
 کون تو جہنم کی آگ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ جہنم کی آگ تو جہنم کی آگ ہے  
 کون تو جہنم کی آگ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ جہنم کی آگ تو جہنم کی آگ ہے

مشق پر زور نہیں چو یہ آتش غار در لگائی نہ لگی اور بجھائی نہ بنی

لونا رو صبح روز آدینہ اجوڑ

بیرب

بطلانہ مباہجہ برادر سعادہ واقبات شاعرانہ دینہ بہادر سعادہ

حکمتا نہ نہ

مفنع باد



( اصل نفاذ کی عکسی تحریر جس میں یہ خط ملفوف کر کے بھیجا گیا )

جان غالب !

دو خط تمہارے متواتر پہنچے۔ مغربی عرفا میں سے ہے۔ بیشتر اُس کے کلام میں مضامین  
 حقیقت آگئیں ہیں، لیکن "داماں گلہ دارد" و "گریباں گلہ دارد" اس زمین میں، اُس کی غزل میں  
 نے نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے :

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ ایک شعر اُس کا مجھے یاد ہے۔

بھائی! تمہارا باپ بدگمان ہے، یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر میرا

پڑھ سناؤ :

گمانِ زلیست بود بر منتِ نہ بے دردی

بداست مرگ وے بدتر از گمانِ تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے، وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا تو وہیں  
کیوں نہ چلا آتا؟ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھوالو اور تم اس زمین میں چند شعر کہ کر بھیج دو۔ میں  
اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصاے پیر بجائے پیر۔ واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے  
پاس نہیں ہے۔ آگے جو کچھ حافظے میں موجود تھا، وہ لکھ بھیجا۔ اب جو کچھ یاد آگیا وہ لکھتا ہوں:

بامن کہ عاشقِ سخن از رنگ و نام چسیت

در امرِ خاصِ حجتِ دستورِ عام چسیت

مستم ز خونِ دل کہ دو چشمِ ازاں پُر است

گوئی مخور شراب و نہ بینی بجامِ چسیت

بادوست ہر کہ بادہ بخلوتِ خور و مدام

واند کہ تھور و کوثر و دارالسلام چسیت

ما خستہ غمیم و بودے دواے ما

با خستگاں حدیثِ حلال و حرام چسیت

از کاسہ کرام نصیب ست خاک را

تا از فلک نصیبہ کاسِ کرام چسیت

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت

پرسد چرا کہ نرخِ مے لعلِ فام چسیت

سات شعر نہ یاد آتے، چھ یاد آگئے، خیر، گانے کو یہ بھی کافی و مکفی ہیں:

دل برد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت

بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت



در رز مگہش تا جح و نخبہ نتواں برد  
 در رز مگہش بادہ و ساغر نتواں گفت  
 رخشندگی ساعد و گردن نتواں جست  
 زیندگی یارہ و پرگر نتواں گفت  
 پیوستہ دہر بادہ و ساقی نتواں خواند  
 ہموارہ تر اشدیت و آذر نتواں گفت  
 در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوئیم  
 باما سخن از طوبی و کوثر نتواں گفت  
 ہنگامہ سرآمد، چہ زنی دم ز نظر لم  
 گر خود سستی رفت بہ محشر نتواں گفت  
 آل راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظاست  
 بردار نتواں گفت و بہ منبر نتواں گفت  
 کارے عجب افتاد بدیں شیفۃ مارا  
 مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

یارہ کرارہ  
پیرگر

|                               |                            |
|-------------------------------|----------------------------|
| کوئی امید بر نہیں آتی         | کوئی صورت نظر نہیں آتی     |
| آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی    | اب کسی بات پر نہیں آتی     |
| موت کا ایک دن معین ہے         | نیند کیوں رات بھر نہیں آتی |
| داغ دل گر نظر نہیں آتا        | تو بھی اے چارہ گر نہیں آتی |
| جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد     | پر طبیعت ادھر نہیں آتی     |
| ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی | کچھ ہماری خبر نہیں آتی     |

کہے کس منہ سے جاؤ گے غالب  
شرم تم کو مگر نہیں آتی  
ولہ

نکتہ چیں ہے غم دل، اُس کو سنائے نہ بنے  
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے  
میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبہ دل  
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے  
اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا  
ہاتھ آئیں، تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے  
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے  
کام وہ آن پڑا ہے کہ بتائے نہ بنے  
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر  
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے  
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

صبح روز آدینہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء

(۲۲)

لو صاحب، پرسوں تمہارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔ جب اُن سے  
کہا گیا تو یہ جواب پایا کہ میں مدت سے آمادہ سفر لوہارو بیٹھا ہوں۔ حکیم صاحب کی گاڑی کی  
روانگی کے وقت میں نے اپنی گھڑی بھیجی تھی وہ پھری آئی۔ اس مُراد سے کہ گاڑی میں جسک نہ  
گھڑی کی نہ سواری کی۔ ناچار چپ ہو رہا۔ اب وہ گھڑی ویسی ہی بندھی ہوئی رکھی ہے۔ جب میاں  
نہاں اور وزیر خاں روانہ ہوں گے اور منشی امداد حسین مجھ کو اطلاع دیں گے تو میں فوراً

چل دوں گا۔ پا بہ رکاب ہوں۔ کل ہی آخر روز غلام حسن خاں آئے۔ کل انہوں نے چوتھے دن کھانا کھایا تھا۔ بیضہ ہو گیا تھا۔ قے متواتر دست پے بہ پے، غرض بچ گئے۔ کہتے تھے کہ آج جولائی کی ۱۷ اتاریج ہے۔ تیرہ دن یہ اور پانچ دن اگست کے، اور نہیں جاسکتا۔ تنخواہ لے کر بانٹ بانٹ کر ایک دن نہ ٹھہروں گا۔ لوہارو کی راہ لوں گا۔ مرزا شاد علی بیگ سے تمہارا پیام کہا گیا۔ کیا بعید ہے جو غلام حسن خاں کے ہم سفر ہو جائیں۔

بھائی کی طرف سے منشی امداد حسین خاں کو لکھوا بھیجو کہ میاں خاں وغیرہ کے ساتھ استاد کو ضرور بھیجنا اور تم اپنی طرف سے اپنے ابن عم غلام حسن خاں کو یہ حوالہ میری تحریر کے عیادت اور اوائل اگست میں روانگی کی تاکید لکھ بھیجو :

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا

نظارہ ز جنبدن مژگاں گلہ دارد

یہ زمین قدسی علیہ الرحمۃ کے حصے میں آگئی ہے، میں اس میں کیوں کر تخم ریزی کروں؟ اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں؟ :

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار

بیجا ست برادر، اگر از من گلہ دارد

التواے شرب شراب ۲۲ جون۔ شروع شراب ۱۰ جولائی

المیۃ اللہ کہ درمیکدہ باز است

۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء ۳

(۲۳)

میری جان !

سن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ۔ ایک مژہ برہم زدوں میں نہیں تھا۔ اس وقت شدت سے برس رہا ہے۔ انگلیٹی میں کوئلے دھکا کر پاس رکھ



لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمہارے خط کا جواب ضرور  
لو سنتے جاؤ، مرزا شمشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوا دیا۔ انہوں نے کہا کہ غلام حسن خاں  
کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا  
ہوں کہ اونٹ ٹوٹا کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے، بس۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نی نکالی میں نے  
حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ :

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے  
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

مقطع یہ :

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو  
شامل اُن اشعار کے کر کے، غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع  
اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی تو کے۔

جب شاعر کی زندگی میں گانے والے، شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے  
کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی  
کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جو اب لکھتا ہوں :

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بیار

گلچین بہار تو ز دامان گلہ دار و

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربی قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی، اُن کا کلام دقائق و  
حقائق تصوف سے لبریز، قدسی شاہجہانی شعرا میں صائب و کلیم کا، معصرا اور ہم چشم، اُن کا کلام شور و انگیز

ان بزرگوں کی طرز و روش میں زمیں آسمان کا فرق۔

بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، ادھر مستحق اس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جاٹوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول نہ سود، اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا، کبھی مال نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیے آٹھ آنے کلکڑی کے، سو روپیے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سو درماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جہانی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر و روش بجان و روش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا، تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ مستغرق رہا، خیر ہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ بچوں کہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا:

اے بے خبر، لذتِ شربِ مدام ما

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔

دریہ کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو کوکھنا اور سائیکس و نفاس میں غوطہ مارتا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ

وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں  
 مشترک جانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو میلہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں،  
 مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالاتمہ کا ہم سر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے  
 موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہتا ہوں اور دل میں لَا مُجُودَ  
 إِلَّا اللَّهُ لَا مَوْثَرُ فِي الْوُجُودِ إِلَّا اللَّهُ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے  
 اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین  
 اور رحمۃ العالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجتماعی بلکہ من اللہ ہے  
 اور امام من اللہ علیہ السلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین۔ اسی طرح تادمہدی موعود علیہ السلام،  
 بریں زلیتم، ہم بریں بگنزر م

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور تردقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی  
 سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن  
 ہوں گا اور دوزخ کی آج کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفوی و امامت  
 مرتضوی اس میں جلیں۔

سنو، مولوی صاحب، اگر ہٹ دھرمی نہ کرو گے اور کتمان حق کو گناہ جانو گے تو البتہ  
 تم کو یاد ہوگا اور کہو گے کہ ہاں یاد ہے۔ جن روزوں میں تم علماء الدین خاں کو "گلستان"  
 اور "بوستان" پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپا نچے مارے ہیں۔  
 نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں۔ علماء الدین خاں کی والدہ نے تم کو  
 ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم باچشم پیر آب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی  
 شریف نادوں کو اور سردار نادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں، تم نے بے جا  
 کیا، آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم تادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین طفل سے گزر کر پیر ہفتاد سالہ  
 کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے: چوں پیر شدی حافظ



اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اُس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند، سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔

صوفی بیا کہ آئینہ صاف ست جام را  
تا بتگری صفائے غسل فام را

شراب ناب خور و روئے مے جبیناں میں  
خلاف مذہب آناں جمالِ ایناں میں

ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست  
نانِ حلالِ شیش ز آبِ حرامِ ما

ساقی مگر وظیفہ حافظ زبادہ داد  
کاشفہ گشت طرہ دستار مولوی

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلِ سراک دیواریں گر گئی ہیں۔ پاقانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں: ہاے دینی، ہاے مری، دیوان خانے کا حال محلِ سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے بر سے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے، تو کیوں کر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ جوئی جس میں میر حسن بہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاقانہ مع دالانِ زیریں

جو الہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک یہ مروت کا احسان میرے پایاں عمر میں اور بھی سہی۔  
 صبح یکشنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء۔  
 غالب

(۲۴)

مولانا علانی!

نہ مجھے خوب مرگ، نہ دعویٰ صبر ہے۔ میرا مذہب، یہ خلافتِ عقیدہ قدریہ جبر ہے۔ تم نے میاں بھائی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی، تم جیتے رہو، وہ سلامت رہیں۔ ہم اسی حویلی میں تاقیامت رہیں۔

اس ایہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینہ کی شدت سے پھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اُس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ اور اُس کے آگے ایک پھوٹا سا سہ ذرہ یاد تھا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اُسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڈی، ڈولی، لونڈی، انیل، کاچن، تیلن، تینولن، کھاری، پسنبھاری، ان فرقوں کا میر وہ دروازہ ہے گا۔ میرے اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانے میں سے رہے گی۔ عیافاً باللہ! وہ لوگ دیوان خانے میں سے آئیں جائیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت کھیل پائیاں نظر آئیں۔

بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپھی نے انہیں وانا بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ ”یہ پھول تائی چچا کے بیٹے کی کافی کے ایں“ شرح تمہارے

چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) ہے، ایسے عالی شان دیوان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت۔ معہذا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔ عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَرَاثِمِ پڑھا اور چپ ہو رہا۔ مگر تمھاری خاطر خاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت و خوف و خطر اب نہ رہے۔ مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے، نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات ہوا سرد، تمام رات فلک پر مرتیخ پیش نظر۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی صبحی کا وہ نطف، روشنی کا وہ عالم۔

غالب

۶ ماہ اگست ۱۸۶۳ء

(۲۵)

جانِ غالب، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان!

قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے، خدا کا احسان۔ مرزا قربان علی بیگ تمھاری کشش کے مجذوب کیوں بنتے؟ وہ تو خود سالک ہیں مگر ہاں یہ صاحبزادہ سعادت مند رتنوآں، سو اس کے آپ مالک ہیں۔ نواب صاحب کا ہم مطیع اور آپ کا ہم مائدہ ہوتا بہتر ہوا، کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہیرہ کیا مقرر ہوا؟ اثناعشری ایک تم ہو، سو تمہیں کیا اختیار ہے؟ البتہ عشرہ مبشرہ کی اولویت پر مدار ہے۔ باپ تمھارا خلافتِ قاعدہ اہل سنت جماعت عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا۔ رتنوآں نے نہ مانا، کیوں کر مانا؟ وہ تو ثلثہ کا دم بھرتا تھا۔

تہور خاں صاحب کے باب میں بندہ جو یا اس خبر کا ہے کہ اب لوہارو سے آن کا ارادہ

کدھر کا ہے؟

رتنوآں کو دعا پہنچے۔ نواب صاحب کی عنایت اور مولانا علائی کی صحبت مبارک

ہو۔ پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں، کیا کہتا ہے؟ "اور میں پوچھتا ہوں"



کس کا؟ تو وہ فرماتے ہیں، 'مرزا شمس الدین بیگ کا۔' 'ایں' اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟  
 دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے، 'واہ صاحب' میں کیا خوشامدی ہوں جو  
 منہ دیکھی کہوں، 'میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟ ہاں  
 صاحب آپ ایسے ہی وضع دار ہیں، اس میں کیا ریب ہے؟'

غالب

صبح سہ شنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۲ء

(۲۶)

میاں!

تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احیاء سے مرسوم و معمول ہیں خیر تمہارا حکم بجالایا، غزل بعد  
 اصلاح کے پہنچتی ہے۔ بناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر  
 لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ بلکہ میری خواہش اور تصور سے سوا مبذول کی اس  
 ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی کو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ہر دم دم نزع ہے۔ دل وہ غم  
 سے خونریز ہو گیا ہے کہ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات  
 کا طالب ہوں۔ کئی دن سے کوئی تحریر دل پذیر تمہاری نظر نہیں آئی۔ نہ مجھے تم نے یاد کیا، نہ  
 اپنے بھائی کو کچھ لکھا۔ اب اس خط کا جواب جلد لکھو۔

پہلے اپنے بچوں کا حال، پھر وہاں کے اوضاع، جیسا تمہارا قاعدہ ہے، منقح اور مفصل  
 لکھو۔ فقط۔

نجات کا طالب۔ غالب

اوائل مارچ ۱۸۶۳ء

(۲۷)

اقبال نشانا!

بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہار و پہنچنا مبارک ہو مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ  
 ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے

پھپھوانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے، اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہوا، اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔ بچوں کو دعا۔

غالب

اپریل۔ مئی ۱۸۶۳ء

(۲۸)

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک

عنایات الہی ہو مبارک

اس امر فرخ و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بے حوصلگی ہے اور اس کے اخفا میں مبالغہ خفایت۔ تم اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ اگر کوئی اور کہے، مانع نہ آؤ۔ نہ اشتہار نہ استعار۔

دورہ ہوا مگر مدت معینہ کے بعد اور پھر جھاگ کا نہ آنا اور تمہارے پکارنے سے متنبہ ہو جانا، ماوے کی کمی کی علامتیں ہیں۔ شدت میں جس قدر حقت ہو غنیمت ہے۔

میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا، تمہارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزہ ہوا، اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں تو شاید ایک تختہ کا غند سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجب و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی! اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو اور شہرت تمہارے منافی طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو، قصہ تمام ہوا، اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی مقصدی سے نقل آتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ چاہو بسیل پارسل ارسال کرو لیکن جلد۔ خدا کے واسطے کہیں غصے میں آکر عطاے توبہ لقاے تو، کہہ کر اصل خطوط نہ بھیج دینا کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے۔ بھلا صاحب، ڈرتا ہوں میں تم سے۔ ادھر خط پڑھا ادھر جواب لکھ کر ڈاک میں بھیجا۔ تمہارا خط رہنے دیا

ہے۔ جب آکاشمشاہ علی بیگ آئیں گے، پڑھ لیں گے۔

غالب

اپریل مئی ۱۸۶۳ء

(۲۹)

لَا مَوْجُودُ إِلَّا اللَّهُ اُس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے اور اُس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا ازراہِ ظال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک حلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے، اپنا نفع نقصان سوچنے کا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو ہمت سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپو اُسے گا۔ تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر اُن کو بھیجے، اُس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلبِ رقععات بہ تکلیف سوداگر لکھی اور اُس سوداگر کو مفقودا لخبیر لکھا۔ ظاہر کتابیں لے کر کہیں گیا ہو گا یا کتابیں لینے گیا ہو گا۔ یہ تئیس لفافے اور چونتیس خط بہ دستور میرے کس میں موجود محفوظ رہیں گے، اگر متوسط بہ تقاضا طلب کرے گا، اُن خطوط کی نقلیں اُس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ تمھارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

میاں! ان خطوں کے ارسال میں تم نے مجھ سے وہ کیا جو میں نے تم سے دو جانے میں کیا تھا۔ بھلا میں تو پیرِ خرافت ہوں اور سنِ خرافت کو نسیاں لازم ہے، تم نے کیا سمجھ کے کپڑا لیپٹ کر اور مخم کر کے بھیجا؟ خطوں پر ایک قلیل العرض کاغذ لیپٹ کر ارسال کیا ہوتا، اگر منشی بہاری لال میرا اور شہاب الدین کا دوست نہ ہوتا تو بیچاس روپیے کا مجھ کو دھپا لگتا۔

رسیدہ بود بلاے ولے بخیر گذشت

غالب

صبح شنبہ ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء

(۳۰)

بد است مرگ، ولے بد تر از گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے



یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں ذہج، قصیدہ بھیج، معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پازند کی قسم، آشتا کی قسم، گرو کے گرنیہ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔

کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں :

برہانیم کہ ہستیم وہاں خواہد بود

بے بیس دس پندرہ جلدیں منگالوں گا، ایک بھائی کو اور ایک تم کو اور مغال بھجوں گا اور اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں "اودھ اخبار" کا مطبع، مالک اس کا نشی نول کشور مشہور جتنی جلدیں چاہیں، لکھنؤ سے منگالیں۔ میں بہ ہر حال دو جلدیں جس وقت موقع ہو گا بھیج دوں گا۔

نجات کا طالب۔ غالب

۱۱ جون ۱۸۶۲ء

(۳۱)

میری جان !

مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمہارے یک مشت اُن کو دیے۔ اب تمہارے پاس بھیجنے کا اُن کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔ علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی۔ جواب پایا کہ ایک مہینہ دس دن کی رخصت لے کر آیا ہوں۔ بی بی بیمار ہے۔ اُس کا استعلاج منظور ہے۔ میری جان علی حسین خاں کے کام آئے تو دریغ نہ کروں۔ بھلا یہ مبالغہ ہی، بلکہ بے شک تبلیغ و غلو ہے، لیکن قریب قریب اس کے، یعنی جو چیز امکاں سے باہر نہ ہو، اُس میں قصور کیوں کر کیا جائے گا؟ بلکہ شاید تمہاری سپارش کی بھی حاجت نہ ہو، مگر سوچو کہ آئین غم خواری و اندوہ گساری کیا ہو گا۔ مرزا بد وضع و بد روش نہیں کہ پند و بند کا محتاج ہو، کوئی اس کا مقدمہ کسی محکمے میں دائر نہیں کہ مصلحت و مشورت کی احتیاج ہو۔ رہے امور خانگی یعنی بی بی اور اُس کے آبا اور اخوان کے معاملے، اُس میں نہ تم کو

وخل نہ مجھ کو مداخلت تم علی حسین خاں کو اس بیونڈ پر کیا کیا چھڑتے ہو۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اُس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا اور اب اُس کے دادا کی اور اُس کی سسرال ایک ہے۔ یہ ذریعہ فخر ہے۔ اُس کو اور اُس کے طفیل سے تم کو، بلکہ تنوڑی سی نازش اگر مجھ تنگ اقربا کے حصے میں بھی آجائے تو کچھ بعید نہیں۔

ہر چند تمہارا ہر کلمہ ایک بذلہ ہے، لیکن اس خسر "و خسرانی" نے مار ڈالا۔ کیا کہوں جو مجھ کو مزاملاب ہے؟ کہاں "خسر" و "خسراں" لغات عربی الاصل اور کہاں روزمرہ مشہور کہ "خسر" سسرے کو کہتے ہیں۔ صنعت اشتقاق و طباق کو کس سینہ زوری سے بتاتا ہے۔ اچھا میرا میاں یہ "خسر" بہ معنی "پدر زن" کیا لفظ ہے؟ حروف بین الفارسی والعربی مشترک ہیں لیکن ان معنوں میں نہ فارسی ہے نہ عربی ہے۔ فارسی میں "پدر زن" بہ نیک اضافت کہتے ہیں۔ عربی جس طرح بہ معنی نقصان لغت منصرف ہے، شاید سسرے کا اسم جامد بھی ہو یا فی الحقیقت سسرے کی تفریس و تعریب ہو۔ یہ پرسش نہ بہ سبیل استہزا ہے بلکہ بہ طریق استفسار و استعلام ہے، جو تمہیں معلوم ہو بلکہ اگر تم پر محبول ہو تو معلوم کر کے مجھے لکھ دیجو۔

یوسف علی خاں عزیز مانتہ اُس دہقان کے کہ جو دانہ ڈال کے مینہ کا منتظر ہو اور ابر آئے اور نہ برسے، مضطرب و حیران ہے۔ علی حسین خاں آتے ہیں۔ علی حسین خاں آتے ہیں، آئے، وہ آئے تو کیا لائے؟

یکشنبہ ۳ محرم ۱۲۸۸ھ

مطابق ۲۱ جون ۱۸۶۳ء

غالب

(۳۲)

صاحب!

میں از کار رفتہ و در ماندہ ہوں۔ آج تمہارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ لفظ خسر کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرورت تھی۔ میرا علم لغات عربیہ کا محیط نہیں ہے اور یہ طریق حق الیقین جانتا ہوں کہ

”خمر“ لغت فارسی نہیں۔ سسرے کی تفریس ”سے“ خمر پیدا ہوا ہو تو کیا عجب ہے، تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو، وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں لغت ہندی ہے مفرس۔ اور یہی تھا میرا عقیدہ۔

علی حسین خاں آئے۔ دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آ سکتے ہیں نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیب دشمنان وہ ننگڑے میں لولا، ان کے پاؤں کا حال مفصل تم کو معلوم ہو گا جو نکلیں لگیں، کیا ہوا کہاں تک نوبت پہنچی۔ میری حقیقت سنو۔ مہینا بھر سے زیادہ کا غرصہ ہوا، بائیں پاؤں میں ورم، کف پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماں کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر، نہ اٹھا، روٹی کھانے محل سرائے گیا، کھانا یہیں منگالیا۔ پیشاب کو کیوں کرنے اٹھوں؟ حاجتی رکھ لی۔ بغیر اکڑو بیٹھے بات نہیں بنتی، پاخانے کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں، مگر جاؤں تو کبھی۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی؟

آغاز فتق مزید علیہ یا مستزاد :

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں :

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔

مرگ، اب ناگہانی کہاں رہی؟ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہاے الہی بخش خاں مغفور

کا کیا مصرع ہے :

آہ جی جاؤں، نکل جائے اگر جان کہیں

زائدہ بے فائدہ

مرگ کا طالب۔ غالب

جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء

(۳۳)

جانا عالی شان!

پہلے خط اور پھر بہ توسط برنارڈ وار علی حسین خاں، مجلہ کلیات فارسی پسنجے۔ حیرت ہے کہ



چار روپیہ قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک، قالب انطباع میں آکر پانچ روپیہ قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے، خیر، جہاں سو وہاں سوا سے۔ میرا حال تمہیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے :

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم بائے دگر

اب کے چٹھے میں شاید نہ دے سکوں۔ نو مہر سنہ حال میں پچاس تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ انشاء اللہ العلیٰ العظیم۔

میں بے حیا تھا نہ مرا۔ اچھا ہونے لگا۔ عوارض میں تخفیف ہے۔ طاقت آتی چلی ہے بخیر مفید:

در نامہ جز ایں مصرعہ شاعر چہ نو نسیم

اے والے ز محرومی دیدار، دگر ہیج

صبح یکشنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء ۲

نجات کا طالب۔ غالب

(۳۴)

اقبال نشان مرزا غلام الدین خاں بہادر کو غالب گوشہ نشین کی دعا پہنچے۔ برخوردار علی حسین خاں آیا، مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اُس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ اَلْوَلَدُ سُرَّ لَا بِیْہِ، تم اس کے مصداق کیوں بنے؟ خفقان و مراق اگرچہ تمہارا خانہ زاد و رشتہ ہے لیکن آج تک تمہاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا، اب کیوں آیا؟ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھہرنے نہ دو، ہانک دو، خبردار، اُس کو اپنے پاس رہنے نہ دینا۔

شفیقِ بکرم و لطفِ مجسم نول کشور صاحب بسبیلِ ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمہارے پچھا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے، خالق نے اُن کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بہ جائے خود قرآن السعیدین ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس مان لیے تھے، اب اُن سے جو ذکر آیا تو انہوں نے پہلی قیمت شہرہ اخبار یعنی قبول کی۔ یعنی تین روپیہ چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپیہ

آٹھ آنے میں دوں۔ اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ جگہ پینسٹ، مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہیں۔  
میں دسمبر ماہ جال کی دسویں گیارہوں کو طالب ہوں گا۔ کہو، بتیس روپے آٹھ آنے علی حسین خاں کو  
دے دوں، کہو لکھنؤ بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلد بھیج دوں۔

بھائی صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور استاد میر جان کے میری طرف سے قدم لینا۔  
پنجشنبہ ۲۱ جمادی الثانی سال غفر

مطابق ۳ دسمبر سال ۱۸۶۳ء  
نجات کا طالب۔ غالب  
سال: کیا غضب! ہے یہ ۱۸۶۳ء۔ یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔  
مولانا علانی ! (۳۵)

واللہ علی حسین خاں کا بیان بہ مقصدناے محبت تھا۔ ہر بار کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ حق بہ جناب  
اُن کے ہے، نہ کوئی ہم سخن، نہ کوئی ہم نفس، نہ سیر، نہ شکار، نہ مجلس، نہ دربار، تنہائی و بے شغلی  
اور بس۔ جی نہ کیوں کر گھبرائے خفقان کیوں کر نہ ہو جائے ؟

نہ دن یاد، نہ تاریخ، آج چوتھا یا بھئی شاید بھول گیا ہوں، پانچواں دن ہے کہ منشی  
نول کشور بہ سواری ڈاک رہ گئے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔

آج روز یکشنبہ تیرہ دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور بخوردار  
شہاب الدین خاں بھی تھامیں۔ نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس  
کو نوکری کہتا مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزیہ دار ہوں۔

ساڑھے باسٹھ روپے یعنی سات سو پچاس روپے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں۔ بارہ سو  
سال رام پور سے اور چوبیس روپے سال ان مہاراج سے۔ تو صبح یہ کہ دو برس سے

ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ملکٹ میں مطبع میں  
پہنچا دیا کرتا ہوں۔ بتیس روپے آٹھ آنے جو میں نے پوچھے تھے کہ علی حسین خاں کے حوالے

کروں، مقصود اس سے یہ تھا کہ ارسال بہ سبیل ہندوی دشوار ہے، حیراب جس طرح ہوگا حصار

پر ہنڈوی لکھوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ تم حصار پہنچ کر روپیہ منگوا لیجیو۔ خدا چاہے تو دسمبر میں روپیہ تمہارے پاس پہنچ جائے۔

استاد میر جان صاحب کو قدم بوس کہہ کر مجھ کو فرعون بننا پڑا۔ وہائی خدا کی، اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا سلام بلکہ دعا اُن کو کہہ دینا۔

پرسوں مولوی صدر الدین خاں صاحب کو فوج ہو گیا۔ سیدھا ہاتھ رہ گیا ہے۔ زبان موٹی ہو گئی ہے۔ بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں اپاہج ہوں جا نہیں سکا۔ جو اُن کو دیکھ آتا ہے، اُس سے اُن کا حال پوچھا جاتا ہے۔ دن تارخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔

یک شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

(۳۶)

عدائی مولائی کو غائب طالب کی دعا۔ بے چارے مرزا کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا۔ یہاں پندرہ کا سوال، وہاں دس ہیں سے عین کم کرنے کا خیال، متوسط دوسرا جو علی حسین خاں بہادر کے بعد درمیان آئے، وہ کیا کرے اور کیا کہے؟ مرزا قانع و متوکل ہیں، نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس، اللہ بس ماسوا ہو س۔

جناب ترولین صاحب، بھائی کے دوست دلی دلی آئے۔ لارڈ صاحب کہلاتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ کل اکبر آباد جاتے ہیں۔ بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات کو بارہ پر دو بجے مر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تمہارے علم نامدار آج دن کو بارہ بجے سلطان جی گئے ہیں۔ میں نہ جا سکا تجہیز و تکفین اُن کی طرف سے عمل میں آئے گی۔ بارہ پر تین بجے یہ خط میں نے تمہیں لکھا ہے کل شنبہ دو جنوری صبح کو ڈاک گھر بھیج دوں گا۔ مشفق شفیق میر جان صاحب کو سلام مع الاکرام۔

نجات کا طالب۔ غالب

یکم جنوری ۱۸۶۳ء



(۳۷)

میری جان !

غالب کثیر المطالب کی کہانی سن 'میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں۔ جہاں ایک امر کی ابتدا دیکھی 'یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس ہدایت کے نہایت پذیر ہوگا۔ یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغاز منقوش، انجام مخدوش، مبتدا خیر سے بیگانہ، شرط جزا سے محروم، سنا اور متواتر سنا کہ قصہ طے ہو گیا۔ اب علاء الدین خاں مع قبائل آئیں گے۔ دل خوش ہوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتائج کے دیکھوں گا۔ پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا۔ اثنائے اختلاط و انبساط میں 'میں نے پوچھا کہ بھو بھائی علاء الدین خاں کب آئیں گے؟ جواب کچھ نہیں۔ اجی وہ قصہ تو طے ہو گیا، ہاں وہ تور و پیہ میں تے دے بھی دیا۔ میں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں۔ فرمایا کہ شاید ابھی نہ آئے :

معلوم ہوا کہ خیر، ٹھینکا باجا

ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا، اب وہ لکھ کر بھیجوں۔ پرسوں تو شام ہو گئی تھی کل بغل گیر مرنے والوں نے دم نہ لینے دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ثاقب نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں۔ اب ضرور آپڑا کہ گذارش مدعا سے پہلے تمہارے رقع ملال میں کلام کروں۔

بھائی تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا صلیبی بیٹا اس وید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یار و فادار، ذریعہ افتخار جانتا۔ میرے خطوط کے نہ پہنچنے کا کلمہ غلط، تمہارا کون سا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے، وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو، زبانی گفت و شنید ہو جائے گی۔ ثاقب نے چلتی گاڑی میں روٹا اڑکا دیا۔ تب مجھے توطیہ و تمہید میں ایک ورق لکھنا پڑا۔ ورنہ آغاز نگارش یہاں سے ہوتا۔

یا اسد اللہ غالب :

یامن از جہل معارین شدہ تا منفعل

کہ گرش، جو کتم ایں بودش مدح عظیم

یہ رسالہ موسوم بہ "محرّق قاطع برہان" جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس  
ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معانی کے وقت اس کتاب کی بے ربطی عبارت پر اور میری  
اپنی قرابت اور نسبت ہائے حدیدہ پر نظر نہ کرو۔ بیگانہ وارد کیجو اور از روئے انصاف حکم بنو بے حیف و میل۔  
اُس نے جو مجھے کالیاں دی ہیں، اُس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی، شدتِ اظنابِ مل  
کی صورت، سوال دیگر، جواب دیگر۔ ان باتوں کو مطمح نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے  
تو اُن مراتب کو الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست رُحانی  
کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے۔ ان بقوات کا خاکہ اڑا رہا ہے۔ تیر رشتاں نے اس کو مدد دی  
ہے۔ تم بھی بھائی مدد دو، اور وہ امر مبہم کہ جو تمہارے والد کی تقریر سے دل نشیں نہیں ہوا یعنی  
قصدِ بچک جانا اور دتی آتا، اُس کا مابرا مفصل و مشرح لکھ۔

دن تارِ سخن، اپنا نام، آغاز کتابت میں لکھ آیا ہوں، اب ارسال جواب کی تاکید کے  
سوا اور کیا لکھوں۔ فقط۔

صبح کا وقت، پہارِ شنبہ ۱۸ مئی ۱۸۶۲ء بقول عوام باسی عید کا دن

(۳۸)

اے میری جان!

مثنوی "ابر گہر بار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ کلیات میں موجود ہے۔ معہذا

شہاب الدین خاں نے بھیج دی۔ میں مکرر کیا بھیجتا؟

تب "محرّق" کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافقِ طبع تحریر کو بہ سببِ انزجار  
نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں؟ "افسوس" کو میں نے عربی جانا، عربی  
نہیں ہے، اب مانا، یہ ایک سہوِ طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو غلط بحث پر ہے۔ "افسوس" و

”فسوس“ ایک کیوں ہو جائے۔

یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قُربِ محفی اور تم پر یہ ایں ہمہ بُعدِ آشکار۔ دورانِ باخبر  
ورحضور، و نزدیکانِ بے صبر دور۔ روپیہ آگیا۔ دل سے نکلا۔ مخزن سے نکلا۔ ہاتھ سے نہیں نکلا۔  
جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنسِ مولیٰ جائے گی اور یہ گند کٹ جائے گا۔ تب ترساں ترساں  
پیشِ گاہِ نادری میں تمہارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دلوں مردود  
بھی ہوں۔ والسلام،

صبحدم با ابوالبشر گفتم  
پارہ زرد بدہ کہ زر داری  
حیف باشد کہ از چو من پسرے  
خاک رنگیں عزیز تر داری  
گفت حیف است از تو خواہش زر  
کہ تو گنجینہ گہر داری  
گنجدان سخن حوالہ تست  
خود بہ میں تاجہ، اے پسر، داری  
پیش من زر کجاست جان پدر  
ببری ہرچہ در نظر داری  
گفتم اینک بہ بند پیانے  
زر بہ من می دہی، اگر داری  
سر زنبیل آل عمر عیار  
کہ ز عیاریش خبر داری  
بکشا زود و زر بریز و بگوے  
کہ ہمیں مدعا مگر داری



گفت، بابا فسانہ بودہ ست  
چہ فرو ریزم و چہ برداری

روشنیہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ

۳۰ مئی ۱۸۶۳ء

(۳۹)

علاقائی مولائی !

ماتلب کو اپنا دعاگو اور خیر خواہ تصور کریں۔ مادہ ہائے تاریخ کو نہ آپ قالبِ نظم میں لائیں  
اور نہ اور کو اس امرِ منکر کی تکلیف دیں۔

بھائی! سمجھو، یزید پر لعن، من جملہ عبادتِ سہی، لیکن تقریباً کہہ دیتے ہیں کہ ”یزید لعنت“  
کسی مومن نے اس کی ہجو میں قصیدہ نہیں لکھا۔

ابداعِ مادہ ہائے تاریخ تمہارے حسناات میں لکھا گیا۔ شاب تم ہو چکے۔ اجر پاؤ گے انشاء اللہ۔  
اب اپنے کو بدنام اور کسی کو طول اور عداوت کو ظاہر اور اگر ظاہر ہے تو محکم نہ کرو۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے  
رجب کے مہینے سے انہی ترواں برس شروع ہوا ہے۔ اُس نے چھیا سٹھ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و  
تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمات میں کہنے لگے کہ میں چچا جان  
کے ساتھ لاڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہو لکر سے جو محاربات ہوئے ہیں اُس میں  
شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبائلی پیر ہن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے  
ہے۔ جاہِ جاتلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغزو و دیدہ و آدمی، اُن کو دیکھ کر  
کہنے لگا کہ: نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جنرل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس  
کے ہو گے۔ ”یہ سن کر آپ نے کہا کہ: درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔“

خدائیش، بیامرزاد و بدیں دروغ ہائے بے نمک مکیراد

شنبہ ۱۰ جولائی ۱۸۶۳ء

غالب

(۴۰)

اجی مولانا علانی !

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ میں خبر تراشی نہیں کرتا، مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب صاحب علاء الدین خاں سے کہ چکے ہیں کہ قصہ مٹ گیا ہے، اب تم شوق سے دلی جاؤ دو ہفتے سے لے کر دو مہینے تک کی تم کو فرصت ہے پھر تم کیوں نہ آئے۔ خدا نے دعاء خداوند نے استدعا قبول کی۔ تمہاری طرف سے سست قدمی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر حاکی کی حکایت بھوٹ ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے؟

مرزا یوسف علی خاں عزیز تمہارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین، بھاتی صاحب کے مطلوب، مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانہ لوہارو ہوئے ہیں۔

شنبہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۴ء  
نجات کا طالب۔ غالب

(۴۱)

مرزا علانی مولانی !

نہ لاہور سے خط لکھا نہ لوہارو سے۔ بہ قدر زیادہ حق مجھ انتظار بلکہ امیدوار رہا، اب جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک سکوے کے دفع میں ”طوطی نامہ“ برابر ایک رسالہ لکھو گے اور ہزار وجہیں موجب بیان کرو گے۔ میں اس تصور کا مزہ اٹھا رہا ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو؟

دادی صاحبہ سے لکھوانا، پھوپھی صاحبہ سے لکھوانا، غالب سے لکھوانا بعد حصول اجازت نہ آنا اس کے بھی کچھ معنی ہیں یا نہیں؟ اچھا میرا میاں، کچھ اس باب میں لکھ: چٹری اور دودھ ایک منديل اور ایک سیلایا کوئی اور چیز مبارک۔

بچوں کو میری دعا کہنا اور ان کی خیر و عافیت لکھنا۔ استاد میر جان صاحب کو سلام۔ مزہ تو جب ملے گا کہ تم دلی آؤ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامہ انجمن کا حال بیان کرو۔

چہار شنبہ ۲۳ نومبر ۱۸۶۴ء  
نجات کا طالب۔ غالب

میری جان !

تھارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔ اگر سر نوشت آسمانی میں بھی  
اواخر رجب یا اوائل شعبان میں ہمارا تمھارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہہ سن لیں گے۔ قلم کو  
ان اسرار کی محرمیت نہیں ہے جو شخص اپنے ملک و مال و جان و تن و ننگ و تمام کے امور میں آشفتہ و  
سرگرداں بلکہ عاجز و حیراں ہو، دوسرے کو اُس سے کیا گلہ۔ ہائے نظیر ہی :

باما جفا و ناخوشی . با خود غرور و سرکشی  
از مائتہ ز خوردتہ آخر ازاں کستی

محفل عقل و ہوش دماغ سوتباہ ، افیون کا مخمر ہو جانا علاوہ ۔ اللہ جو چاہے سو کرے۔ ایسا  
پیارا باغ و بہار بھائی یوں بگڑ جائے ۔

جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۲ء

نجات کا طالب ۔ غالب

۹ رجب ۱۲۸۱ھ

(۴۳)

لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے، اُن کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا  
ہو گئے، کل اُن کی چھٹی ہو گئی، آپ شریک نہ ہوتے :

اے ولے ز محرومی دیدار و گریہ بیچ

میاں خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری  
نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عومش میں مر جاؤں۔ اللہ اس کو جیتا رکھے  
اس کا داغ مجھ کو نہ دکھائے، یارب اُس کو صحت دے۔ یارب اس کی عمر بڑھا دے۔

تین بچے، ایک اب پیدا ہونے والا ہے۔ یارب اُس کو اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔

۵ جنوری ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب ۔ غالب

۷ شعبان ۱۲۸۱ھ



(۴۴)

میری جان !

ناسازی روزگار و بے ربطی اطوار و بہ طریق داغ بالائے داغ آرزوے دیدار۔ وہ  
دو آتشِ شہارہ بار اور یہ ایک دریاے ناپسید اکثار وَقْتًا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ۔

خدائے بھائی ضیاء الدین خاں کے بڑھاپے پر اور میری بے کسی پر رحم فرمایا۔ میرا  
شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بوا میر خونی، زحیر، تپ، سداغ، باہے  
اب من کل الوجوه صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جاتے گئے۔ آگے کون سے قوی تھے  
کہ اب اُن کو ضعیف کہا جائے؟ ایک بڑھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا کہنے لگا:  
”ہائے بڑھاپا“ ادھر ادھر دیکھا۔ جب جاناکہ کوئی نہیں ہے کہتا ہوا بڑھا کہ ”توانی میں کیا پتھر  
پڑتے تھے“ والسلام

جنوری ۱۸۶۵ء ۲

غالب مستہام

(۴۵)

میری جان !

نئے بہان کا قدم تم پر مبارک ہو! اللہ تعالیٰ تمہاری اور اُس کی اور اُس کے بھائیوں  
کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمہاری طرزِ تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا  
سعیدہ ہے۔ شاقب اُس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تا احتمال رفع ہو۔  
خط شاقب کے نام کا، تو بہ تو بہ خط کا ہے کو ایک تختہ کاغذ کا، میں نے سرا سر پڑھا، لطیفہ  
و بذلہ و شوخی و شوخی بہ شمی کا بیان جب کرتا کہ فحوائے عبارت سے بگر خون نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم  
جدا۔ ایسا سخن گزار، ایسا زباں آور، ایسا عیارِ طرار۔ یوں مایہ و در ماندہ و از کار رفتہ ہو جائے۔  
تمہارا غم جدا، ساغرِ اول و دُردِ کیا دل لے کر آئے، کیا زبان لے کر آئے، کیا علم لے کر آئے  
کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے کسی شیوے کی داد نہ پائی۔ گویا نظیری تمہاری

زبان سے کہتا ہے :

جوہر بنیش من در تہ زنگار بمسند

آنکہ آئینہ من ساخت نہ پرداخت ، درین

بھائی اس معنی میں ، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داوہ اندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا ، آپ ہی سمجھا۔ قلندر سی و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاکھ ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیرازہ جازکلا ، کبھی مصر میں جا ٹھہرا ، کبھی نجف جسا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ ہسی ، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا نہ لگا نظر نہ آؤں :

نہ بستاں سراے ، نہ میخانہ

نہ دستاں سراے ، نہ جانانہ

نہ رفقی پری پیکراں بر بساط

نہ غوغائے را مشگراں در رباط

خدا کا مقہور ، خلق کا مردود ، بوڑھا ، ناتواں ، بیمار ، فقیر ، نکبت میں گرفتار ، تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کہ بلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمھارا خالق تمھاری اور تمھارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو ، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بہ در بھیک مانگے ، وہ میں ہوں۔

صبح دو شنبہ ، شانزدہم از وصیام ۱۳۸۱ھ

۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

(۴۶)

صاحب !

کل تمہارا خط پہنچا۔ آج اُس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ رجب بیگ، شعبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور ہسینے ہیں، سو خالی گئے۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سنا۔ ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس جب عید ہے اور روز سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بہ خلاف شہور ثلثہ ماضیہ اس ہسینے میں تم آسکو؟ ہے ہے میں تو کہتا ہوں، نہ آسکو۔ اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی "عید کو سہ برنشیں" کا گماں گزرے، دور کیوں جاؤ۔ ہولی کی دھلینڈی کا سماں لوہار میں بندھ جائے۔ ایک خر سوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلے، حسن اتفاق یہ کہ یہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور "عید کو سہ برنشیں" کا زمانہ باہم ہے، ٹوٹ کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب ٹوٹ میں آیا ہے۔ کو سہ برنشیں اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیز میں چند روز اور شرم کش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق رہوں تو کو سہ برنشیں اور ہولی کی رنگ ریاں منالے اور خر سوار کو بھرب تازیانہ دوڑالے۔

علاء الدین خاں، واللہ تو میرا فزندہ روحانی معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے، ارے ظالم، اس کو سہ برنشیں کی داد دے عقل کرامت ہے، الہام ہے، لطف بلیغ ہے کیا ہے؟ یہ اسم کس قدر مناسب مقام ہے۔

صبیہ کا مقدم تم پر مبارک ہو۔ شاقب مجھ سے لڑتا تھا کہ بھتیجا ہے، میں کہتا تھا کہ پوتی ہے۔ بارے میں جیتا اور شاقب ہارا۔ علیحدہ جدا گانہ استاد میر جان صاحب کے نام پہنچتا ہے۔

پنجشنبہ ۲۶ رمضان ۱۲۸۱ھ  
۲۲ فروری ۱۸۶۵ء

غالب

(۴۷)

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح قتاد  
حوریاں رقص کنان ساغر شکرانہ زدند



قدسیاں بہر دعالے قور والا پدرست

قرعہ قال ہنام من دیوانہ زودند

میاں، تم جانتے ہو کہ میں عازم رام پور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بہ شرط حیات جمعے کو روانہ ہوں گا۔ لڑکے بالوں کی خیر و عافیت علی حسین خاں کی تحریر سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ میرا لکھنا زائد ہے۔ ایک بار میں صاحب کمشنر کی عیادت کو گیا تھا۔ فرخ مرزا بھی میرے ساتھ گیا تھا مزاج کی خبر پوچھ آیا۔ بھائی صاحب کو میرا سلام کہنا۔

یک شنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء  
راقم۔ غالب علی شاہ

(۴۸)

جانا علی شانا!

خط پہنچا، حظ اٹھا۔ تمھاری آشفۃ حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں، قبائل کہیں، والی شہرنا سازگار، انجام کارنا پاؤں دار، ایک دل اور سو آزار۔ اللہ تمھارا یا اور۔ علی تمھارا مددگار۔ میں پاؤں رکاب، بکھ نعل در آتش، کب جاؤں اور فرخ سیر کو دیکھوں۔ ایک خط میں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اُس کا جواب آگیا۔ روہیلا پھوڑے کپڑی میں مبتلا ہے۔ خدا اُس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں الور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے بھی مل کر نہ گیا خیر؛ رموز مصلحت خوش خسروان دانند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغاز پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان اکل سہ شنبہ، پانچ دسمبر حضور پر نور بڑے تجمل سے آغاز پور تشریف لے گئے۔

بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساں خواہی

میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار روپیے سے کم نہ نثار ہوا ہو گا۔ آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ 'پن' شام کا کھانا، یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتش بازی کی وہ افراط کہ رات، دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کشنر بہادر، مع صاحبانِ عالی شان کے کل جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے پرسوں۔ رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں، قدر رنگ، شکل، شامل بعینہ بھائی صیاء الدین خاں عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم و خلیق، باذل کریم متواضع، متشرع، متورع، شعر منہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرٹ توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالاے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جیسے ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کو سوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللہم اقبالہ و زادِ اجلالہ

بعد اختتام محافل طالبِ رخصت ہوں گا۔ بعد حصولِ رخصت دلی جاؤں گا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بہ شرطِ رسائی و تابِ گویائی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے، وہ مجھ کو لکھنا۔ چھ دسمبر ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔

۶ دسمبر ۱۸۶۵ء  
کاتب کا نام ہے غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے

(۴۹)

مرزا!

رو برو بہ از پہلو، آؤ میرے سامنے بیٹھو۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی بہت بڑے مرغ، چھ بڑے اور آٹھ پھوٹے، گے کے دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ گئے۔ کلو اور لٹڑ کا نیاز علی بسنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب تے وقت رخصت ایک ایک دو سالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتے سے یہاں وارد اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی ہفتے میں چلوں گا۔

آپ چال چوکے۔ اردو لکھتے لکھتے جو خط کہ شتل ایک مطلب پر تھا، اُس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی مقصدیاً نہ کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بہ صیغہ مفرد نہ لکھیں، یہ وہی چھوٹی ہے۔ "بڑی" ہے۔ "کافصہ" ہے۔ خیر، خط نہ دکھاؤں گا۔ مکتب فیہ کہ کرام نکال لوں گاہیں نے تو پلٹے وقت فرخ سیر کے اتالیق کی زبانی بھائی کو کہلا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو میں اُس کی درستی کرتا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ مدعا نہیں، صرف مکان کا مقدمہ ہے۔ سو اُس مقدمے میں میرے اور میرے شرکا کا وکیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اُس امر کا ذکر کرتے تو میں اُن سے اُن کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھواتا لانا بہ ہر حال اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مطلوب رکھ لیا ہے۔ فقط۔

جمعہ ۲۲ دسمبر ۱۸۹۵ء بارہ پر دو بجے تین کا عمل

(۵۰)

صاحب!

تھارا خط پہنچا۔ مطالب دل نشیں ہوئے۔ غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں کیا اچھی بائی ہے کسی کی:

مومن بہ خیال خویش مستم داند  
کافر بگماں، خدا پرستم داند  
مردم ز غلط فہمی مردم، مردم  
اے کاش کسے، ہر آنچہ ہستم، داند

بھائیوں سے پھر نہیں ملا، بازار میں نکلے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر، خبردار میرا سلام انہیں

کو اور اُن کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے، اسی کو غنیمت جانتا ہوں:

تاب لائے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے  
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ مقطع اور مطلع مندرجہ دیوان ہے؛ مگر اس وقت یہ دونوں شعر حسب حال نظر آئے  
اس واسطے لکھ دیے گئے۔ تم نے اشعار جدید مانگے، خاطر تمھاری عزیز۔ ایک مطلع صرف  
دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخل دیوان بھی نہیں۔ اُن پر فکر کر کے ایک مطلع  
اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ بھائی! کیا کہوں کہ کس مصیبت سے  
یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں؛

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے  
غلام ساقی کو تر بوں، مجھ کو غم کیا ہے

مطلع ثانی :

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے  
تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے  
کئے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے  
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے  
لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود  
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے  
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا  
خدا کے واسطے، ایسے کی پھر ستم کیا ہے  
وہ داد و دید گرا تمنا یہ شرط ہے ہم دم  
وگر نہ مہرِ سیماں و بام، تم کیا ہے  
سخن میں خامہ غالب کی آتش فشان  
یقین نہ ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں کم کیا ہے

لو صاحب، تمہارا فرمان قصداً تو امان بجالایا مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں ہے۔  
اگر بہ احتیاط رکھو گے اور اردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھا دو گے تو اچھا کر و گے۔ عمر فراواں  
و دولت فزوں باد۔ فقط۔

۲۲ دسمبر۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

(۵۱)

جانا جاتا !

ایک خط میرا، تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہو گا۔ آج میں علی اصغر خاں بہادر  
کے گھر گیا۔ اُن سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا کہ فرخ سیر کی ماں کو لکھو بھیجو کہ سال بھر کی تنخواہ کی رسید  
بھیج دیں۔ یہاں سے روپیہ بھیج دیا جائے گا۔

آج مشکل ہے، سات شعبان کی اور ٹھیس دسمبر کی، دونوں بھتیجے تمہارے جمعے کے دن بائیس  
دسمبر کو روانہ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم النہیس کو مرحلہ پیمابوں گا۔

اول ما آخر ہر مفتی، در اکرام و عزت

آخر ما حبیب تمنا تھی، از مال و دولت

تو کمان کر دہہ کہا کر فارسی بھنگاراکر، مجھ سے مہندی کی چندی سن۔ ایک غلیل حضور نے دینی  
کی ہے۔ ایک علی اصغر خاں سے اٹھئی، دونوں کل آئیں گی۔ مرزا نعیم بیگ بن مرزا کریم بیگ دو تین  
ہفتے سے یہاں وار و اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ نراد کی خدا نے تھپی فقیر پر کی، راحلہ  
وہ جائیں۔ فقط۔

۷ شعبان ۱۲۸۲ھ

۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

غالب

(۵۲)

میاں ! چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فوٹائش کی تھی۔ رام پور پہنچ کر وہ بے بسی و تلامش

ہاتھ اُگتی، بنوارکھی۔ لڑکوں نے ملازموں نے سب نے مجھ سے سن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتے پہلے تم نے غلیل مانگی، بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی، کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپیے تک مول کو نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی، تو شہ خانے میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتار لگا، دوڑا ہوا گیا۔ کچھی موجود پائی۔ لیکن کیا کچھی؟ جیسے نجف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمھاری ہڈی بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج لی، کل چل دیا اس بانس کی قدر کرنا اور اس کو اچھی طرح بنوا لینا۔ بادشاہ فرخ سیر اور اس کے اخوان خوش و خرم ہیں۔ فرخ سیر کی ماں نے باجرے کا حلوہ سوہن کھلایا۔

شعبہ ۲۵ شعبان ۱۲۸۲ھ

۱۴ جنوری ۱۸۶۶ء

نجات کا طالب۔ غالب

(۵۳)

میاں!

مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔

ضمناً ذکر ایک مدبر کا لکھا جاتا ہے جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے، سب سچ ہیں۔ احمق، غبیث، نفیس، حاسد، طبیعت بری، بکھر بری، قسمت بُری، ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھاتیں۔ ایک بار بنارس کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔ میں نے جو تمہیں اس کے باب میں لکھا تھا، وجہ اس کی یہ تھی کہ میں نے سنا تھا کہ تم نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا ہے یا کہا چاہتے ہو کہ اس کو بازار میں بے حرمت کریں۔ یہ خلاف شیوہ مومنین ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ قصد نہ کرنا۔ یہ موید اس قول کا ہے جو میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ تم یوں تصور کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں۔

غالب

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کے بعد



خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے  
 پیسے بارہ تاب اور آم کھائیں  
 سر آغاز موسم میں اندھے میں ہم  
 کہ دلی کو چھوڑیں ، لوہارو کو جائیں  
 سواناج کے جو ہے مقلوب جاں  
 نہ وال آم پائیں ، نہ انگور پائیں  
 ہوا حکم باور چیلوں کو کہ ہاں  
 ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں  
 وہ کھٹے ، کہاں پائیں ، اٹلی کے پھول  
 وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں  
 فقط گوشت ، سو بھیر کا ریشہ دار  
 کہو ، اس کو ، کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

## قطعه

خوانی بہ سوے خویش و ندانی کہ مردہ ام  
 دانی کہ مردہ را رہ و رسم خرام نیست  
 نے شیخ سدوام ، نہ الہ بخش ، مرگ من  
 انہ عالم جنابت و مرگ حرام نیست

(۵۵)

اقبال نشان و اماشان صدرہ عزیز تر از جان امیرزا علاء الدین خان کو دعائے درویشانہ  
 غالب دیوانہ پہنچے سال نگارش نکو بار ہوگا میں نے دبستان فارسی  
 انکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سچل لکھ دیا اب جو  
 چار کم اتنے برس کے عمر ہوئے اور جانا کہ شاید میری زندگی برسوں کیا  
 بلکہ مہینوں کی گنتی نہیں رہے کلام ہے جو مہینوں شاید بارہ مہینوں کو  
 ایک برس کہتی ہیں اور حیوں ورنہ چار مہینوں پانچ سات ہفتے دس  
 بیس دن کے بات رہ گئی ہے اپنی ثبات حواس میں اپنی دستخط  
 سے یہ توفیق نکو لکھ دیا ہوں ہر فن ارض میں نظا و نثر اتم میرزا جان  
 ہو جائیے میرزا جان والی نکو میرزا جان جانیں جس محل کو جانتی ہیں  
 وہاں نکو جانیں اور حسب طرح محکمانی ہتی نکو مانیں کل شے الگ  
 اللہ و جہہ ذو الجلال والاكرام یکشنبہ صفر ۱۲۸۱ شمسہ ہجری  
 دو روزہ

اقبال نشان و اماشان صدرہ عزیز تر از جان امیرزا علاء الدین خان کو دعائے درویشانہ  
 غالب دیوانہ پہنچے۔

سال نگارش تم کو یاد ہوگا۔ میں نے دبستان فارسی کا تم کو اپنا جانشین و خلیفہ قرار  
 دے کر ایک سچل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اتنی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں  
 کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور حیوں ورنہ دو چار  
 مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے ثبات حواس میں اپنے دستخط سے یہ

تو قیام کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظم و نثر اتم میرے جانشین ہو۔ چاہیے کہ میرے جانشین والے  
جیسا مجھ کو جانتے تھے، ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے، تم کو مانیں۔  
کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

یکشنبہ سلح مسفر ۱۳۸۵ھ

۲۱ جون ۱۸۶۸ء دہلی

(۵۶)

سعادت و اقبال نشان مرزا علاء الدین خان بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ کل شام کو  
مقدم مکہ۔ جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی بہ سواری ریل، مانند دولت و لخواہ کہ ناگاہ آوے، فقیر کے  
تیکے میں تشریف لائے۔ شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خاں کے مکان میں آرام فرمایا، اب وہاں  
آتے ہیں۔ قریب طلوع آفتاب، یہ چشم نیم باز، یہ رقعہ تمہارے نام لکھا ہے۔ جو کچھ جی چاہتا ہے، وہ  
مفصل نہیں لکھ سکتا۔ مختصر مفید آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر  
میلے کی سیر کو حاضر ہوا ہے۔ پس نور چشمانِ راحت جان مرزا باقر علی خاں بہادر و مرزا حسین علی خاں  
بہادر جناب آغا صاحب کا قدم بوس بجا لائیں اور ان کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت اور میری  
خوشنودی سمجھیں، بس۔

ہاں مرزا علانی اگر کرنل الکنز نڈر اسکنر بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا۔

غالب

(۵۷)

میاں !

میں تمہارے باپ کا تابع، تمہارا مطیع، فرخ مرزا کا فرماں بردار مگر ابھی اٹھا ہوں اپنے  
کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔ آج فرخ صاحب کے نام کا رقعہ پہنچ جائے گا۔ چھ جہز تمہارے  
دیئے ہوئے میر مہدی حسین صاحب کو دیئے اور باقی دن چڑھے، اعیان مطیع جمع ہو لیں تو



وہ اوراق بھی منگا دوں!

غالب

(۵۸)

صاحب!

بہت دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ آپ کا وکیل بڑا چرب زبان ہے مقدمہ اُس نے جیت لیا۔ چنانچہ اُس کی تحریر سے تم کو معلوم ہوا ہو گا۔ سنتا ہوں کہ حمزہ خاں کو ان دنوں علتِ مشائخ کا زور ہے اور سعدی کی اس بات پر عمل کرتے ہیں:

کسایں کہ یزدان پرستی کنند

بہ آوازہ دولا بستی کنند

خدا مبارک کرے۔

# متن کے مآخذ

اس باب میں پہلے تو خطوطِ غالب کے اُن مجموعوں، مختلف کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے، جنہیں متن کے مآخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ہر خط کا پہلا فقرہ نقل کیا گیا ہے۔ خط کی تاریخ تحریر دے کر اُس کے متن کے مآخذ کی نشان دہی کی گئی ہے اگر کسی خط کے متن کے مآخذ کے طور پر ایک سے زیادہ کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ پہلے مآخذ کے متن کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور باقی مآخذ سے متن کا موازنہ کیا گیا ہے۔

۱۔ خطوطِ غالب کے عکس۔

۲۔ معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۲ء (معارف)

۳۔ اُردوئے معلیٰ، مطبع اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء (اُردوئے معلیٰ)

۴۔ عودِ ہندی، مطبعِ مجتہائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء (عودِ اول)

۵۔ عودِ ہندی، مطبعِ مجتہائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء (عودِ ہندی کاری پرنٹ بھی ساتھ ہی چھپا)

تھیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ص ۳۶-۳۳ (عودِ دوم)

۶۔ اُردوئے معلیٰ، حصہ اول مع حصہ دوم، مطبعِ نامی مجتہائی، دہلی، ۱۸۹۹ء (اُردوئے معلیٰ)

(مجتہائی)

۷۔ تلاشِ غالب، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، دلی، ۱۹۶۹ء (تلاشِ غالب)

۸۔ نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر (نقوش، مکاتیب نمبر)

## مرزا ہرگوپال تفتہ

۱۔ صاحب! دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا، پہنچا۔

اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۹  
۱۸۴۷ء یا اس سے قبل

۲۔ مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۲)  
مئی ۱۸۴۸ء

۳۔ بھائی! یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے، فنِ تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۲۱)  
اگست ۱۸۵۰ء

۴۔ کیوں مہاراج! کول میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غسلِ خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۵)  
۴ جنوری ۱۸۵۲ء

۵۔ شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۶)  
۲۱ فروری ۱۸۵۳ء

۶۔ بندہ پرور! "بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے۔

(اصل خط)  
۲۲ مارچ ۱۸۵۳ء

۷۔ کاشانہ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ، تحریر میں کیا کیا سحرِ ترانیاں کرتے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۶)  
۱۸ جون ۱۸۵۳ء



۸۔ کل تمھارا خط آیا۔ رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۳) ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء

۹۔ صاحب! دیکھو! پھر تم دننگا کرتے ہو۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲ ص ۳۸) ۱۸۵۲ء

۱۰۔ واہ! کیا خوبی قسمت ہے میری۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲ ص ۱۵) ۱۸۵۲ء

۱۱۔ بھائی! پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط جاتی جی کا لایا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۵) ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء

۱۲۔ بھائی! آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سرائیکی میں لکھتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۰) ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

۱۳۔ پرسوں تمھارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۵) دسمبر ۱۸۵۲ء

۱۴۔ آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک خانہ کا ہرکارہ آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۵) ۶ اپریل ۱۸۵۳ء

۱۵۔ بھائی! ہاں میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحب مر گئیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۷) اپریل ۱۸۵۳ء

۱۶۔ بھائی! تم نے مجھے کوڑا دو چار سو روپیے کا نوکر یا پنسن دار قرار دیا ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۲) ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء

۱۷۔ عجب تماشا ہے، بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہر دیوسنگہ آگیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۸) ۵ جون ۱۸۵۳ء

۱۸۔ تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۶)

۹ جون ۱۸۵۳ء

۱۹۔ بھائی! جس دن تم کو خط بھیجا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۷)

۱۴ جون ۱۸۵۳ء

۲۰۔ بھائی! میں نے مانا تمھاری شاعری کو۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۰)

۲۱ اگست ۱۸۵۳ء

۲۱۔ میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔

(اردوئے معلیٰ مجتبائی حصہ ۲ ص ۳۷)

اکتوبر ۱۸۵۳ء

۲۲۔ "ویدمست" یہ لفظ نیا بنایا ہے۔

(اردوئے معلیٰ مجتبائی حصہ ۲ ص ۲۸)

۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء

۲۳۔ بندہ پرور! ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا۔

۲۳ فروری ۱۸۵۴ء

(اردوئے معلیٰ ص ۷۰)

۲۴۔ نشی صاحب! تمھارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا۔

۲ مارچ ۱۸۵۴ء

(اردوئے معلیٰ ص ۷۸)

۲۵۔ شفیق میرے لالہ ہر گویا لطف میرا قصور معاف کریں۔

جون ۱۸۵۴ء

(تلاش غالب ص ۸۵)

۲۶۔ میرا سلام پہنچے، خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔

جولائی ۱۸۵۴ء

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۹)

۲۷۔ صاحب! دیبا چہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان

کا لکھ لینا۔

اپریل، مئی ۱۸۵۵ء

(اردوئے معلیٰ مجتبائی حصہ ۲ ص ۲۸)

۲۸۔ تمھارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۳)

قبل ۱۸۵۵ء

۲۹۔ صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیسا ہے اور کیا واقع ہوا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۸)

۵ دسمبر ۱۸۵۴ء

۳۰۔ آج سینچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۰)

۳۰ جنوری ۱۸۵۵ء

۳۱۔ از عمر و دولت برخوردار باشند۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۵)

۳ فروری ۱۸۵۵ء

۳۲۔ صاحب! تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۴)

۵ مارچ ۱۸۵۵ء

۳۳۔ جان من و جان من! کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۷)

۶ مارچ ۱۸۵۵ء

۳۴۔ صاحب! تمھاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفریں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۵)

۱۲ مارچ ۱۸۵۵ء

۳۵۔ صاحب! کیوں مجھے یاد کیا۔ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۸)

۱۲ اپریل ۱۸۵۵ء

۳۶۔ مرزا تقیہ! عجب اتفاق ہوا۔ پنجشنبہ کے دن ۲۲ اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال

کر آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۳)

۲۵ اپریل ۱۸۵۵ء

۳۷۔ صاحب! پچیس اپریل کو ایک خط اور ایک پائل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۵)

۳۰ اپریل ۱۸۵۵ء



۳۸۔ بھائی! وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۶)

۲۴ مئی ۱۸۵۸ء

۳۹۔ کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟

(اردوئے معلیٰ ص ۷۳)

۱۹ جون ۱۸۵۸ء

۴۰۔ جیتے رہو اور خوش رہو۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۴)

۲۶ جون ۱۸۵۸ء

۴۱۔ مرزا آفتہ کو دعا پہنچے۔ بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟

(اردوئے معلیٰ ص ۸۷)

۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

۴۲۔ مرزا آفتہ! کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ 'وہ جو خط بانٹا کرتا ہے آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۸)

۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء

۴۳۔ رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

(اردوئے معلیٰ ص ۱۲۳ عود اول ص ۹۹)

جون جولائی ۱۸۵۸ء

عود دوم ص ۹۹)

۴۴۔ مرزا آفتہ! تمہارے اوراقِ ثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں پندرہ اگست کو۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۸)

۱۷ اگست ۱۸۵۸ء

۴۵۔ صاحب! عجب اتفاق ہے۔ آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط جاگیر کے گاؤں

کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۶)

۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

۴۶۔ نورِ نظر و نختِ جگر مرزا آفتہ! تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم۔ الخ

(اردوئے معلیٰ ص ۹۱)

۲۸ اگست ۱۸۵۸ء

۴۷۔ بھائی! تمہارا وہ خط جس میں اوراقِ ثنوی ملفوف تھے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۶)

اگست ۱۸۵۸ء

۴۸۔ صاحب! عجب تماشا ہے۔ تمہارے کہنے سے غشی شیونرین صاحب کو خط لکھا تھا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۲۱) ۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

۴۹۔ اللہ الشکر، تمہارا خط آیا اور دل سودا زدہ نے آرام پایا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۰) ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۰۔ مرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ دونوں فقرے جس محل پر بتائے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۲) ۳-۶ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۱۔ مشفق میرے کرم فرما میرے! تمہارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۳) ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۲۔ اچھا میرا بھائی "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں۔ سب بد لواڈا لٹا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۲) ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۳۔ بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہتہ کو ہے، مکالمہ ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۸) ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۴۔ بھائی! آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب

کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۱) ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۵۔ صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مہج نے مجھ کو بھی دی ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۷) ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۶۔ کیوں صاحب! اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۲۰) ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۷۔ اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمہارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۷) ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۸۔ کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۴)

۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۹۔ آج پنجشنبہ کے دن اٹھارہ نومبر کو تمہارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔

(۱ اردوئے معلیٰ ص ۷۰)

۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء

۶۰۔ بر خوردار! تمہارا خط پہنچا۔ اصلاحی غزل کی رسید معلوم ہوئی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۵)

۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

۶۱۔ میرزا تفتہ تمہارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۲)

۲۴ نومبر ۱۸۵۸ء

۶۲۔ صاحب! تمہارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۵)

۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

۶۳۔ کیوں صاحب! روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟

(اردوئے معلیٰ ص ۸۱)

۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

۶۴۔ دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۶)

۳ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۵۔ صاحب! تمہارا خط مع رقعہ مردِ سخن فہم پہنچا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۸)

۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۶۔ صاحب! میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۴)

۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۷۔ صاحب! تم تو اچھے خاصے عارف ہو۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۷)

۱۹ فروری ۱۸۵۹ء



۶۸۔ صاحب! تمہارا خط آیا، دل خوش ہوا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۹) ۲۷ فروری ۱۸۵۹ء

۶۸۔ اجی مرزا تفتہ، بھائی غشی نبی بخش کو تمہارے حال کی بڑی پرسش ہے۔

اردوئے معلیٰ کی بعد کی اشاعتوں میں یہ پیرا گراف "اجی مرزا تفتہ" الخ ایک الگ

خط بنا دیا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ خط نمبر ۶۸ (صاحب تمہارا خط آیا دل خوش

ہوا) الخ۔ کا آخری پیرا گراف ہے۔ اردوئے معلیٰ کی پہلی اشاعت میں یہ دونوں خط

ایک ہیں۔

۶۹۔ کیوں مرزا تفتہ، تم بے وفایا میں گنہ گار؟

(اردوئے معلیٰ ص ۹۰) ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء

۷۰۔ صاحب! آج تمہارا خط صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۷) ۵ جون ۱۸۵۹ء

۷۱۔ صاحب! ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ بر خوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۸) ۱۷ جون ۱۸۵۹ء

۷۲۔ صاحب! ایک خط تمہارا پرسوں آیا۔ اس میں مندرج کہ میں میرٹھ جاؤں گا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۱) ۲۹ جون ۱۸۵۹ء

۷۳۔ بھائی! تمہارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۵) ۸ اکتوبر ۱۸۵۸ء

۷۴۔ صاحب! تمہارا خط آیا، حال معلوم ہوا

(اردوئے معلیٰ ص ۹۶) ۵ نومبر ۱۸۵۹ء

۷۵۔ میری جان! کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہ وغالب کیوں کر بن جائیں۔؟

(اردوئے معلیٰ ص ۵۷) ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

۷۶۔ بھائی! میں نے دلی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۶) ۲۱ جنوری ۱۸۵۸ء

۷۷۔ صاحب! تمہارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلی اور دلی سے رام پور پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۳۵) اوائل فروری ۱۸۶۰ء

۷۸۔ میری جان! آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۳) ۱۳ فروری ۱۸۶۰ء

۷۹۔ برنخوردار! سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۶) ۱ مارچ ۱۸۶۰ء

۸۰۔ مرزا تفتہ! اس غمزدگی میں مجھ کو ہستانا تمہارا ہی کام ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۵۳) ۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء

۸۱۔ مرزا تفتہ! ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۵) ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء

۸۲۔ بھائی! آج اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۰) ۶ مئی ۱۸۶۰ء

۸۳۔ برنخوردار مرزا تفتہ! دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔

(اردوئے معلیٰ ص ۷۴) ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

۸۴۔ مرزا تفتہ! کل تمہارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۴) ۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء

۸۵۔ صاحب! تمہارا خط میرٹھ سے آیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۸۵) ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

۸۶۔ اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈوبویا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۹) ۹ اپریل ۱۸۶۱ء

۸۷۔ میاں مرزا تقیہ! ہزار آفریں، کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ چشم بدو دور۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۲) ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

۸۸۔ مرزا تقیہ صاحب! اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۳۶) ۹ ستمبر ۱۸۶۱ء

۸۹۔ صاحب! گوہر! "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۷) ۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء

۹۰۔ "انگشتری" اور "خاتم" دونوں ایک ہیں۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۶) ستمبر ۱۸۶۱ء

۹۱۔ صاحب! قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۳۴) ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۱ء

۹۲۔ صاحب! یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۹) اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء

۹۳۔ تم کو معلوم ہے کہ ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۳۲) اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء

۹۴۔ صاحب! دو زبانوں سے مرکب ہے۔ یہ فارسی متعارف۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۲) ۲۷ اگست ۱۸۶۲ء

۹۵۔ بھائی! "رہمیا" "وہیمیا" خرافات ہے۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۹) اگست ۱۸۶۲ء

۹۶۔ مرزا تقیہ! جو کچھ تم نے لکھا یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۹) ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء



۹۷۔ صاحب بندہ! میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۱) ۳ مارچ ۱۸۶۳ء

۹۸۔ لو صاحب! ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۲) اپریل ۱۸۶۳ء

۹۹۔ حضرت! آپ کے سب خط پہنچے سب قصیدے پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۱) ۳ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۰۔ حضرت! پرسوں صبح کو تمھارے سب کو اغذا ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر بھجوا دیے۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۰) ۵ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۱۔ مرزا آفندہ! یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۱) ۱۶ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۲۔ پسح ہے! اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۲) ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۳۔ صاحب! "کشیدن" کی جگہ "در کشیدن" بلکہ "بر کشیدن" کی جگہ "در کشیدن" نہ چاہیے۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۱) مارچ۔ ستمبر ۱۸۶۳ء

۱۰۴۔ نور چشم غالب! از خود رفته! مرزا آفندہ! خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۰) ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء

۱۰۵۔ صاحب! کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۹) ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء

۱۰۶۔ بھائی! تم پسح کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوتے ہیں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۴) ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۳ء

۱۰۷۔ منشی صاحب! میں سالِ گذشتہ بیمار تھا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۰)

۹ دسمبر ۱۸۶۴ء

۱۰۸۔ آؤ میرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ۔

(اردوئے معلیٰ ص ۶۳)

۱۲ دسمبر ۱۸۶۴ء

۱۰۹۔ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان منشی ہر گویاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۱۰)

۱۲ فروری ۱۸۶۵ء

۱۱۰۔ مرزا تفتہ کہ پیوستہ بہ دل بجا دارد

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۹)

فروری ۱۸۶۵ء

۱۱۱۔ مرزا تفتہ! پیر شو و بیاموز۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۱۹)

۱۴ مئی ۱۸۶۵ء

۱۱۲۔ صاحب! تم نے تن تن کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ نہ لکھا تھا۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۳۳)

آخر مئی ۱۸۶۵ء

۱۱۳۔ میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ! سخن دان۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۸)

۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء

۱۱۴۔ لہو صاحب! کھڑی کھائی دن بہائے۔ کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۱۰۸)

جنوری ۱۸۶۶ء

۱۱۵۔ مرزا تفتہ صاحب! پرسوں تمہارا دوسرا خط پہنچا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۹۳)

۱۸۶۶ء

۱۱۶۔ لا حول ولا قوۃ، کس ملعون نے بہ سببِ ذوق شعر، اشعار کی اصلا، منظور رکھی۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۳۲)

۱۱۷۔ میاں! تمہارے انتقالات ذہن نے مارا۔

(اردوئے معلیٰ مجتبیٰ حصہ ۲ ص ۲۴)

۱۱۸۔ صاحب! واقعی "سدا ب" کا ذکر کتبِ طبی میں بھی ہے اور غزنی کے ہاں بھی ہے۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۶)

۱۱۹۔ حضرت! اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۲)

۱۲۰۔ مرزا تقیہ! کیا کہنا ہے، نہ ظہیر کا پیتا نہ غالب کا۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۲)

۱۲۱۔ میاں! سنو اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۲۵)

۱۲۲۔ دل بے دغا دار بود، نماند

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۳۶)

۱۲۳۔ حضرت! اس غزل میں پروانہ و پیما نہ و ثبت خانہ تین قافیے آہلی ہیں۔

(اردوئے معلیٰ مجتہائی حصہ ۲، ص ۴۱)

## نواب علار الدین خاں علانی

۱۔ مرزا نسیمی کو دعا پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۱۰)

۱۸۵۸ء

۲۔ آج بدھ کے دن ستائیس رمضان کو پہرہ دن چڑھے کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر

آیا تھا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۸ء

(اردوئے معلیٰ ص ۴۳۴)

۳۔ خاک نمناکم و تو باد بہار

(اردوئے معلیٰ ص ۴۲۵)

۲۳ اگست ۱۸۵۸ء



- ۴۔ سبحان اللہ! ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۳۵) ۲ جولائی ۱۸۶۰ء
- ۵۔ صاحب! میری داستان سنئے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۰۲) ۸ جون ۱۸۶۰ء
- ۶۔ مولانا نسیمی! کیوں خفا ہوتے ہو؟  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۱۷) ۴ اپریل ۱۸۶۱ء
- ۷۔ میری جان! تخلص تمھارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۱۲) ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء
- ۸۔ میری جان علانی! ہمہ دان! اس دفعہ دخل مقدر کا کیا کہنا ہے۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۰۷) ۱ جون ۱۸۶۱ء
- ۹۔ جانِ غالب! یاد آتا ہے کہ تمھارے علم نامدار سے سنا تھا۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۸۔ عود اول و عود دوم ص ۶۹) جون ۱۸۶۱ء
- ۱۰۔ علانی مولائی! اس وقت تمھارا خط پہنچا۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۰۳) ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء
- ۱۱۔ صاحب! آگ بستی ہے۔ کیوں کہ آگ میں گر پڑوں۔ ہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو۔  
(اصل خط) ۳ ستمبر ۱۸۶۱ء
- ۱۲۔ میری جان! کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۲۴) ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء
- ۱۳۔ آج جس وقت کہ میں روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۸) ۱۲ نومبر ۱۸۶۱ء
- ۱۴۔ مرزا علانی! پہلے استاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۱۴) جنوری فروری ۱۸۶۲ء

۱۵۔ صاحب! صبح جمعے کو میں نے تم کو خط لکھا۔ اسی وقت بھیج دیا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۲۱) ۹ فروری ۱۸۶۲ء

۱۶۔ ”نیر اصغر“ سپہر سخن سرائی مولانا علانی کے خاطر نشان و دل نشین ہو۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۲۸) ۱۵ فروری ۱۸۶۲ء

۱۷۔ صاحب! کل تمہارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۳۰) ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء

۱۸۔ صاحب! پرسوں تمہارا خط آیا۔ کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۱۴) ۱ مارچ ۱۸۶۲ء

۱۹۔ صاحب! میرا برادر عالی قدر اور تمہارا والد ماجد اب اچھا ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۳۶) ۷ مارچ ۱۸۶۲ء

۲۰۔ یار بھتیجے، گویا بھائی مولانا علانی۔ خدا کی دہائی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۱۰) ۱۹ جون ۱۸۶۲ء

۲۱۔ جانِ غالب! دو خط تمہارے متواتر پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۱۶) ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء

۲۲۔ صاحب! پرسوں تمہارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۱۹) ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء

۲۳۔ میری جان! سن، پنجشنبہ، پنجشنبہ آٹھ جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، ایک مژہ برہمزدن مینہ نہیں تھا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۲۲) ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

۲۴۔ مولانا علانی! نہ مجھے خوف مرگ نہ دعویٰ صبر ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۲۳۸) ۶ اگست ۱۸۶۲ء

۲۵۔ جانِ غالب ! مگر جسم سے نکلی ہوئی جان ۔

( اردوئے معلیٰ ص ۴۳۹ )

۹ ستمبر ۱۸۶۲ء

۲۶۔ میاں ! تم میرے ساتھ وہ معاملے کرنے ہو جو احیاء سے مرسوم و معمول ہیں ۔

اوائل مارچ ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۱۲ )

۲۷۔ اقبالِ نشانہ ! بخیر و عافیت و فتح و نصرت لو ہارو پہنچنا مبارک ہو ۔

اپریل مئی ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۳۹۸ )

۲۸۔ ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک ۔

اپریل مئی ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۲۳ )

۲۹۔ لَا مُؤْجِدَ إِلَّا اللَّهُ

۳۰ مئی ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۲۸ )

۳۰۔ بد است مرگ ، ولے بد ترا ز گمان تو نیست ۔

۱۱ جون ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۲۹ )

۳۱۔ میری جان ! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے ۔

۲۱ جون ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۰۸ )

۳۲۔ صاحب ! میں ازکار رفتہ و در ماتہ ہوں ۔

۳ جولائی ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۲۲ )

۳۳۔ جاننا عالی شانہ ! پہلے خط اور پھر بہ توسط بر خوردار علی حسین خاں مجلد کلیات فارسی پہنچے ۔

۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۲۶ )

۳۴۔ اقبالِ نشانہ مرزا علاء الدین خاں بہادر کو غالب گوشہ نشین کی دعا پہنچے ۔

۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

( اردوئے معلیٰ ص ۴۰۵ )



۳۵۔ مولانا علائی! واللہ، علی حسین خاں کا بیان بہ مقتضائے محبت تھا۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۳۳) ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

۳۶۔ علائی مولائی کو غالب طالب کی دعا۔ بے چارے مرزا کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۲۸) ۱ جنوری ۱۸۶۴ء

۳۷۔ میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۲۶) ۱۸ مئی ۱۸۶۳ء

۳۸۔ اے میری جان! مثنوی "ابر گہر بار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۲۷) ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء

۳۹۔ علائی مولائی! غالب کو اپنا دعا گو اور خیر خواہ تصور کریں۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۲۰) ۱ جولائی ۱۸۶۴ء

۴۰۔ اجی مولانا علائی! نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۳۲) ۱۷ ستمبر ۱۸۶۳ء

۴۱۔ مرزا علائی مولائی! نہ لاہور سے خط لکھنا نہ لوہارو سے۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۲۶) ۳ نومبر ۱۸۶۳ء

۴۲۔ میری جان! تمہارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۰۶) ۹ دسمبر ۱۸۶۳ء

۴۳۔ لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۱۷) ۵ جنوری ۱۸۶۵ء

۴۴۔ میری جان! بنا سازی روزگار و بے ربطی اطوار۔

(اردوئے معلّیٰ ص ۳۱۹) جنوری ۱۸۶۵ء

۴۵۔ میری جان! نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔

(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۶) ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

۴۶۔ صاحب! کل تمہارا خط پہنچا۔ آج اس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۰۶) ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء

۴۷۔ شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فساد۔

(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۵) یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء

۴۸۔ جانا عالی شان! خط پہنچا، حفظ اٹھایا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۴۰) ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

۴۹۔ مرزا! رو پر و یواز پہلو کا ڈمیرے سامنے بیٹھ جاؤ۔

(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۴) ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء

۵۰۔ صاحب تمہارا خط پہنچا، مطالب دل نشیں ہوئے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۳) ۲۲-۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

۵۱۔ جانا جانا! ایک میرا خط تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہوگا۔

(اردوئے معلیٰ ص ۳۹۶) ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

۵۲۔ میاں! چلتے وقت تمہارے چچا نے غیل کی فرمائش کی تھی۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۱۵) ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء

۵۳۔ میاں! مدعا اصل ان سطور کی تحریر سے یہ ہے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۳۲)

۵۴۔ خوشی ہے یہ آنے کی برسات میں

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۲ء - ۱۸۶۵ء - ۱۸۶۶ء)

غالب کی نادر تحریریں، ص ۸۵۔ نیچے عرشی پہلا ایڈیشن

۵۵۔ اقبال نشان والا شان صدرہ عزیز تر از جان، مرزا علاء الدین خاں کو دعائے درویشانہ  
غالب دیوانہ پہنچے۔

(اردوئے معلیٰ ص ۴۵۰)

۲۱ جون ۱۸۶۵ء

۵۶۔ سعادت و اقبال نشان مرزا علاء الدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۰۲)

۵۷۔ میاں میں تمہارے باپ کا تابع، تمہارا مطیع، فرخ مرزا کا فرماں بردار۔  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۴۸)

۵۸۔ صاحب! بہت دن سے تمہارا خط نہیں آیا  
(اردوئے معلیٰ ص ۴۱۳)



# حواشی

- ص ۱۵-۱ - فغان بے خبر، خواجہ غلام غوث خاں بے خیر، الہ آباد، ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۹
- ص ۳۰-۱ - خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ب ی ۲ - ایضاً، ص ۵
- ص ۵۰-۱ - خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، "نقل یا" بجائے "یا نقل"
- ص ۸۰-۲ - خطوطِ غالب، ص ط ی ۳ - ایضاً، ص وی
- ص ۹۰-۱ - آبِ حیات، محمد حسین آزاد، سر فراز پریس لکھنؤ، ص ۶۴۸
- ص ۱۰۳-۱ - آبِ حیات، ص ۶۲۵
- ص ۱۰۵
- ۱ - نو طرزِ مرصع، عطا حسین تھتین، مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی، الہ آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۶۵
- ۲ - باغ و بہار، میرامن دہلوی، مکتبہ ۱۹۰۴ء، ص ۱۵
- ص ۱۰۶
- ۱ - باغ و بہار، ص ۱۱
- ص ۱۰۷
- ۱ - فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، لکھنؤ (نول کشور) ۱۹۸۳ء، ص ۱۴-۱۳
- ۲ - ایضاً، ص ۱۵

۱۔ یادگار غالب، مولانا الطاف حسین حالی، کانپور ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۱

۱۔ غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، (طبع اول) ص ۱۷۱

۲۔ غالب شناسی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری

۱۔ ڈاکٹر معین الرحمن غالب اور انقلاب ستاون، ص ۱۹۷

۱۔ دیوان غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ۱۸۶۵ء، ص ۶۳

۲۔ پنج آہنگ، ص ۶۳

۱۔ پنج آہنگ، ص ۱۳۵

۱۔ العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۷

۱۔ حالی نے عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے ساتویں خط سے یہ اقتباس لیا ہے۔

۲۔ رسا ہمدانی نے ”نادر خطوط غالب“ کے نام سے ایک مجموعہ چھاپا تھا، جس میں ان کے پردادا سید کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام غالب کے ۲۳ خطوط ہیں۔ یکم جنوری ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں بقول ان کے غالب لکھتے ہیں:

”شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے، جو میں تمہیں اردو زبان میں

لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔ پیرانہ سالی اور

ضعف کے صدموں سے محنت پڑ رہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔“ (نادر

خطوط غالب، لکھنؤ، ۱۹۳۹ء، ص ۱۲۳) یہ خط جعلی ہے۔ رسا ہمدانی نے حالی کے اس

بیان کو اس خط کی بنیاد بنایا ہے، بلکہ بعض پورے فقرے چُرا لیے ہیں۔ قاضی عبدالودود نے پہلی بار ان خطوط کے جعل کا انکشاف کیا تھا۔ (ندیم، گیارہ جنوری ۱۹۴۳ء)

۳۔ یادگار غالب، ص ۱۷۴

ص ۱۷۰

۱۔ حالی کے اس بیان پر پہلی بار غلام رسول قہر نے اعتراض کیا تھا۔ ملاحظہ ہو :

غالب، لاہور، طبع چہارم، ص ۳۹۶

ص ۱۲۱ ۱۔ العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۷۹

ص ۱۳۵ ۱۔ محمد حسین ہیکل، عمر فاروق اعظم، مترجم حبیب اشعر، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۱۵۱-۱۵۰

ص ۱۳۵ ۱۔ بین الاقوامی سیمینار، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۲

ص ۱۴۶ ۱۔ مکتبہ غالب، چھٹا ایڈیشن، رام پور، ص ۶۱

ص ۲۳۳

۱۔ خطوط غالب، مرتبہ مولوی ہمیش میں تفتہ کے نام ۱۲۴ خط ہیں۔ ان میں ایک تو مرزا قاسم علی قہر کے نام کا

خط : ”بھائی صاحب، ۳۳ کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار نشی شیونرائن کی الخ“ شامل ہو گیا ہے اور دوسرے

مولوی ہمیش نے خط ۶ کے آخری پیرا گراف کو ایک علیحدہ خط تسلیم کیا ہے۔ ”ارودے محلّی“ کے بعد کے

ایڈیشنوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہے، لیکن ارودے محلّی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں یہ خط ”۶ کا آخری

پیرا گراف ہے“ اس لیے اُسے علیحدہ خط تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ گویا تفتہ کے نام کل ۱۲۲ خط رہ

گئے۔ ایک خط ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے دریافت کیا۔ اس طرح تفتہ کے نام غالب کے خطوط کی کل

تعداد ۱۲۳ ہو گئی۔

ص ۲۳۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ اس خط میں غالب نے تفتہ کے تعین اشعار پر اصلاح دی ہے۔ میرے

پیش نظر تفتہ کے پہلے دیوان کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے اور ”م“ کی ردیف تک کا کلام موجود

ہے۔ پوری کوشش کے باوجود تفتہ کے دیوان اول کا مکمل مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا اس لیے یہ

کہنا مشکل ہے کہ جس شعر کا یہ مصرعہ ہے ”خار باد را ہش افشام کہ چوں خواہد شدن“ اس میں ہے



یا نہیں۔ باقی دونوں شرجن پر غالب نے اس خط میں اصلاح دی ہے موجود ہیں۔ دیوان کی طباعت کا اعلان اواخر ۱۸۴۷ء میں کیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۸۴۸ء میں دیوان طباعت کی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ (صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۵۱) اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ۱۸۴۷ء کے اواخر سے قبل ہی یہ دیوان مرتب ہو چکا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ خط اواخر ۱۸۴۷ء سے قبل کتبہ ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ غالب نے دونوں اشعار پر جو اصلاح دی ہے وہ تفتہ نے قبول نہیں کی۔ اس کا امکان کم ہے کہ تفتہ نے پہلے غزلیں چھاپیں اور پھر اصلاح کے لیے بھیجیں۔

۲۔ غالب نے حقیر کے نام ایک خط میں اس دیباچہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ”بہر حال اس گفتگو میں منشی صاحب (تفتہ) نے ایک فقرہ اپنی مدح میں بڑھوایا یعنی سپہر سخن را ماہِ دو ہفتہ“ یہاں اسی فقرے کا ذکر ہے۔

ص ۲۳۷

۱۔ اردو معنی ”جانے گئے“۔

۲۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے اس خط میں وہی دو باتیں لکھی ہیں جو انھوں نے ۳ جون ۱۸۴۸ء کے خط میں حقیر کو لکھی تھیں (نادرات غالب ص ۲) ایک تو تفتہ کے دیوان اول کے دیباچے میں ایک فقرے کے اضافے کی بات اور دوسرے پانی کو مدبر کرنے کی ترکیب۔ اس لیے غالب نے تفتہ کے نام یہ خط مئی ۱۸۴۸ء میں لکھا ہو گا۔ دیوان کے ساتھ چھپنے سے پہلے یہ تقریظ اسد الاخبار (اگرہ) کے ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جس کی بنیاد پر مولوی ہمیش پرشاد نے اس خط کی تاریخ تحریر اگست ۱۸۴۹ء متعین کی تھی۔ مولوی ہمیش پرشاد کے مرتبہ خطوط غالب ۱۸۴۹ء میں اور آفاق حسین آفاق کی مرتبہ ”نادرات غالب ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی تھی، اس لیے حقیر کے نام غالب کا مذکورہ خط مولوی صاحب کی نظر سے نہیں گزر سکا۔

ص ۲۳۸

۱۔ مجتہا کی جڑ سے ”ندارد“۔

۲۔ منشی صاحب سے مراد ہے منشی نبی بخش حقیر۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مولوی ہمیش نے اگست ۱۸۵۰ء تجویز کی ہے اور کوئی دلیل پیش نہیں

کی۔ خط میں غالب نے لکھا ہے: ”جب تمہارا دیوان چھاپا جائے گا۔ یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا۔“  
 مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں کہ وہ قطعہ جس کا ذکر اس خط میں ہے دیوانِ تفتہ میں ہے اور ۱۸۵۵ء  
 کا لکھا ہوا ہے۔ (اعلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۸۳) اس صورت میں امکان یہی ہے  
 کہ یہ خط اگست ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہو۔ قاضی عبدالودود اس تاریخ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:  
 ”خط ۲ (یعنی خط زیر بحث) کا زمانہ کتابت جو ہمیش پرشاد نے معین کیا ہے، صحیح معلوم ہوتا ہے اس کی  
 صحت میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا، بے جا ثابت ہوا۔ (معاصر، جولائی ۱۹۶۹ء، جلد ۸، ص ۱۷۱)

ص ۲۴۲

۱۔ ”کوئی“ سے مراد کوئی ایسا شخص ہے جو کوئی یعنی علی گڑھ کا رہنے والا تھا۔

ص ۲۴۳

۱۔ اس مطلع کے بارے میں غالب نے ۳ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک فارسی خط میں تفتہ کو لکھا تھا: ”زندگانی ہا“  
 اور ”جانفشانی ہا“ قافیہ والا مطلع اگرچہ ہم نے قلم زد کر دیا تھا لیکن ایک ایسا دوسرا مطلع لکھ دیا ہے۔  
 جس سے ظہوری کی روح خوش ہو جائے گی۔

رایگاں است زندگانی ہا  
 می تو اں کرد جانفشانی ہا  
 کس چہ نازد بہ جانفشانی ہا

آخری دو مصرعوں میں سے جو پسند آئے اُسے مصرع ثانی بنالیں۔ (بابغ دو در ص ۱۶۰-۱۶۱)

۲۔ غالب نے ”سہرٹ“ لکھا ہے جو سہو قلم معلوم ہوتا ہے، کیوں اصل لفظ ”سورٹھ“ ہے۔ ہندی میں  
 یہ ایک راگنی کا نام ہے۔

ص ۲۴۴

۱۔ غالب نے ”ماند“ لکھا ہے، یہ سہو قلم ہے۔

۲۔ ۲۴ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک فارسی خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا ہے: ”کالے صاحب کی وفات  
 کے بعد اس گھر کے درو دیوار نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ (یعنی وہاں کے لوگوں سے بھی نہیں) میں نے  
 کو پھیلیماران میں ایک گھر لے لیا ہے۔ امید ہے کہ اس گھر سے میری لاش ہی نکلے گی“ (بابغ دو در ص ۱۶۱)

۱۔ تفتہ بھرت پور ریاست میں ملازم ہو گئے تھے۔ قوی امکان ہے کہ یہ نوکری جانی بہاری لال راضی کے توسط سے ملی تھی۔ کچھ عرصے بعد تفتہ کے راضی سے اختلافات ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ تفتہ نے ملازمت چھوڑ دی۔ غالب اسی واقعے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

۲۔ جے پور کے بارے میں غالب نے تفتہ کو لکھا تھا: "جے پور کے میرے ایک مخلص دوست نے مجھے لکھا تھا کہ تمہارا جو کلام اخبارِ سلطانی (غالب کی مراد غالباً "سراج الاخبار" سے ہے جو قلعہ معلیٰ سے شائع ہوتا تھا) میں شائع ہوتا ہے۔ وہ جواں دولت، جواں سال راجا (راجا جے پور) کی نظر سے گزرا ہے ہے اور راجا کو بہت پسند آتا ہے اور تمہارے بہت مشتاق ہیں۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں اس معاملے میں اپنوں اور بیگانوں سے کوئی مضائقہ نہیں کرتا تو پھر راجا جے پور سے کیوں مضائقہ کروں؟ اس کے بعد غالب نے تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح انھوں نے جانی بہاری لال کے توسط سے راجا کی خدمت میں اپنا دیوان پیش کیا۔ (باغِ دو در، ص ۱۶۳-۱۶۴) اس دیوان پر راجا نے غالب کو پانچ سو روپے کا عطیہ دیا تھا۔

۳۔ "اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا ذہبا لگ گیا ہے۔" یہ اشارہ غالباً حادثہ اسیری کی طرف ہے۔ غالب نے اپنے گھر پر قمار خانہ قائم کر رکھا تھا اور اس الزام میں دوبار گرفتار ہوئے تھے۔ پہلی بار ۱۸۴۱ء میں۔ اس دفعہ سو سو روپے جرمانہ ادا کر کے نجات پالی۔ دوسری بار وہ ۲۵ مئی ۱۸۴۱ء کو گرفتار ہوئے اور اس دفعہ دو سو روپے جرمانہ اور چھ مہینے قید کی سزا ہوئی۔ غالب کئی مہینے جیل میں رہے۔ ڈاکٹر اس سول سرجن کی مداخلت سے اس مدت میں کچھ تخفیف ہو گئی تھی۔ ملاحظہ ہو :

۴۔ دہلی اردو اخبار، ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء (نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی)۔ قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، نواسے ادبِ بمبئی، اپریل ۱۹۵۸ء، حسن الاخبار بحوالہ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۴۴-۱۴۵۔ کلامِ عاصی، ص ۲۶۳۔ حادثہ اسیری کے واقعات اور یہ حوالے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تلاشِ غالب (لاہور، ص ۸۶-۸۸) سے نقل کیے گئے ہیں۔



ص ۲۴۷

- ۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی "خرج"
- ۲۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی "یا" بجائے "یائے"

ص ۲۴۸

- ۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے خط میں "میش ویشتر" کی بحث کی ہے۔ یہی گفتگو غالب نے تفتہ کے نام اردو خط مورخہ ۲ مارچ ۱۸۵۲ء اور فارسی خط ۲۴ مارچ ۱۸۵۲ء بارغ دورا ص ۲۶۱) میں بھی کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط غالباً ۱۸۵۲ء ہی کے کسی مہینے میں لکھا گیا ہے۔

ص ۲۵۱

- ۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اپنا دیوان راجا جے پور کی خدمت میں پیش ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کے خط میں تفتہ نے لکھا تھا کہ "صحافت کے ہاں سے ابھی دیوان نہیں آیا۔ آج کل آجائے پھر اس کے جزدان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۵۲ء کے اواخر میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۲۵۲

- ۱۔ بھرت پور کے راجا کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۵۳ء کو ہوا۔ اس وقت وارث راجا کی عمر تین سال تھی۔

FOREIGN DEPTT 145-151-8TH APRIL 1853

ص ۲۵۳

- ۱۔ اردوئے معلیٰ "پڈ"۔ نائب نے جہاں کہیں "پڈ" لکھا ہے میں نے اسے "پیڈ" کر دیا ہے۔
- ۲۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں نائب نے لکھا ہے: "راجا صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ راول جی نئے اجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں" یہی باتیں غالب نے ۱۷ مارچ ۱۸۵۳ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو ان الفاظ میں لکھی تھیں: "کتاب اور عرضی راجا صاحب کے پاس بھیجی ہے اور وہ خوش ہوئے۔ نئے اجنٹ کے آنے کا ہنگامہ تھا" وہ بھی ختم ہوا۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے" اس کا بہ ظاہر مطلب یہی ہے کہ یہ خط بھی ۱۷ مارچ ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا۔

۱۔ اردوئے معلیٰ "رانی مری"

۱۔ خطِ پرتاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ "راجا مرہا، رانی نہیں مری" یہ درست ہے، کیوں کہ راجا سے مراد بھرت پور کے راجا نریش بلونت سنگھ سے ہے، ان کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۵۲ء کو ہوا تھا۔ اس وقت دلی عہدِ راجا جسونت سنگھ تین برس کے تھے (ملاحظہ ہو: ہماری زبان، علیگڑھ ۸ نومبر اور ۱۵ نومبر ۱۹۶۱ء) غالب کے اس خط سے بھی دلی عہد کی عمر کی تائید ہوتی ہے۔ راجا کی بیماری اور وفات کا ذکر غالب نے پہلی بار ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء کے خط میں کیا ہے۔ پھر ۳ مئی ۱۸۵۳ء کے خط میں لکھا ہے: "کل راجا کے مرنے کی خبر سنی"۔ اس لیے یہ خط ۳ مئی ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔ غالب نے اس خط میں میا کھ کا بیٹا بتایا ہے۔ اس سال میا کھ اور مئی کے مہینوں میں بھی مطابقت تھی۔

۱۔ غالب اُس انکم ٹیکس کا ذکر کر رہے ہیں جو اُن کی پنشن پر لگتا تھا۔  
 ۲۔ اردوئے معلیٰ میں اس خط پر دو شنبہ ۳ مئی ۱۸۵۳ء کی تاریخ ہے تقویم کی رو سے ۳ مئی کو "دوشنبہ" نہیں "سہ شنبہ" ہے۔ مولوی ہمیش اور مالک رام صاحب نے "۳ مئی" کو "۲ مئی" کر دیا ہے۔ کاظم علی خاں صاحب نے اسے "۳ مئی" قرار دیا ہے۔ کاظم صاحب کی تجویز کردہ تاریخ درست معلوم ہوتی ہے۔ "۳ مئی" کو دوشنبہ تھا۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے: "منشی صاحب (حقیر) کا ایک خط ہاترس سے آیا تھا کل اُس کا جواب ہاترس کو روانہ کر چکا ہوں"۔ ۲۹ مئی کے خط میں غالب نے حقیر کو لکھا تھا: "یہ خیال کہ ابھی ہاترس سے نہ آئے ہوں" مانعِ تحریر رہا۔ اس عبارت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زیر بحث خط ۳ مئی کو لکھا گیا۔  
 ۳۔ اردوئے معلیٰ میں انیس ہے جب کہ غالب نے اس خط میں جو حساب لکھا ہے اس کی رو سے یہ رقم "انیس" ہوتی ہے۔ بظاہر یہ سہو کا تب ہے۔

۱۔ اردوئے معلیٰ میں تاریخ تحریر پنجشنبہ ۵ جون ۱۸۵۳ء ہے، لیکن ۵ جون کو پنجشنبہ نہیں یکشنبہ تھا۔

یہ بظاہر سہو کا تلبہ ہے۔

ص ۲۶۰

۱۔ غالب کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا چاہے پورے جو پاپے سو روپے ملنے والے تھے،  
تفتہ نے اُن میں سے کچھ روپے مانگے تھے۔

ص ۲۶۱

۱۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مولوی ہیش نے اس کا سبذ تحریر ۱۸۵۱ء میں کیا ہے جو  
درست نہیں معلوم ہوتا، اس خط میں غالب نے عطا اللہ خاں نامی کا ذکر کیا ہے۔ ان ہی عطا اللہ  
خاں نامی کا ذکر غالب نبی بخش حقیر کے نام خط مورخہ ۶ اکتوبر ۱۸۵۳ء میں کر چکے ہیں میرا خیال  
ہے کہ یہ خط اکتوبر ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۲۶۵

۱۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے یہ خط پہلی بار نقوش (لاہور) سالنامہ ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا تھا۔ پھر یہ  
خط ان کی کتاب "تلاش غالب" میں شامل ہوا۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ فاروقی صاحب  
نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ خط جون ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا تھا۔ مجھے ان کی رائے سے اتفاق ہے  
یہاں یہ خط "تلاش غالب" سے نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "مضان"

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے جولائی ۱۸۵۳ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے کہ: "بھائی!  
اب کے تہنیت عید میں دو قصیدے کس انداز کے لکھے ہیں کہ دیکھو گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ پرسوں یا  
اتر سوں روانہ کروں گا۔ ہر گویا صاحب کو بھی دکھا دیجے گا۔ تفتہ کے نام اس خط میں بھی دو  
قصیدوں اور حقیر کے نام خط کا ذکر ہے" اس لیے امکان یہی ہے کہ یہ خط جولائی ۱۸۵۳ء میں  
لکھا گیا۔

ص ۲۶۶

۱۔ یہ تفتہ کے دوسرے دیوان فارسی کا ذکر ہے۔ یہ دیوان ۱۸۵۴ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوا تھا۔  
۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے ۲۵ مئی ۱۸۵۵ء کو منشی نبی بخش حقیر کو لکھا تھا: "تفتہ، مجھ سے



خفا ہیں۔ حکم تھا کہ دیوان کا دیباچہ لکھ۔ میں نے کہا، صاحب! تم ہر سال ایک دیوان لکھو گے، میں دیباچہ کہاں تک لکھا کروں گا؟ "تفتہ" کے نام ہی خط ہے، جس کا غالب نے ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہ خط اپریل یا مئی ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ اس خط میں غالب نے بابو صاحب یعنی جانی بہاری لال کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے بابو صاحب کا ذکر مرزا ہرگوپال تفتہ اور سید بدرالدین احمد المعروف بہ فقیر کے خطوط میں بھی کیا ہے۔ خطوط غالب میں ان کا ذکر پہلی بار تفتہ کے نام خط مورخہ یکم فروری ۱۸۵۲ء میں اور آخری بار سید بدرالدین احمد المعروف بہ فقیر کے نام ۳ جنوری ۱۸۵۵ء کے خط میں آیا ہے، اس لیے میرا قیاس ہے کہ یہ خط ۱۸۵۵ء یا اس سے قبل لکھا گیا۔

ص ۲۶۸

۱۔ غالب کا یہ بیان درست نہیں کہ غدر کے دوران انھوں نے فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں دخل نہیں دیا۔ غالب غدر کے دوران کئی بار نہ صرف دربار میں حاضر ہوئے بلکہ انھوں نے کم سے کم تین قصیدے بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں پیش کیے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ ان کے خلاف "مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی"۔ ایک جاسوس گوری شنکر نے ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کو اطلاع دی تھی کہ غالب نے ایک سکہ کہہ کر ظفر کی نذر کیا ہے۔ گوری شنکر کی اس رپورٹ نے غالب کو کافی پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، غالب اور شاہانِ بکونہ ص ۷۹-۸۴۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے متن میں لکھی ہے۔

ص ۲۷۰ - ۱۔ اردوئے معلیٰ "اگر" - ۲۔ اردوئے معلیٰ "ہر ایک"۔ "ہر" نرائند۔

ص ۲۷۳

۱۔ اردوئے معلیٰ میں یہ ۱۲۵۸ء ہے۔ ظاہر ہے یہ سہو کا تب ہے۔

ص ۲۷۴

۱۔ اردوئے معلیٰ "سات"۔

۲۔ غالب نے یہ لفظ "جو درو تھیں ہے" وہی اُسے ہے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ غالب نے غشی نبی بخش حقیر کے نام خط مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال کیا

ہے۔ تفتہ کے نام خط میں غالب کا اشارہ تفتہ کے لڑکے کی وفات کی طرف ہے۔ ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء کے خط میں غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھا تھا: ”مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے۔ پتہ میرا سنو، اس کا لاڈ لا بیٹا مر گیا۔ ماں نے اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی۔“

ص ۲۷۶

۱۔ اردوئے معلیٰ ”ے“

۲۔ اردوئے معلیٰ ”صوت“

ص ۲۷۸

۱۔ اردوئے معلیٰ ”افسانہ عجائب“

۲۔ یہ شعر مصحفی کے شاگرد نور الاسلام منتظر کا ہے۔ سرور نے ”فسانہ عجائب“ میں دوسرا مصرع اس طرح لکھا ہے: ”یاد رکھنا تم فسانہ ہیں ہم لوگ۔“

۳۔ اس خط پر دن اور تاریخ ہے لیکن سنہ نہیں۔ خط میں غالب نے تفتہ کے اس فارسی دیوان کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۵۶ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اگرچہ دیوان پر سنہ اشاعت ۱۸۵۶ء ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ اوائل ۱۸۵۶ء میں چھپ کر تیار ہوا ہو۔ تفتہ کا پہلا دیوان ۱۸۵۱ء میں چھپا تھا لیکن ۱۸۵۱ء میں ۲۶ جون کو پنجشنبہ ہے ۱۸۵۶ء میں ۲۶ جون کو جمعہ ہے۔ اس لیے امکان یہی ہے کہ یہ خط ۱۸۵۶ء کا ہو۔ مولوی ہیش نے بھی اسے ۱۸۵۶ء کا تسلیم کیا ہے۔

ص ۲۷۹

۱۔ اردوئے معلیٰ ”شال“

ص ۲۸۰

۱۔ غود اول و دوم ”در نوائی“۔

۲۔ اردوئے معلیٰ ”پہلے تم کو“

۳۔ اردوئے معلیٰ، غود اول ”کہ“ ندارد۔

۴۔ غود اول و دوم ”پڑھ دینا“

۵۔ غود اول و دوم ”ہوں۔“

- ۶۔ عود اول "ہوا"  
 ۷۔ اردوئے معلیٰ کے "ندارد"  
 ۸۔ عود اول "زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالب"

ص ۲۸۱

۱۔ عود اول "انگریزی"

۲۔ عود دوم "اپنے"

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مولوی مہیش پرشاد نے جون ۱۸۵۸ء اور جولائی ۱۸۵۸ء کے درمیان خطوط میں اس خط کو ترتیب دیا ہے۔ یہ ظاہر یہ غلط نہیں معلوم ہوتا۔

ص ۲۸۲

۱۔ اردوئے معلیٰ "مگر"

ص ۲۸۳

۱۔ "شفیق" سے مراد غالباً غشی غلام غوث خاں ہے۔ غالب نے لفظ کے نام ۳ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھا ہے: "تم نے لکھا تھا کہ غشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا۔"  
 ۲۔ اردوئے معلیٰ میں بہ قرأت مطلع ہے۔ جب کہ اسے شعر ہونا چاہیے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ غالب سے ہوا ہے یا کاتب سے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "پوست"

۴۔ اردوئے معلیٰ "عیاش"

ص ۲۸۴

۱۔ اردوئے معلیٰ "مجھ پر اگر" "اگر" رائڈ

۲۔ اس خط پر غالب نے دن، تاریخ اور مہینہ لکھا ہے لیکن سہ نہیں لکھا۔ یہ ۱۸۵۸ء ہونا چاہیے۔ کیونکہ خط میں "دستینو" کی طباعت کا ذکر ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "اسی"



۳۔ غالب نے اکتوبر ۱۸۵۸ء کے خط میں میر مہدی بھٹو کو ”دستبنو“ کی طباعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ غشی امید سنگھ اندروالے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔۔۔۔۔ پچاس جلدیں غشی امید سنگھ نے لیں، پچیس روپیے چھاپے خانے میں یہ طریق ہندوی بھجوا دیے۔“

ص ۲۸۵

۱۔ اردوئے معلیٰ کے حاشیے پر ان الفاظ کے معنی اس طرح دیے گئے ہیں: افسر تاج۔ افسار پوزی۔ گرز، تاج۔ جادر گردش، تغیر حال۔

ص ۲۸۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے ”دستبنو“ کا مسودہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ اگست ۱۸۵۸ء کا ہے۔

ص ۲۸۸

۱۔ اردوئے معلیٰ میں دن اور مہینا تو ہے، سنہ نہیں۔ چوں کہ غالب نے ”دستبنو“ کا ذکر کیا ہے اس لیے یہ خط ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ ”ہجم“

ص ۲۸۹

۱۔ بھائی سے مراد منشی نبی بخش حقیر ہیں۔

ص ۲۹۰

۱۔ اردوئے معلیٰ ”نوا“

ص ۲۹۱

۱۔ مضمون بتا رہا ہے کہ یہ خط ۳ اور ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کے درمیان ہی لکھا گیا ہوگا۔

ص ۲۹۲

۱۔ اردوئے معلیٰ ”فرخچہ“، بجائے ”فرنج“

ص ۲۹۳

۱۔ اردوئے معلیٰ میں یہ قرائت ”چاہیں“ تھیں۔ مولوی مہیش نے بغیر اطلاع کے اس قرائت کو ”چاہی“ کر دیا ہے

میرے خیال سے "چاہیں" قرأت درست ہے۔

ص ۲۹۵

۱۔ اردوئے معلیٰ ستمبر "ندارد"

ص ۲۹۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر میں سنہ نہیں لکھا گیا۔ چوں کہ خط میں "دستبنو" کی جلد سازی کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے یہ ستمبر کا مہینہ اور ۱۲۵۸ھ ہے۔ اردوئے معلیٰ میں تاریخ جمعہ، ۷ ستمبر ہے۔ یہ درست نہیں، کیوں کہ ۷ ستمبر کو سہ شنبہ اور ۷ اکتوبر کو جمعہ ہے۔ اس لیے یہ تاریخ ۷ اکتوبر ہونی چاہیے۔  
۲۔ اردوئے معلیٰ "نوا"

ص ۲۹۷

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں مرزا حاتم علی تہر کے نام اس خط کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے نام آفتاب عالم باب جاری کرانے کی فرمائش کی تھی۔ غالب نے تہر کے نام مکتوب میں اسی خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: کل دو شنبے کا دن، ۲۰ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا۔ تفتہ کے اس زیر بحث خط میں غالب نے تہر کے نام اس خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے، شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب (تہر) کی خدمت میں بھیجا۔ اس کا مطلب ہے کہ تفتہ کے نام یہ خط ۲۰ ستمبر ۱۲۵۸ھ کو لکھا گیا۔"

ص ۳۰۲

۱۔ اردوئے معلیٰ "نوامیر"

۲۔ اردوئے معلیٰ "بھی"

ص ۳۰۳

۱۔ تاج گنج میں رہنے والوں سے مراد منشی نبی بخش حقیر اور ان کے صاحبزادے سے ہے۔ نہ جانے یہ دونوں کس الزام میں گرفتار ہوئے تھے۔ امکان یہی ہے کہ یہ بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوئے ہوں۔

ص ۳۰۶

۱۔ اردوئے معلیٰ "شنائی"

ص ۳۰۷

۱۔ اردوئے معلیٰ میں یہ تاریخ ۷ دسمبر ۱۸۵۸ء ہے جو بظاہر مسمو کا تب ہے، کیوں کہ تقویم کی رو سے ۷ دسمبر کو "سموار تہیں منگل" ہے۔ دسمبر کی "۲۷" کو البتہ سموار ہے اس لیے یہ خط ۲۷ دسمبر کو لکھا گیا ہوگا۔ یوں ہمیشہ سے اس قرأت کو درست کر دیا تھا، لیکن اس کی اطلاع نہیں دی۔

ص ۳۱۰

۱۔ اردوئے معلیٰ "لے"

ص ۱۱۱

۱۔ اردوئے معلیٰ "منگوائی"

۲۔ بعد کی اشاعتوں میں "اجی مرزا تفتہ.... ضرور لکھے گا" کو ایک الگ خط بنا دیا گیا ہے جو درست نہیں۔

ص ۳۱۳

۱۔ خط پر تاریخ ہے لیکن سنہ تحریر نہیں۔ خط میں رائے امید سنگھ اور تقویم کی مدد سے سنہ کا تعین کیا گیا ہے۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے شروع میں دی ہے۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "چھڑا"

ص ۳۱۶

۱۔ اردوئے معلیٰ "گر"

ص ۳۱۷

۱۔ اردوئے معلیٰ "نصحت"

ص ۳۱۹

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ تفتہ کے نام ۱۴ فروری ۱۸۶۱ء کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اوائل فروری ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا ہوگا، کیوں کہ دونوں خطوں میں تفتہ کو رام پور بلانے کا ذکر ہے۔

ص ۳۲۰

۱۔ اردوئے معلیٰ "چیر"



۱۔ اردوئے معلیٰ میں تاریخ تحریر میں ۱۸۶۲ء ہے جو درست نہیں۔ یہ ۱۸۶۱ء ہونا چاہیے۔ خود غالب نے خط میں اس سال کو ۱۲۷۷ء بتایا ہے جو تقویم کی رو سے ۱۸۶۱ء ہے۔ اس خط میں غالب نے سفرِ رام پور کا ذکر کیا ہے۔ رام پور کو غالب کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو روانہ ہوئے تھے اور ۲۴ مارچ کو دہلی واپس آئے تھے۔

۱۔ اردوئے معلیٰ میں تاریخ تحریر خط کے آغاز میں ہے۔ تقویم کی رو سے ۶ مئی "کو یکشنبہ" ہے۔

۱۔ اردوئے معلیٰ "کٹگر"

۲۔ اردوئے معلیٰ "لال کنوے"

۱۔ اردوئے معلیٰ، "کی کی" ایک "کی" زائد۔

۲۔ تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی گئی ہے اور ہجری اور عیسوی سنیں نہیں لکھے گئے۔ منشی نبی بخش کا انتقال ۱۲۷۷ء میں ہوا تھا اس لیے یہ ۱۲۷۷ء و ۱۸۶۱ء ہے۔ تقویم کی رو سے بھی یہی سنیں قرار پاتے ہیں۔

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر میں سنہ نہیں لکھا۔ خط میں تفتہ کی "سببالتاں" کی طباعت کا ذکر ہے۔ "سببالتاں" کے بارے میں غالب نے ۹ اپریل ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں تفتہ کو لکھا تھا: "سببالتاں" ایک معشوقِ خوب رو ہے، بد لباس ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔ یوں بھی ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء کو یکشنبہ تھا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "دونو"

۳۔ اردوئے معلیٰ "دونو"

۱۔ اس قصیدے کے بارے میں تاحی عبدود لکھتے ہیں: "غالب کے ایک خاص شاگرد میکش کی

رسائی لکھنؤ میں قطب الدولہ کے یہاں ہو گئی۔ غالب کو اس کا امکان نظر آیا کہ قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کر کے صلہ وصول کیا جائے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ کم از کم پانچ ہزار ملیں۔ چوں کہ خود صلے کی رقم مقرر کر دینا دستور نہیں انھوں نے یہ دکھانا چاہا کہ یہ دربار اودھ کا معمول ہے کہ مجھے قصیدے کا صلہ اس قدر ملے نصیر الدین حیدر کی مدح کے قصیدے کی نسبت قطب الدولہ کو لکھتے ہیں..... "از عہد اورنگ نشینی نصیر الدین حیدر..... بصیغہ مدح زلہ خوارخوان عطاے آن سلطنتہم۔ قصیدہ من بوسا....." اس روش الدولہ بہ پیشگاہ سلطان..... گزشتہ و پنج ہزار روپیہ مرحمت گشتہ" اس کے صراحتہ یہ معنی نکلتے ہیں کہ غالب نے صلہ پایا ورنہ زلہ خوارخوان عطا" مہمل ہو جاتا ہے۔ صلہ یابی کی امید منقطع ہونے لگی تو غالب نے عالم یاس میں مکتب کو لکھا کہ میری یہ قسمت کہاں کہ صلہ ملے "نصیر الدین حیدر مدح شفیق وزیر بخشید" روشن الدولہ ونشی محمد حسن پاک بخوردند و پیشیزی بمن نرسید" لیکن یہ بھی داستان محض ہے۔ نصیر الدین حیدر تک قصیدہ پہنچا ہی نہیں اس صورت میں صلے کا کیا سوال ہے۔ کلیات کے ایک سے زیادہ قدیم نسخوں میں قصیدہ مذکور کا عنوان یہ ہے... "نگارش پذیر فتن مدح شاہ اودھ در حیریدہ و بوقی یادگار ماندن مدح بہ مدوح نہ رسیدہ" از عالم مستی بہ بوسے بادہ ناکشیدگی اس داستان میں بعد کو غالب نے یہ اضافہ کیا "اس سلسلے میں ناسخ سے مراسلت ہوئی اور انھوں نے وعدہ کیا کہ روپے (کذا) روشن الدولہ کے حلق سے نکال لیں گے مگر اسے کیا کیجے کہ اس کے بعد ہی نصیر الدین حیدر فوت ہو گئے۔ غالب یہ بھی فراموش کر گئے کہ عہد روشن الدولہ میں ناسخ کا وادار نہ تھا کہ ایسا وعدہ کر سکتے (بین الاقوامی سمینار، نئی دہلی ۱۹۶۹ء ص ۲۷-۲۸)

ص ۳۲۹

۱۔ اردو سے "دیکھو"

ص ۳۳۰

- ۱۔ تاریخ تحریر غالب نے خط کے متن میں لکھی ہے۔ تاریخ میں سنہ نہیں لکھا۔ یہ ۱۸۶۱ء ہے۔
- ۲۔ ستمبر کو پنجشنبہ ۱۸۶۱ء میں ہے۔ مولوی ہمیش نے اس خط کا سن تحریر ۱۸۶۳ء قرار دیا ہے۔

چوں کہ اس سنہ میں ۱۲ ستمبر کو "شنبہ" ہے۔ اس لیے مولوی صاحب نے بغیر اطلاع خط کی تاریخ "۱۲ ستمبر" سے بدل کر "۱۱ ستمبر" کر دی جو صحیح نہیں۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "کر" ندارد۔

ص ۳۳۲

۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی "بنا"

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اس خط میں غالب نے "دعاء" کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اسی

لفظ کے بارے میں ۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء کے خط میں بحث کی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ستمبر ۱۸۶۱ء ہی میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ اردوئے معلیٰ، مجتہائی، "بر آورم"

ص ۳۳۳

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ تفتہ کے نام غالب کے ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء اور ستمبر ۱۸۶۱ء کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے بعد اور دسمبر ۱۸۶۱ء سے پہلے لکھا ہوگا۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط ستمبر ۱۸۶۱ء کے بعد اور دسمبر ۱۸۶۱ء سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۳۶

۱۔ اردوئے معلیٰ "پس"

ص ۳۳۷

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں "زمان" اور "زمانہ" پر گفتگو کی ہے۔ یہی گفتگو ۲ اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں بھی ہے۔ اس لیے یہ خط بھی اگست ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ خط ۲ اگست والے خط سے پہلے لکھا گیا ہو۔

ص ۳۳۹

۱-۲۔ اردوئے معلیٰ "میرٹ"



۳۔ اردوئے معلیٰ "دیں"

۴۔ خط پر تاریخ تحریر "روز چار شنبہ ۱۳ رمضان ۴ فروری" ہے۔ غالب نے انبالے کے دربار کا ذکر کیا ہے۔ یہ ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے کیوں کہ ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء کے خط میں غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم کو پوری تفصیل لکھی تھی۔ غالب نے البتہ مہینا غلط لکھا ہے یا ممکن ہے کہ یہ سہو کا تب ہو، یہ مہینا فروری نہیں مارچ ہے۔

ص ۳۴۰

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء کے خط میں نواب یوسف علی خاں ناظم کو لکھا ہے کہ منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کی "اس خط میں اسی خلعت کا ذکر ہے" اس لیے یہ خط مارچ یا اپریل اور زیادہ امکان ہے کہ اپریل ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہو۔

۲۔ خط پر تاریخ اور مہینا تو ہے، لیکن سنہ نہیں۔ پاؤں پر ورم کی تقریباً یہی تفصیل غالب نے ۳ جولائی ۱۸۶۳ء کے خط میں نواب علاء الدین خاں علانی کو لکھی تھی اس لیے یہ خط بھی اسی سنہ میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۴۱

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے مختلف لوگوں کے نام جولائی اور اگست ۱۸۶۳ء کے خطوں میں پھوڑوں کے مرض کا ذکر کیا ہے اور ۳ جولائی ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھا تھا: "آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔ بعد اصلاح بھیج دیے گئے" اس خط میں ۳ جولائی کے خط کا ذکر اس طرح کیا ہے: "اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں" اس لیے یہ خط ۵ جولائی ۱۸۶۳ء کو لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۴۲

۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی "پس" تدارو۔

ص ۳۴۳

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں پاؤں کے ورم اور ہاتھ کے پھوڑوں کا ذکر کیا ہے۔

انھیں یہ بیماری مارچ ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی اور ستمبر میں وہ صحت یاب ہوئے تھے۔ اس لیے امکان یہی ہے کہ یہ خط مارچ اور ستمبر ۱۸۶۳ء کے درمیان لکھا گیا۔

ص ۳۳۵

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر میں سنہ نہیں لکھا۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۲۶۲ھ ہے۔ غالب نے خط کے آغاز میں تاریخ تحریر لکھی ہے۔

ص ۳۳۶

۱۔ اردوئے معلیٰ میں تاریخ تحریر میں ۱۲۶۲ھ ہے لیکن ۱۴ اکتوبر ۱۲۶۲ھ کو سہ شنبہ تھا۔ جبکہ غالب نے ”جموعہ“ لکھا ہے۔ تقویم کی رو سے اگر مطابقت کی جائے تو ایک دن سے زیادہ کافرق نہیں پڑتا جبکہ اس تاریخ میں تین دن کافرق پڑ رہا ہے۔ مولوی ہیش نے ۱۲۶۲ھ کو تجویز کیا ہے جو درست معلوم ہوتا ہے۔

ص ۳۳۸

۱۔ اردوئے معلیٰ جو اس۔  
۲۔ ”بسکہ لمبر“ سے مراد فوج کا وہ سپاہی ہے جسے بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر آرام کی ہدایت کرتے ہیں۔  
اس صورت میں اصل تلفظ Sick Number ہوگا۔

ص ۳۳۹

۱۔ غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام جس خط کا ذکر کیا ہے اُس کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی فرماتے ہیں: ”گو وہ عریفہ مشلوں میں موجود نہیں ہے لیکن دوسری مشلوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ ارشاد کہ ”برس دن سے اُن کا کلام نہیں آتا“ حقیقی عذر ہے کیونکہ دسمبر ۱۲۶۳ھ سے دسمبر ۱۲۶۴ھ تک نواب فردوس مکاں نے تقریباً ہر ماہ خط بھیجا ہے مگر کسی میں اشعار کے ارسال کی اطلاع یا مرسلہ کلام کی واپسی کا تقاضا درج نہیں ہے لہذا تیب غالب (چھٹا ادیشن) ص ۷۷

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر میں صرف ۱۴ رجب لکھا ہے۔ اس خط میں ریٹیکن کے اُس تذکرے کا ذکر ہے جو وہ فارسی اور اردو شاعروں کا لکھ رہے تھے۔ تفتہ کے نام ۹ دسمبر ۱۲۶۳ھ کے خط میں بھی

اس تذکرے پر گفتگو ہے، اس لیے اس خط کا سنہ تحریر ۱۸۶۲ء قرار پائے گا۔

۳۔ اردوئے معلیٰ، ”کو“۔

ص ۳۵۰

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ اس تاریخ کا تعین اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ فروری ۱۸۶۵ء میں مرزا تقی اللہ خان نے غائب کا خط بنام تقیہ مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء۔ یہ خط ۱۲ فروری کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۵۱

۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی ”سب گھڑی“۔

ص ۳۵۲

۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی ”لکھنؤ“۔

۲۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں ناظم کا انتقال ہو گیا تھا۔ غائب نے نواب کلب علی خاں کو ان کے والد کی وفات پر تعزیت اور ان کے مسند نشین ہونے پر تہنیت بھیجی تھی۔

ص ۳۵۳

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غائب نے مرزا تقیہ کے نام ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء کے خط میں تقریباً ان ہی تمام الفاظ پر بحث کی تھی۔ اس لیے یہ خط ۴ مئی ۱۸۶۵ء کے بعد اور غالباً آخر مئی ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۵۵

۱۔ تقویم کی رو سے ۲۸ نومبر کو ”سہ شنبہ“ ہے

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غائب نے خط میں رام پور سے واپسی کا ذکر کیا ہے۔ یہ رام پور کے دوسرے سفر کا ذکر ہے۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط جنوری ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۵۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غائب نے ۱۸۶۴ء میں ”اکمل الاخبار“ اور ”اشرف الاخبار“ میں اپنا حال چھپوا کر معذرت کی تھی کہ اب وہ کلام کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ یہی بات پنڈت بدری ناٹھ



کے بارے میں اس خط میں کہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ خط بھی اسی سال لکھا گیا ہو۔

ص ۳۵۸

۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی اور دوسرے اڈیشنوں میں یہ قرات ہے۔ "مثل زمیں نہ بہ حذقِ نون" پہلی بار "خطوطِ غالب" میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے یہ قرات درست کی ہے۔

۲۔ اردوئے معلیٰ، مجتہائی، "کنوی"

۳۔ تفتہ نے غالباً یہ قصیدہ غالب کی مدح میں کہا تھا۔

ص ۳۵۹

۱۔ اردوئے معلیٰ مجتہائی "امورِ دینی" "دینی" بجائے "دین"

ص ۳۶۲

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں جو قطو نقل کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۵۶ء کے آخر یا ۱۸۵۷ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ بھائی سے مراد مرزا یوسف ہے، جو غالب کے اکلوتے بھائی تھے۔

ص ۳۶۵

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط کے شروع میں غالب نے لکھا ہے: "آج بدھ کے دن ۲۷ رمضان کو" اور علانی کے مرحوم بچے کی تاریخ وفات ۱۲۷۳ھ نکالی ہے۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۲۷ رمضان ۱۲۷۳ھ کو لکھا گیا ہوگا۔ ۲۷ رمضان کو تقویم کی رو سے، بدھ نہیں، منگل تھا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ اور ہمیش کے ہاں یہ قرات "جابر دن" ہے۔ غالباً پہلی بار مولانا غلام رسول تہرنے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ قرات "جابر دار" ہونی چاہیے جو درست معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ نواب امین الدین احمد خاں۔

۴۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں۔

ص ۳۶۶

۱۔ اردوئے معلیٰ ۱۲۷۶ھ ظاہراً یہ سہو کا تب ہے۔

ص ۳۶۷

۱۔ اردوئے معلیٰ میں یہ قرات "جون" ہے۔ غالب نے "سترہ ذی الحجہ" بھی لکھی ہے۔ ہمیش اور فضل

دونوں کے ہاں یہی قرات ہے۔ تقویم کی رو سے اسے جولائی ہونا چاہیے۔ ہاں، جولائی سنہ ۱۸۶۱ء کو ذی الحجہ کی ۱۸ تاریخ تھی۔ سترہ نہیں۔

ص ۳۶۸

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے: "آج سات جون اور سترہ ذی الحجہ ہے۔" خط کے شروع میں غالب نے لکھا ہے: "پنن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زیر مجتہ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔" یہ واقعہ سنہ ۱۸۶۱ء کا ہے، کیوں کہ چار مئی سنہ ۱۸۶۱ء کو غالب کو پنشن کے دو ہزار ایک سو پچاس روپے ملے تھے۔

۲۔ اردو سے "معلیٰ" "دونو"

۳۔ اردو سے "معلیٰ" "صد"

۴۔ اردو سے "معلیٰ" "تا"

۵۔ اردو سے "معلیٰ" "و" "ندارد۔"

۶۔ اردو سے "معلیٰ" "کھٹا"

ص ۳۶۹

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر میں صرف "پنجشنبہ ۳ اپریل" لکھا ہے۔ ۴ اپریل کو پنجشنبہ سنہ ۱۸۶۱ء میں تھا۔ غالب نے لکھا ہے کہ: "محلہ سابق کا نام لکھتے ہیں۔ مکان بدلنے کا ذکر غالب نے تفتہ کے نام ایک خط مورخہ ۲ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء میں کیا ہے۔ خط زیر بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب مکان تبدیل کر چکے ہیں۔ اس لیے یہ خط سنہ ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا ہو گا۔ مولوی ہیش نے بھی یہی سنہ قرار دیا ہے۔"

ص ۳۷۰

۱۔ اردو سے "معلیٰ" "تخلص بہتر"، "بہتر" "زائد۔"

ص ۳۷۱

۱۔ اردو سے "معلیٰ" "ماحدہ"

۲۔ اردو سے "معلیٰ" "لکھ رہا"

۳۔ اس خط کی تاریخ تحریر میں غالب نے سنہ نہیں لکھا۔ جون سنہ ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب نے "لغات دساتیر" کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہ خط بھی سنہ ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔ تقویم کی رو سے یکم جون کو شنبہ تھا۔

- ۱۔ عود اول و دوم "جانِ غالب..... اجرا کیا ہے" نثارو۔
- ۲۔ عود اول "الملک لمن الیوم۔"
- ۳۔ عود اول و دوم "چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۶ھ کو مجھ کو رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔"
- ۴۔ عود اول و دوم "۱۷"۔
- ۵۔ عود اول و دوم "فکر" نثارو۔
- ۶۔ عود اول "جہلِ خلیے میں سے۔" عود دوم "جیلِ خانے میں سے۔"
- ۷۔ عود اول و دوم "ایک"
- ۸۔ اردوئے معلیٰ "اس"
- ۹۔ اردوئے معلیٰ اس ماہ ذی الحجہ "عود اول و دوم دونوں میں ۱۲۷۷ھ بھی ہے۔"
- ۱۰۔ عود اول و عود دوم۔ دونوں میں یہ خط یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

- ۱۔ اردوئے معلیٰ "ماویں"

- ۱۔ اردوئے معلیٰ "کال"
- ۲۔ نسخہ عرشی "یارب، وہ نہ سمجھے ہیں۔ الخ"

- ۱۔ نسخہ عرشی "بوسہ"
- ۲۔ اس خط میں تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے: اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں گا۔ تقویم کی رو سے یہ جون ۱۸۹۶ء ہے۔

- ۱۔ اردوئے معلیٰ "کاشنگ"
- ۲۔ "رئیس" سے مراد رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں۔



۳۔ ”مرشد زادے“ سے مراد نواب یوسف علی خاں کے منجھلے صاحبزادے سید حمید علی خاں ہے۔ ان کی شادی ۲ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی تھی۔

۴۔ اردوئے معلیٰ ”خیر“

۵۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۳۷۹

۱۔ اردوئے معلیٰ ”آدیا“

۲۔ اردوئے معلیٰ ”باقر“

۳۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۳۸۰

۱۔ امام محمد اور امام ابو یوسف کو صاحبین کہا جاتا ہے فقہہ کے مسائل پر ان دونوں میں بہت اختلاف تھا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ ”زیادہ“

۳۔ اردوئے معلیٰ ”بود“

ص ۳۸۱

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ قرآن علی بیگ سالک اور شمشاد علی بیگ رضواں کو ہارو میں ملازمت کے خواہاں

تھے اور غالب کی کوششوں سے دونوں کو ملازمت مل گئی تھی۔ ملا الدین خاں غلامی کے نام پر قوری

۱۸۶۲ء کے خط میں غالب نے جس انداز میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط

زیر بحث ۹ فروری ۱۸۶۲ء سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ ”گیا آیا“، ”آیا“ زائد۔

۳۔ یعنی صرف شمشاد علی بیگ رضواں کو ہارو بلانا چاہتے ہیں۔

۴۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی تھی۔

ص ۳۸۲

۱۔ حکیم منجھلے کا اصل نام حکیم حسام الدین تھا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ ”فرمائے“۔

۱۔ غالب نے خط کے آغاز میں صرف "شنبہ ۵ اشعبان و فروری وقت نماز ظہر" لکھا ہے۔ تقویم کے رد سے یہ سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق سنہ ۱۸۶۲ء ہے۔ غالب نے ۱۶ فروری سنہ ۱۸۶۲ء کو علانی کے نام ایک خط میں امین الدین خاں کے بارے میں لکھا تھا۔ کل تمہارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا..... محکم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے، یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زیر بحث خط ایک دن پہلے یعنی ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا۔

۱۔ اردوئے معلیٰ "ہے"

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں اس طرح دی ہے۔ "یکشنبہ ۱۶ فروری سنہ ۱۸۶۲ء ہنگام نیمروز"

۱۔ اردوئے معلیٰ "سپارس"

۲۔ منغل بچوں سے مراد مرزا قربان علی بیگ سالک اور مرزا شمشاد علی بیگ ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ میں یہ قرات "گرینٹ" ہے۔ ممکن ہے غالب اسی طرح تلفظ کرتے ہوں۔

۴۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔ غالب نے یکشنبہ "لکھا ہے جبکہ تقویم کے رد سے یکم مارچ کو شنبہ"

تھا۔ خود غالب نے خط میں لکھا ہے کہ "کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا۔"

۱۔ اردوئے معلیٰ "سوائے"

۲۔ اس خط کی تاریخ تحریر میں غالب نے سنہ نہیں لکھا۔ یکم مارچ سنہ ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب نے علاء الدین

خاں علانی کو ان کے والد کی بیماری کے بارے میں لکھا تھا۔ نیرلوہارو میں مرزا قربان علی بیگ سالک اور مرزا

شمشاد علی بیگ رضواں کی ملازمت کے بارے میں لکھا تھا۔ یہی دونوں باہیں اس خط میں بھی لکھی ہیں جس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط سنہ ۱۸۶۲ء ہی میں لکھا گیا۔

۱۔ اردوئے معلیٰ "اتر کر"

۱۔ اردوئے معلیٰ "مرحلتے"

۲۔ شہاب الدین احمد خاں کا نام مزاحاً اس طرح لکھا ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "یوم الخمس"

۴۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے دن اور تاریخ دونوں خود خط میں لکھے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ "قاطع برہان" کا چھاپا تمام ہو گیا۔ قاطع برہان "کا پہلا ایڈیشن ٹول کشور، لکھنؤ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس لیے یہ خط ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا۔

۱۔ اس خط میں ایک فارسی اور ایک اردو غزل اور بھی ہیں۔

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ لفافے پر غالب نے "روزہ آدینہ ۱۸ جولائی" لکھا ہے۔ غالب نے علانی کے نام خط مورخہ ۲ جولائی ۱۸۶۲ء میں "داماں گلہ دارد" والے شعر اور عرفی کا ذکر کیا ہے۔ اس خط میں بھی ان دونوں کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۱۔ اردوئے معلیٰ "میاں جان"

۲۔ داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار گلیں نگاہ تو ز داماں گلہ دارد

در بزم وصال تو یہ ہنگام تماشا نظارہ ز جنیدن مژگاں گلہ دارد

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے ہیں بکلیات قدسی کے دو قلمی نسخے دیکھے۔ نہ یہ اشعار ملتے ہیں نہ اس زمین میں کوئی غزل۔ فارسی اشعار کے ایک مطبوعہ مجموعے میں یہ اشعار عشرتی کے نام نظر آئے۔ مقطع کا ایک مصرع یاد ہے۔ "اے عشرتی از وضع تو جاناں گلہ دارد" قاضی عبدالودود، معیار (پٹنہ) جولائی

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالب نے علانی کو میر جان کے بارے میں لکھا: "کل استاد میر جان نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے اُن کو جانے نہ جانے میں متروک پایا۔" اس خط میں بھی



میر جان کے لوہارو جانے کا ذکر ہے۔ علائی کے نام ۱۸۶۲ء کے دو خطوط میں قدسی کی ”مڑگاں گلہ دار“ والی منزل کا ذکر ہے۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا۔

۳۔ اردوئے معلیٰ ”آٹھ“ ندارد۔

ص ۳۹۶

- ۱۔ غالباً نواب الہی بخش خاں معروف کے چھوٹے بھائی نواب احمد بخش خاں سے مراد ہے۔
- ۲۔ اردوئے معلیٰ ”حمرہ خاں“

ص ۳۹۷

- ۱۔ خطوط غالب کے بیشتر مجموعوں میں یہ قرأت ”اباحت“ ہے۔ غالباً پہلی بار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے خطوط غالب مرتبہ پیش پرشاد میں اسے درست کر کے ”اباحت“ کیا ہے۔
- ۲۔ اردوئے معلیٰ کے

ص ۳۹۹

- ۱۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں دی ہے۔ اردوئے معلیٰ میں ۱۸۶۲ء چھپا ہے جو غلط ہے۔ تقویم کی رو سے ۱۸۶۲ء ہے۔ اس کے حق میں دو دلیلیں یہ بھی ہیں کہ اس خط میں قدسی کے اشعار کا ذکر ہے۔ غالب نے قدسی اور ان سے منسوب ان اشعار کا ذکر علائی کے نام ۱۸۶۲ء میں لکھے گئے دوسرے خطوط میں بھی کیا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب نے علائی کو لکھا تھا کہ انھوں نے شراب چھوڑ دی تھی اور ۱۰ جولائی کو پھر شروع کر دی۔ اس خط میں اس واقعے کی تفصیل بیان کی ہے۔

ص ۴۰۰

- ۱۔ اردوئے معلیٰ کے حاشیے پر اس عربی عبارت کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے: ”جانا میں نے اپنے کو بہ سبب ٹوٹنے قصدوں کے۔“
- ۲۔ اردوئے معلیٰ ”مرئج“
- ۳۔ اردوئے معلیٰ ”طرکے“

۴۔ رضوان پندرہ روپے مہینہ تنخواہ مانگ رہے تھے۔ علائی بارہ روپے مہینہ دینا چاہتے تھے لیکن ان کے والد نواب امین الدین احمد خاں کو سات روپے مہینہ منظور تھا۔ علائی نے تجویز پیش کی کہ ابتدا دس روپے

ہینے سے کی جائے۔ ۵۔ اردوئے معلیٰ میں یہ قرأت "اولیت" ہی ہے جس کے معنی ہیں برتری۔

ص ۲۰۱

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے جس دربار کا ذکر ہے، وہ ۱۸۶۳ء میں منعقد ہوا تھا، اس لیے یہ خط اوائل مارچ ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۲۰۲

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے ۲۱ جون ۱۸۶۳ء کو ایک خط میں علانی کو لکھا ہے: "مرزا علی

حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط تمہارے یک مشت ان کو دیے۔ اب تمہارے پاس

بھیجے گا ان کو اختیار ہے خطوط سے بظاہر مراد وہی اردو خطوط ہیں جن کا غالب نے زیر بحث خط میں

مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے گمانِ غالب ہے کہ علانی نے اپریل یا مئی ۱۸۶۳ء میں غالب کو یہ خطوط بھیجے

تھے۔ علانی کے نام ۳ مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو یہ خطوط مل چکے تھے۔

اس لیے یہ خط اپریل، مئی ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔ یہ خطوط غالب نے اس مجموعے کے لیے منگائے

تھے، جو مکمل المطابعِ دہلی سے ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع ہوا تھا۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "فرج"

ص ۲۰۳

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ چوں کہ غالب نے علانی سے اپنے خطوط کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے یہ خط بھی

خط ۲ کی طرح اپریل، مئی ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ "یا" تدارو۔

۳۔ اردوئے معلیٰ کے حاشیے پر "پیرِ حیرت" کے معنی "پیرِ حواسِ باختمہ" دیے ہیں۔

۴۔ اردوئے معلیٰ "اکر"۔

۵۔ تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۲۰۴

۱۔ اردوئے معلیٰ میں حاشیے پر "استا" کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے: "ثرت کی تفسیر کا نام ہے۔ یہ

کتاب آتش پرستوں کے مذہب کی ہے۔"

۲۔ اردوئے معلیٰ ”ہوگی“۔

ص ۴۰۵

۱۔ اردوئے معلیٰ ”معیّنوں“

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۰۷

۱۔ اردوئے معلیٰ ”سوائے“

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۰۸

۱۔ ”سال ۱۸۶۳ء“ میرا اضافہ ہے۔

ص ۴۰۹

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے شروع میں لکھی ہے۔

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۱۰

۱۔ اردوئے معلیٰ ”اے“

ص ۴۱۱

۱۔ تاریخ تحریر میں صرف ۱۸۶۳ء چھپا ہے۔ یہ ۱۸۶۳ء ہے، کیونکہ بانی عید کا مطلب ہے کہ ”یہ اذی الحجہ“

ہے۔ تقویم کی رو سے ۱۱ الحجہ ۱۲۸۵ھ اور ۱۸ مئی ۱۸۶۳ء میں مطابقت ہے

ص ۴۱۲

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے اور صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

ص ۴۱۳

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۱۴

۱۔ تقویم کی رو سے ۳ نومبر ۱۸۶۳ء کو پنجشنبہ ہے۔



- ۱۔ یہ علاء الدین خاں احمد علائی کے والد امین الدین احمد خاں کا ذکر ہے۔
- ۲۔ غالب نے خط کے آغاز میں صرف جمعہ نہم رجب و دسمبر لکھا ہے۔ ۱۸۶۲ء وہ سال ہے جب ۹ رجب کو ۹ دسمبر تھا اور جمعے کا دن تھا۔ اس لیے یہ خط ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔
- ۳۔ اردوئے معلیٰ "ویدار و دیگر" و "زائد۔
- ۴۔ اردوئے معلیٰ "وے" ندارو۔
- ۵۔ اردوئے معلیٰ "بکے"۔

۶۔ غالب نے خط پر تاریخ تحریر نہیں لکھی لیکن خط میں لکھا ہے "شعبان بیگ پیدا ہو گئے۔ کل آن کی چھٹی ہو گئی" اس کا مطلب ہے کہ یہ خط "شعبان" کو لکھا گیا۔ ۹ دسمبر ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب نے علائی کو لکھا تھا: "اگر سر نوشت آسمانی میں بھی اواخر رجب یا اوائل شعبان میں ہمارا تمہارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہ سن لیں گے" زیر بحث خط میں بھی رجب یا شعبان میں علائی کے ولی آنے کا ذکر ہے اس کا مطلب ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا۔

۱۔ اردوئے معلیٰ "گیا"۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ: "میرا شہاب الدین خاں پرکھ گیا۔" ۶ جنوری ۱۸۶۵ء کے خط میں غالب نے علائی کو لکھا تھا: "شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزا کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اواخر جنوری ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

- ۱۔ اردوئے معلیٰ "آئے" خطوط غالب کے بیشتر مجموعوں میں یہ قرات "آئے" ہے جو کسی طرح درست نہیں۔ غالباً پہلی بار مولوی ہمیش نے قیاسی تصحیح کر کے "آؤں" لکھا ہے۔
- ۲۔ غالب نے خط کے آغاز میں صرف "صبح دوشنبہ، شانزدہم از مہ صیام" لکھا ہے۔ خط میں علائی کے بچے کی ولادت کا ذکر ہے۔ یہی ذکر ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء کے خط میں بھی ہے۔ اس لیے خط زیر بحث

۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہے۔

ص ۳۱۸

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر میں صرف پچشتنبہ ۲۶ رمضان لکھا ہے۔ یہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء ہے، کیونکہ اس خط میں رجب اور شعبان کے بارے میں وہی باتیں کہی گئی ہیں جو غالب نے شعبان ۱۲۸۱ھ کے خط میں کہی تھیں۔ ۲۶ رمضان کو تقویم کی رو سے ”چار شنبہ“ ہے۔

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۳۰۹

۱۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۳۲۰

۱۔ اردوئے معلیٰ ”ایثار“

۲۔ غالب نے تاریخ تحریر خط کے متن میں لکھی ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ ”تدارو“

ص ۳۲۱

۱۔ اردوئے معلیٰ ”نہیں کہ،“ ”نہیں“ زائد۔

۲۔ اردوئے معلیٰ میں یہ تاریخ تحریر خط براہ کے اختتام پر نقل ہوئی ہے۔ جب کہ اسے خط زیر بحث کے آغاز

میں نقل ہونا چاہیے تھا کیوں کہ خود غالب نے لکھا ہے کہ تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ تاریخ تحریر

خط براہ کی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ غالب کے خط زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ابھی رام پور ہی میں ہیں۔

ص ۳۲۳

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ ۲۲ دسمبر اور ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ

خط زیر بحث ان دونوں خطوں کی تحریر کی درمیانی مدت میں لکھا گیا۔

۲۔ اردوئے معلیٰ ”یوم الخمس“

۳۔ اردوئے معلیٰ ”گروہہ“

۴۔ اردوئے معلیٰ ”ایٹھی“



۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے "آج منگل ہے، سات شعبان کی اور ۲۶ دسمبر کی۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے قیام کے دوران لکھا گیا ہے اس لیے یہ خط ۷ شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو لکھا گیا۔

ص ۲۲۴

۱۔ اردوئے معلیٰ "کریا"

۲۔ اردوئے معلیٰ "لیتا"

۳۔ اردوئے معلیٰ "سویان"

۴۔ غالب نے تاریخ تحریر میں صرف "شعبہ ۲۵ شعبان ۱۳ جنوری" لکھا ہے۔ یہ ۱۲۸۲ھ اور ۱۸۶۵ء ہے۔  
کہوں کہ ان ہی تاریخوں میں غالب رام پور میں تھے۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اس خط میں غالب نے کیٹی کا ذکر کیا ہے۔ غالب کیٹی سے مراد "دہلی سوسائٹی"

ب۔ اس سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ غالب آنحضرت کی تک اس

سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے۔ امکان یہ ہے کہ غالب نے اس سوسائٹی کے جلسے کے بارے میں تحریر

لکھی تھی اور غالب کو توقع تھی کہ وہ عبارت جلسے میں پڑھ کر سنائی جائے گی۔ کیا یہ ذکر سے قیاس ہوتا

ہے کہ غالب نے ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کے بعد ملائی کو یہ خط لکھا ہے۔ خط کے متن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے

کہ اس وقت ملائی دہلی میں تھے۔ سوسائٹی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ دہلی سوسائٹی عبدالستار

سید جعفر، پبلشر، رینگین، غالب نمبر (۴۹-۱۹۲۸) ص ۱۰۷-۱۰۸

۱۔ ملائی نے خط ۵ جولائی ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا۔ یہ خط ان کا بتایا ہے۔

۲۔ میں اس نے کوئی دلیل نہیں دے سکتا۔

ص ۲۲۵

۱۔ ملائی نے خط ۵ جولائی ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا۔

۲۔ میں اس نے کوئی دلیل نہیں دے سکتا۔

ص ۲۲۶

۱۔ غالب نے غالب کے خطوں کے مجموعے "اردوئے معلیٰ" میں



